اقبالؒ اور تصوّف

محمد شریف بقا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقبالؒ اور تصوّف

محمد شریف بقاؔ

جنگ پبلشرز

اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ
ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کے لئے
خوبصورت اور معیاری مطبوعات

اشاعت اول	ستمبر 1991ء
تعداد	1000

سرورق	طاہر رشید
پروڈکشن	گوہر سلطانہ عظمیٰ
اہتمام	مظفر محمد علی
ناشر	جنگ پبلشرز۔ لاہور
مطبع	جنگ پبلشرز پریس
	13۔ سر آغاخان روڈ۔ لاہور

اقبالؒ کے صوفیانہ اعتدال کے نام

فہرست

"اقبالؒ اور تصوّف"............چند تاثّرات

(ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کی رائے)

حضرت جنید بغدادیؒ سے کسی نے توحید کے باب میں استفسار کیا تو فرمایا "کمالِ احدیّت کے ساتھ اس کی وحدانیّت کو حق جان کر اللہ کو ایک فردِ یکتا جاننا۔ وہ ایک ایسی ذات ہے جس نے نہ کسی کو جنا نہ خود جنم دیا گیا۔ اس کا نہ کوئی مقابل ہے، نہ مثل، نہ ہم شبیہہ ...... اس جیسا کوئی نہیں، وہ سمیع و بصیر ہے"۔

گویا ذاتِ احد کی یکتائی کا کامل شعور و احساس ہی تصوف کا دوسرا نام ہے۔ یہ نام ہے جملہ اعتبارات کا ذاتِ احدیّت میں گم ہو جانے کا، پشمینہ پوشی، مُوتراشی اور کلاہ آرائی کا نام نہیں۔ سچ فرمایا تھا صاحبِ کتاب اللمع حضرت سراج نے: "صوفیانہ لباس پہن لینے سے کوئی شخص صوفی نہیں بن سکتا۔ تصوّف تو نام ہے اصلاحِ باطن کا نہ کہ پیوند لگی گدڑی کا"۔

اقبالؒ نے بھی تا حیات نہ کبھی پیوند لگی گدڑی پہنی نہ کلاہِ چار تَرک کو اپنایا نہ ترکِ دنیا سے علاقہ رکھا۔ وہ اپنے خارج میں پھیلی کائناتِ چار سُو اور حیاتِ رنگ و بُو ہی سے آگاہ نہ تھے، اپنے باطن کے عالمِ اصغر کا بھی گہرا حسّی شعور رکھتے تھے۔ وہ تصوّف کو "اخلاص فِی العمل" قرار دیتے تھے اور ان کا یہ کہنا بالکل درست تھا کہ قرونِ اولیٰ میں تصوّف کے یہی معنی تھے۔ وہ شریعت اور طریقت کی دُوئی کے قائل نہ تھے اور ان کے نزدیک شریعت کو دل کی گہرائیوں سے قبول کرنے کا نام طریقت تھا۔ اس خیال کا اظہار انہوں نے تواتر سے اپنی نثری اور شعری تحریروں میں کیا:۔

عِلمِ حق غیر از شریعت، ہیچ نیست۔ اصلِ سُنّت جُز محبت ہیچ نیست

باتو گویم سِرِّ اسلام است شرع۔ شرع آغاز است و انجام است شرع

وہ اس خیال کے شدید نقّاد تھے کہ حضورِ اکرمؐ کو کوئی مخفی اور سرّی علم عطا کیا گیا تھا۔ وہ اس خیال کو قرآنی تعلیمات کے خلاف سمجھتے تھے اور واقعہ بھی یہی معلوم ہوتا ہے ورنہ خود احکامِ قرآنی کی کُلیّت معرضِ شک میں پڑ جاتی ہے۔ اقبالؒ نے کس قدر درست کہا تھا۔ ؎

در شریعت معنیٔ دیگر مجُو - غیرِ ضو در باطنِ گوہر مجُو

اقبالؒ نے صاف صاف لکھا ہے کہ ان کی روح ایسے تصوّف سے بغاوت کرتی ہے جو فلسفہ آثار ہو یا فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہو۔ ورنہ اپنی نہاد و مزاج میں اقبالؒ بذاتِ خود صوفی تھے اور لذّاتِ معرفت کے چشیدہ! یہ بات معلوم ہے کہ وہ سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے اور ارمغانِ حجاز اور اپنی کئی متقدّم تحریروں کی روشنی میں وہ نسبتِ اویسی کے بہرہ دار ٹھہرتے ہیں!

اقبالؒ اور تصوّف کے حوالے سے متعدد کتب لکھی گئی ہیں جن میں خصوصیّت سے ابو سعید نور الدین، پروفیسر فرمان، پروفیسر شاہ محمد عبدالغنی اور اعجاز الحق قدوسی کی تالیفات لائقِ اعتنا ہیں بلکہ اس باب میں میکش اکبر آبادی کی نقدِ اقبال بھی شامل کی جا سکتی ہے۔ اوّل الذکر تین حضرات اور مؤخر الذکر (میکش اکبر آبادی) کی تصنیفات تصوّف کے منابع، اسلامی تصوف کے خدوخال اور اقبالؒ کے تصوّراتِ تصوّف کی عالمانہ اور ناقدانہ وضاحت کرتی ہیں ان حضرات کے مخاطبین ایسے لوگ تھے جو تصوّف اور متصوّفانہ مباحث کا قابلِ لحاظ پس منظر رکھتے ہوں۔ ایسے میں ایک ایسی مختصر مگر سادہ اور تشریحی اسلوب کی حامل کتاب کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو اقبال کے متوسط قابلیت کے قارئین کے لیے مفید ہو۔ جناب محمد شریف بقا صاحب کی زیرِ نظر تالیف اس ضرورت کو اطمینان بخش طریقے سے پورا کرتی ہے۔

پیشِ نظر تالیف "اقبالؒ اور تصوّف" میں مؤلف نے تصرّف کیا ہے۔ تصوّف کے اہم موضوعات اور اقبالؒ، اقبالؒ کے یہاں مشہور صوفیاء کا تذکرہ، تصوّف کے اجزائے ترکیبی اور تصوّف کی اہمیّت و افادیّت وغیرہ عنوانوں کے تحت سادہ اور سلیس اسلوب میں اقبالؒ کے صوفیانہ مؤقف کی وضاحت کی ہے۔ اقبالؒ کی نثری اور شعری تحریروں پر مصنّف کی نظر بہت حد تک اطمینان بخش ہے اور اس کی وجہ سے وہ یہ بتانے میں کامیاب رہے ہیں کہ اقبالؒ تصوّف کے زبردست حامی تھے اور محض ان عناصر کے ناقد تھے جنہیں عجمی عناصر کا نام دیا گیا ہے اور جن کے باعث اہلِ اسلام کی صورت ؎

ہمچو نے گردید از بادِ عجم

کی سی ہو گئی تھی۔

زیرِ نظر تالیف میں چند مقام ایسے ہیں جن پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً مصنّف، "حکمۃ الاشراق" کو تصوف کی کتب میں شمار کرتے ہیں حالانکہ شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول صوفی نہ تھے۔ شیخ کا شمار حکمائے اسلام میں ہوتا ہے صوفیائے اسلام میں نہیں۔ شیخ مقتول بلاشبہ حکمتِ اشراق کے عظیم شارح تھے اور یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہئے کہ تصوّف اور اشراق کی راہیں بالکل جدا ہیں۔

شاید عام روایت کے پیشِ نظر مصنف نے پیش نظر کتاب میں ایک جگہ شاہ است حسین ...... الخ
کو حضرت معین الدین چشتیؒ کی رباعی لکھا ہے حالانکہ یہ بات ایک عرصہ پہلے متحقق ہو چکی ہے کہ حضرت
معین الدین چشتیؒ سے منسوب دیوان کا اصل انتساب مُلا معین واعظ فراہی سے ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر
محمد ابراہیم ڈار کا مضمون "دیوان خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ" (مشمولہ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی جلد
ششم) ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مصنّف نے "عطار روح بود وسنائی دو چشمِ او" کو شاید عام روایت
ہی کے پیش نظر رومی سے منسوب کیا ہے حالانکہ یہ رومی کے صاحبزادے بہاؤالدین ولد کا شعر ہے۔

فاضل مصنّف نے وحدت الوجود اور سریانی کو ہم معنی سمجھا ہے حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ وحدت
الوجود کا اتحاد و حلول اور سریانی سے کوئی تعلق نہیں۔

چند مقامات اور بھی ہیں جن میں ایسی باتیں راہ پا گئی ہیں جن کی تصحیح ضروری تھی مگر ان کی نشاندہی
سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے کہ اس مختصر دیباچے میں اس کی گنجائش نہیں۔

کتاب میں بعض مقامات پر مباحث و موضوعات کی تکرار ملتی ہے جنہیں تھوڑی سی کاوش سے
مربوط و ہم آہنگ کیا جاسکتا تھا۔ امید ہے کہ فاضل مصنّف اگلے ایڈیشن میں ان فروگذاشتوں کو دُور کر لیں
گے۔

ان چند کوتاہیوں سے قطعِ نظر، زیرِ نظر کتاب، "تصوّف اور اقبالؒ" کے تصوّراتِ طریقت و تصوّف کی
بخوبی وضاحت کرتی ہے اور یوں اپنا جواز ثابت کرتی ہے۔

تحسین فراقی
1 C - اسلامک سنٹر
جامعہ پنجاب قائد اعظم کیمپس لاہور

(ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی رائے)

میں نے محمد شریف بقاصاحب کی کتاب "اقبالؒ اور تصوّف" دیکھی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ علامہ اقبالؒ کے تصوّرِ تصوّف کے بارے میں دو رائیں پائی جاتی ہیں۔ ایک رائے کے مطابق وہ وحدت الوجودی تھے اور دوسری رائے کے مطابق وہ بنیادی طور پر تصوّف کے خلاف تھے۔ بقاصاحب نے اپنی اس کتاب میں بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ تصوّف کے کونسے نکات علامہ اقبالؒ کو پسند تھے اور انہوں نے اس کے کونسے پہلوؤں کی مخالفت کی ہے۔ اس کے علاوہ مصنّف نے مشہور صوفیاء کے بارے میں علامہ اقبالؒ کے خیالات کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ انہوں نے علامہ اقبالؒ کے بیانات کی روشنی میں تصوّف کے عناصرِ ترکیبی کا جائزہ لیا ہے اور زیادہ تر اقتباسات علامہ اقبالؒ کی نظم ونثر میں بیان ہوئے ہیں اس لئے علامہ اقبالؒ کے افکار کو صحیح تناظر میں دیکھا گیا ہے۔

علامہ اقبالؒ تصوّف کے عجمی تصوّرات اور انفعالی پہلوؤں کے خلاف تھے۔ جہاں تک تصوّف میں اخلاص بالعمل کا تعلق ہے اقبالؒ اس کے حامی تھے بلکہ وہ خود بھی بیعت تھے۔ اصل میں علامہ کے نظریۂ تصوّف کے بارے میں زیادہ تر غلط فہمیاں اس لئے پیدا ہوئی ہیں کہ انہوں نے حافظ کی شاعری کے چند پہلوؤں کی پُرزور مخالفت کی تھی۔ اکثر لوگوں نے اس بنا پر انہیں حافظ اور تصوّف کا مخالف خیال کیا ہے۔ اس ضمن میں ہی خواجہ حسن نظامی اور ان کے درمیان غلط فہمیوں نے جنم لیا۔ بعدازاں ان کے درمیان ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گیا اور ان کی صلح سے معلوم ہوتا ہے کہ سطحی اختلافات کے باعث یہ جھگڑا چلا تھا

اصل میں حضرت علامہ حقیقی تصوّف کے مخالف نہیں تھے۔ اس پر پہلے ہی بہت کچھ لکھا گیا ہے مثلاً ڈاکٹر ابو سعید نورالدین کی کتاب۔

شریف بقاصاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ اقبالؒ کے تصوّرات عالموں کیلئے نہیں بلکہ عام پاکستانیوں کے لئے لکھتے ہیں۔ اس سے قبل انہوں نے علامہ کے خطبات کا خلاصہ بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھا تھا۔ موجودہ کتاب اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ انہوں نے عوام النّاس کے لئے اسے آسان اور قابلِ فہم بنانے کے لئے بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ یہ آج کی ضرورت بھی ہے اور فکرِ اقبالؒ کو عوام تک پہنچانے کا وسیلہ بھی۔ بقاصاحب ہماری دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ انہوں نے فی الحقیقت اقبالیات کو عام کرنے میں پاکستانیوں کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ میں ان کی اس کتاب کی کامیابی اور مقبولیت کے لئے دعاگو ہوں۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
ڈائریکٹر ' بزم اقبال ' لاہور

(ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کی رائے)

علامہ اقبالؒ کے والد گرامی شیخ نور محمد ایک صوفی بزرگ تھے۔ شیخ محی الدین ابنِ عربی کے اس حد تک مدّاح تھے کہ اقبالؒ کے بچپن میں، گھر میں "فصوص الحکم" کا، بالالتزام مطالعہ ہوتا تھا لیکن بعدازاں یہ بات بھی، علامہ اقبالؒ ہی نے کہی، اور بڑے دوٹوک اور واشگاف انداز میں کہ فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے، کچھ نہیں۔

اس اعتبار سے تصوّف کے بارے میں علامہ کے خیالات کا مطالعہ اقبالیات کا ایک دلچسپ باب ہے، اور یقیناً یہ فکرِ اقبالؒ کے دو تین اہم ترین موضوعات میں سے ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس حوالے سے اقبالیات پر قلم اٹھانے والوں میں بہت سے اکابر اہلِ علم، نقادانِ ادب اور ماہرینِ اقبالیات شامل ہیں، جیسے: یوسف سلیم چشتی، شاہ محمد عبدالغنی نیازی، میکش اکبر آبادی، پروفیسر سید محمد عبدالرشید فاضل، پروفیسر محمد فرمان، ڈاکٹر ابو سعید نور الدین، ڈاکٹر سہیل بخاری اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی وغیرہ بایں ہمہ علمی و ادبی موضوعات پر بحث و مباحثے کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ خصوصاً کسی بڑے مفکّر کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بہت کچھ کہنے سننے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ اس پسِ منظر میں جناب محمد شریف بقا کی زیرِ نظر کتاب، اقبالیات کے ایک اہم موضوع کا سنجیدہ اور فکر انگیز مطالعہ ہے۔

جناب محمد شریف بقا، علامہ اقبال کے فکر و فن سے دیرینہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ اقبالیات پر ان کی اوّلیں تصنیف "خطباتِ اقبالؒ پر ایک نظر" تفہیمِ خطبات کے ضمن میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ خطبات کی

زبان اَدق اور انداز فلسفیانہ ہے۔ بقا صاحب کے قلم سے انہیں سمجھنے سمجھانے کی پہلی سنجیدہ کاوش منظرِ عام پر آئی تو اہلِ علم نے اسے سراہا۔ یہ کتاب متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ بعدازاں اقبالیات پر ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں اپنی زیرِ نظر تازہ تصنیف میں انہوں نے موضوع سے اپنی دیرینہ وابستگی اور اپنے وسیع مطالعے کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ پر قلم اٹھانے کے لئے 'قرآن و حدیث اور علومِ اسلامی کا جو ضروری مطالعہ ناگزیر ہے جناب بقا صاحب نے اس سے کہیں زیادہ پڑھا ہے 'اور زیرِ نظر کتاب سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

مقامِ مسرت و طمانیت ہے کہ محمد شریف بقا صاحب معتدل ذہن و خیالات رکھتے ہیں علامہ اقبالؒ کے ہاں فکر و خیالات کا جو حسن و توازن ملتا ہے' خصوصاً تصوف ایسے نازک اور مشکل مسئلے پر انہوں نے امتِ مسلمہ کے اجتماعی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے' جو عملی (پریکٹیکل) طرزِ عمل اختیار کیا' بقا صاحب نے بڑی خوبی سے اس کا احاطہ کیا ہے۔ علامہ اقبال 'اسلم جیراج پوری کو ایک خط میں لکھتے ہیں!

"تصوف میں اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی مفہوم قرونِ اولیٰ میں لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں' جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے' اور عجمی اثرات کی وجہ سے' نظامِ عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے' تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے" (اقبال نامہ 'اول ص53'54)

جناب محمد شریف بقا نے موضوع میں الجھنے یا قارئین کو کثرتِ تعبیر میں الجھانے کے بجائے تفہیم و تشریح کا نسبتاً سادہ اور آسان انداز اختیار کیا ہے۔ اس لحاظ سے' یہ کتاب' اپنے موضوع پر ایک خوش گوار اضافہ ہے اور امیدِ واثق ہے کہ اقبالیات کے قارئین اس کا کھلے دل سے خیر مقدم کریں گے۔

رفیع الدین ہاشمی

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

اورینٹل کالج لاہور

دیباچہ

علّامہ اقبالؒ کو قدرت نے بہت سی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ نہ صرف شعروادب کے میدان کے شہسوار تھے بلکہ وہ فلسفہ و تصوّف اور دیگر علوم کے اَسرار و غوامض سے بھی آگاہ تھے۔ ان کے اندازِ فکر کی ایک نمایاں ترین خصوصیت توازن و اعتدال ہے چونکہ وہ تقلیدِ کورانہ کے سخت مخالف تھے اس لئے وہ ہر اہم موضوع کے بارے میں اپنا مخصوص تصوّر رکھتے تھے۔ وہ قرآنی تعلیمات کی روشن قندیل کی وساطت سے کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کے عادی تھے۔ وہ اگر اَغیار کے بعض اسلامی تصوّرات کے مدح خواں تھے تو وہ اپنوں کے غیر اسلامی اَفکار کے نکتہ چین بھی تھے۔ ان کی نظر میں قرآنی تعلیمات اور صحیح اسلامی اَقدار ہی حق و باطل کا معیار تھیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ بلاشبہ اس دور میں قرآنِ حکیم اور اسوۂ رسولؐ کے سب سے بڑے مبلغ و مفکّر تھے۔ مفکّرِ اسلام اور شاعرِ مشرق علّامہ اقبالؒ نے تصوّف کے موضوع پر بھی قرآنی نقطہ نگاہ کو سامنے رکھ کر نظم و نثر میں اپنے گوناگوں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی رائے میں اسلام چونکہ توحید کا علمبردار ہے اس لئے اس میں ہمیں ثنویّت اور دُوئی کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ دین و دنیا کی تفریق، مذہب و سیاست کی تمیز اور تصوّف و شریعت کی جدائی کا قرآنِ حکیم اور فرمودات رسولؐ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یہ امتیازات دراصل غیر قرآنی نظامِ فکر اور غیر اسلامی تہذیبوں کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اسی طرح رہبانیت اور بے عملی قرآنی مقاصدِ حیات سے ہم آہنگ نہیں۔ علّامہ اقبالؒ نے ہمیشہ دین و سیاست کی تفریق اور شریعت و تصوّف کی ثنویت کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے مسلمانوں کو دین و دنیا کی

حسنات حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ جو حضرات تصوّف کو شریعت پر فائق یا تصوّف کو شریعتِ اسلامیہ سے الگ خیال کرتے ہیں وہ درست نظریۂ زندگی کے حامل نہیں۔ جب علمائے سُو نے اپنے دینی فرائض کو نظر انداز کر کے شاہانِ وقت کی چوکھٹ پر ناصیہ فرسائی شروع کر دی اور اعلانِ صداقت سے گریزاں ہُوئے تو بعض نیک طینت اور خدا ترس انسانوں نے ان کے مذموم کردار کی مخالفت کی۔ انہوں نے عوامُ النّاس کو ایسے دین فروش اور منصب پرست علماء کے چُنگل سے بچانے کے لئے علمی اور عملی جِدّوجُہد کا آغاز کر دیا تھا۔ یہ نیک فطرت انسان تصوّف کو صفائے باطن کا مؤثر ذریعہ بنانے کے حق میں تھے تاکہ ہماری تمام سرگرمیوں کا محور خدا کی محبّت اور عشقِ رسولؐ کا جذبہ ہو۔ علامہ اقبالؒ تصوّف کے اس پہلو یعنی ''اخلاص فی العمل'' کی اہمیّت و افادیّت کے حامی تھے لیکن جب بعد ازاں غیر اسلامی معاشرت کے زیرِ اثر اس میں ہندومت 'عیسائیت' بدھ مت اور فلسفۂ یونان کے مخربِ اخلاق اور عمل کُش عناصر شامل ہو گئے تو یہ تصوّف خالصتاً اسلامی تصوّف نہ رہا۔ علّامہ اقبالؒ ہمیشہ اس عجمی اور غیر اسلامی تصوّف کے خلاف قلمی جہاد کرتے رہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ امرِ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا کہ وہ اخلاص فی العمل کو تصوّف کا ایک لازمی جزو خیال کرتے تھے۔ میں نے اپنی استطاعت کے مطابق تصوّف کی اہمیّت کے بارے میں علّامہ اقبالؒ کے زیادہ سے زیادہ افکار و احساسات کو یہاں بیان کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ قارئین اس اہم موضوع کے مختلف پہلوؤں سے بخوبی واقف ہو سکیں۔

سپُردم بتو مایۂ خویش را
تُو دانی حسابِ کم و بیش را

محمد شریف بقا

حصّہ اوّل

اقبالؒ اور تصوّف

علاّمہ اقبالؒ کو خدا تعالیٰ نے گوناگوں خوبیوں سے نوازا ہوا تھا۔ وہ نہ صرف ایک عظیم المرتبت شاعر، حقیقت رس مفکرؔ، دُور اندیش مُصلحِ قوم، ہمدرد سیاستدان، سچے عاشقِ رسولؐ، علومِ مشرق و مغرب کے ماہر تھے بلکہ وہ اسلامی تعلیمات کے نقیب و ترجمان بھی تھے۔ ان کی متنوع شخصیت کی طرح ان کے کلام میں بھی ہر نوع کے موضوعات ملتے ہیں۔ انہوں نے انسانی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں اور معاشرتی اصلاح کے متعدد گوشوں کے بارے میں اپنی منظومات اور نثری تصانیف میں بڑے دلکش انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کے کلام کی یہ وُسعت اور بوقلمونی ان کے تبحّرِ علمی اور شاعرانہ عظمت کا زندہ ثبوت ہیں۔ اس لحاظ سے اگر ان کے کلام کو "امرت دھارا" کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہو گا۔ موضوعات کی اس رنگارنگی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے افکار و نظریات سے لُطف اٹھانے والے زندگی کے مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھتے ہیں۔ سیاستدان، شاعر، فلسفی، زاہد، رِند، مذہب پرست، انسانیت دوست، معاشرتی انقلاب کے داعی، طلبہ، صحافی، عارف و صوفی، مرد و زن اور مسلم و غیر مسلم سبھی اپنی اپنی ذہنی استعداد اور علمی ذوق کے مطابق علاّمہ اقبالؒ کے انقلاب آفریں، حیات بخش اور وجد آور کلام اور خیالات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ جس شاعر اور مفکّر کے کلام اور افکار میں آفاقیت اور وُسعت پائی جائے گی وہ یقیناً ہر دَور میں لاتعداد انسانوں کی فیض رسانی کا سبب ہو گا۔ زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا رہے گا علاّمہ اقبالؒ کے تعمیری اور انسانیت ساز پیغام اور افکار کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا۔ اگر بنظرِ

تعمق دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کے خیالات واحساسات کی یہ ہمہ گیری ان کے تبحرِ علمی اور قرآنی تعلیمات کی رہینِ منّت ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مشرق کے اس نامور شاعر اور اسلام کے اس مایۂ ناز مفکّر نے شاعرانہ اور فلسفیانہ موضوعات کے علاوہ صوفیانہ مسائل اور عارفانہ امور کے بارے میں بھی اپنے گراں قدر اور خیال افروز نظریات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی بیشتر منظومات اور نثرپاروں میں جگہ جگہ تصوّف و معرفت سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ علاّمہ اقبالؒ کے کلام و پیام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی اہم موضوع کے بارے میں انتہا پرستی کا شکار نہیں ہوتے۔ اعتدال پسندی کو وہ کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کرتے، وہ ہر مسئلے کے اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں تاکہ ان کے قارئین بھی متوازن نظریۂ حیات کے مالک بن سکیں۔ یہ بات کافی حد تک افسوسناک اور لائقِ مذمت ہے کہ بعض تنگ نظر اور متعصب لوگ ان کے کلام اور خیالات سے اپنے مخصوص مقاصد کے پیشِ نظر صرف وہ چیزیں لیتے ہیں جو ان کے پہلے سے قبول کردہ نظریات کی تائید کرسکیں۔ علاّمہ اقبالؒ نے تصویر کا جو دوسرا رُخ پیش کیا؟ وہ اسے دیدہ و دانستہ نظرانداز کر دیتے ہیں تاکہ دوسرے لوگوں کو ان کی خام خیالی، تعصّب اور کم نگاہی کا پتہ نہ چل سکے۔ وہ صرف ایک پہلو کو لے کر علاّمہ اقبالؒ کو بھی اپنا ہمنوا ثابت کرنے کی ناکام اور غیر منصفانہ کوشش کرتے ہیں۔ شاعرِ مشرق اور مفکّرِ اسلام علاّمہ اقبالؒ نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لاتعداد پہلوؤں پر ہمیشہ بڑے متوازن اور تعمیری انداز میں اپنی رائے کو ظاہر کیا ہے۔ جمہوریت، اسلام، تصوّف، خودی، مشرقی نظامِ حیات، مغربی تہذیب، فرد، جماعت، دین و مذہب، فلسفۂ اخلاق اور شعر و ادب کے موضوعات کو انہوں نے ہمیشہ بڑی میانہ روی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ ہر اہم موضوع کے اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں کو بڑے مؤثر طریق پر دلائل کے ساتھ بیان کرتے ہیں تاکہ قارئین پر حقیقت بخوبی آشکار ہو جائے۔ کیا یہ بات قابلِ افسوس نہیں کہ ان کے خیالات کے صرف ایک آدھ پہلو کو پڑھ کر ہی ان کے پیام کا اصل ماحصل قرار دینے پر اصرار کیا جاتا ہے؟ میرے خیال میں یہ روش نہ صرف علمی کم مائیگی اور ذاتی تعصّب کی نشاندہی کرتی ہے بلکہ یہ پیامِ اقبالؒ کے ساتھ بھی سخت ناانصافی ہے۔ علاّمہ اقبالؒ کے نظریۂ تصوّف کے بارے میں بھی بدقسمتی سے ایسا ہی سلوک کیا جارہا ہے۔ تصوّف کے شیدا اور حامی انہیں تصوّف کا عظیم مبلّغ اور صوفی قرار دے رہے ہیں لیکن تصوّف دشمن حضرات انہیں تصوّف کا زبردست ناقد اور مخالف خیال کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی عادت کے مطابق علاّمہ اقبالؒ نے اس اہم اور متنازعہ امر کے بارے میں بھی میانہ روی اور انصاف سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اپنے اسلامی نظریۂ حیات کی روشنی میں اس موضوع کے دونوں پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے تاکہ قارئین اچھے اور بُرے تصوّف کی حقیقت سے آگاہ ہوسکیں۔ (جو تصوّف انہیں قرآنی تعلیمات سے ہم آہنگ نظر آتا ہے وہ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جو تصوّف قرآنی معیار پر پورا نہیں اترتا وہ اس کی پُرزور مذمت کر

کے اپنی حقیقت پسندی، انسان دوستی اور اسلام پرستی کا واضح ثبوت بہم پہنچاتے ہیں)۔
علامہ اقبالؒ کے بارے میں کوئی حتمی اور فیصلہ کن بات کرنے سے قبل یہ لازمی ہے کہ ہم ان کے سارے کلام وپیام کا حقیقت پسندانہ انداز میں مطالعہ کریں وگرنہ ہمارا ایکطرفہ فیصلہ صداقت و دیانت کے اصولوں کے قطعاً منافی ہو گا۔

اے اہلِ نظر! ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

تصوّف کیا ہے؟

تصوّف کی اہمیت وافادیت کے بارے میں علاّمہ اقبال ؒ کے افکار ونظریات کا جائزہ لینے سے پہلے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ تصوّف کی نوعیت وتعریف کو بھی مختصراً بیان کر دیا جائے۔ تصوّف کی کتابوں اور مشہور صوفیاء کی تصانیف میں تصوّف کی ماہیّت اور لغوی معانی کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ میں یہاں چند آراء کو درج کر رہا ہوں تاکہ قارئینِ کرام اس کے ضروری پہلوؤں سے کسی قدر آگاہ ہو سکیں۔
ذیل میں بیان کردہ آراء اور تعریفات ملاحظہ ہوں:۔

(I) "تصوّف ایک جامع ومانع لفظ ہے، جو فقر اور زُہد سب پر حاوی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ زُہد اور فقر کے علاوہ کچھ اور بھی اوصاف اور اضافات ہیں جب تک وہ نہ پائے جائیں صوفی صحیح معنوں میں صوفی کہلانے کا حق دار نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ زاہد اور فقیر کیوں نہ ہو"۔

(شیخ شہاب الدین سہروردی ؒ "عوارف المعارف")

(II) "تصوّف کے معنی ہیں حقائق کا علم حاصل کرنا، مخلوق کے ہاتھ میں از قبیل نعائم واقتدار جو کچھ ہے اس سے یکسر رُو گرداں ہو جانا"۔

(معروف کرخی ؒ)

(III) "تصوّف کے معنی ہیں کہ جملہ اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ طیّبہ کے ایوان میں

داخل ہوجانااور ہر قسم کے اخلاقِ رذیلہ اور اوصافِ ردّیہ سے پاک صاف ہوجانا"۔

(ابو محمدؒ جریری)

(IV) "تصوّف یہ ہے کہ حق تجھے تیرے وجود سے الگ کر کے ہلاک کر دے اور پھر جو زندگی وہ تجھے دے، وہ صرف اسی کے لئے ہو... میرا تصوّف قرآن وسنت میں مقید ہے۔جو بات قرآن و حدیث سے ثابت نہ ہو وہ مردُود ہے"۔

(جنید بغدادیؒ)

(V) "تصوّف سلوکِ حقیقی کا ایک گوشہ ہے اور اس کا کام نفس کی تہذیب اور اس کا تزکیہ ہے تاکہ اس کو رفیقِ اعلیٰ کی صحبت کی سیر کے لئے تیار کر دے... اس علم کا قلب سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے اس کی تمام سرگرمیاں قلب ہی سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے اس کو علمِ باطن کہتے ہیں"۔

(علامہ حافظ ابن قیمؒ "مدارج السالکینؒ") *

(VI) "صوفیانہ لباس پہن لینے سے کوئی شخص صوفی نہیں بن سکتا۔ تصوّف تو اصلاحِ باطن کا نام ہے نہ کہ پیوند لگی ہوئی گدڑی کا"۔

(ابو نصر سراجؒ "کتاب اللمع" ص۔ 137)

(VII) "تصوّف نام ہے نفس کو غیر اللہ میں مشغول ہونے سے باز رکھنے کا"۔

*(ابُوسعید ابُوالخیرؒ)

(VIII) "فقہ کا تعلق انسان کے ظاہری عمل سے ہے، وہ صرف یہ دیکھتی ہے کہ تم کو جیسا اور جس طرح حکم دیا گیا تھا اس کو تم نے کیا یا نہیں۔ اگر بجالائے ہو تو فقہ کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ تمہارے دل کا کیا حال تھا۔ دل کے حال سے جو چیز بحث کرتی ہے اس کا نام تصوّف ہے۔ قرآن میں اس چیز کا نام تزکیہ اور حکمت ہے۔ حدیث میں اسے احسان کا نام دیا گیا ہے اور بعد کے لوگوں میں یہی چیز تصوّف کے نام سے مشہور ہوئی"۔

*(سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ "رسالۂ دینیات")

(IX) "انسانی جِدّوجُہد کا مقصد فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے صرف کرنا ہے۔ اس سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اسی کو تزکیۂ نفس کہا جاتا ہے۔ "تزکیہ" کے معنی ہی نشوونما پانا یعنی اقدارِ خداوندی کے اتباع سے انسانی ذات کی صلاحیتوں کا نشوونما پانا۔ قرآنِ کریم نے اس کا ذریعۂ تعلیم کتاب و حکمت بتایا ہے"۔

(غلام احمد پرویز "تصوّف کی حقیقت" ص۔ 50-49)

علامہ اقبالؒ مرحوم و مغفور نے تصوّف کی تعریف و نوعیت سے متعلق جن خیالات کو ظاہر کیا ہے ان کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ان کی نثر سے چند اقتباسات ہدیۂ قارئین کئے جاتے ہیں۔ محمد حسین عرشی نے 1935ء میں علامہ اقبالؒ سے ایک ملاقات کے دوران تصوّف و معرفت کے سلسلے میں چند باتیں دریافت کی تھیں۔ انہوں نے عرشی صاحب کے سوالات کا جو جواب دیا تھا وہ یہاں عرشی صاحب کے الفاظ میں ہی بیان کیا جاتا ہے:۔

"میں نے عرض کیا:۔ معرفت الٰہی سے کیا مراد ہے؟۔ آپ نے فرمایا:۔ سیّد الطائفہ جنید بغدادیؒ کے نزدیک معرفت یا عرفان کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب یا مضاف نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ قرآنِ عزیز میں اس کا استعمال نہیں کیا گیا البتہ علم و ایمان کا ذکر بار بار آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ تو عارف ہے نہ معروف۔ ہاں "عالِم و علیم" اور "معلوم" ہے جس پر بہت سی آیتیں شاہد ہیں...... اس کے بعد لفظ علم پر گفتگو ہوئی تو فرمایا "علم کی دو قسمیں ہیں ایک ہمارے اکتسابی معلومات کا ذخیرہ...... دوسرا وہ علم ہے جو خواص کو عطا ہوتا ہے وہ بے منّتِ کسب قلب و روح کے اعمال سے اُبلتا ہے"۔ میں نے عرض کیا اس علم کی کلید کیا ہے؟۔ فرمایا:۔ ارشادِ خداوندی ہے "قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّـٰهَا" جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا اس پر علم کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ میں نے کہا:۔ تزکیۂ نفس کا طریق کیا ہے؟ اس پر آپ نے صوفیا کے بعض مشاغل کی طرف اشارہ کر دیا"۔

(محمود نظامی "ملفوظات" ص 57۔ 56)

"صوفیوں کی اصطلاحات اور زبان کے استعمال سے کوئی صوفی تھوڑا ہی بن جائے گا جس طرح گون Gown پہننے سے کوئی پادری نہیں بن جاتا"۔

(محمود نظامی "ملفوظات" ص۔ 312)

"اسلام کو دینِ فطرت کے طور پر محسوس اور اختیار کرنے کا نام تصوّف ہے اور ایک اخلاص مند مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کیفیت کو اپنے اندر پیدا کرے"۔

(بشیر احمد ڈار "انوارِ اقبال" ص۔ 46،
سید نذیر نیازی کے نام خط مورخہ اکتوبر 1935ء)

"حدودِ خودی کے تعیّن کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے"۔

("انوارِ اقبال" ص۔ 217)

(ظفر احمد صدیقی کے نام خط مورخہ 12ر دسمبر 1936ء)

علامہ اقبالؒ شعارِ حقّہ اسلامیہ میں خلوص اور شعائرِ اسلام میں مخلصانہ استقامت پیدا کرنے والے تصوّف کے حامی اور مدّاح تھے لیکن وہ اس تصوّف کے مخالف تھے جو شریعتِ اسلامیہ کی پابندی سے گریز کی تلقین کرتا تھا۔ وہ برِّصغیر پاک و ہند کی ایک نامور علمی شخصیت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے تصوّر تصوف و معرفت کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"حضرت مجدّد الف ثانی علیہ الرحمتہ اپنے مکتوبات میں کئی جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تصوّف شعارِ حقّہ اسلامیہ میں خلوص پیدا کرنے کا نام ہے۔ اگر تصوّف کی یہ تعریف کی جائے تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ راقم الحروف اس تصوّف کو جس کا نصب العین شعائرِ اسلام میں مخلصانہ استقامت پیدا کرنا ہو عین اسلام جانتا ہے اور اس پر اعتراض کرنے کو بدبختی اور خسران کے مترادف سمجھتا ہے لیکن اہلِ نظر کو معلوم ہے کہ صوفیائے اسلام میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو شریعتِ اسلامیہ کو علم ظاہر کر کے حقارت آمیز خطاب سے یاد کرتا ہے اور تصوّف سے وہ باطنی دستور العمل مراد لیتا ہے جس کی پابندی سے سالک کو فوق الادراک حقائق کا عرفان یا مشاہدہ ہوتا ہے"۔

(ایضاً ص۔ 268)

علامہ اقبالؒ تصوف میں "اخلاص فی العمل" کی تعریف کو تو بدل و جان تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن وہ تصوّف میں لایعنی فلسفیانہ عناصر کی آمیزش کے خلاف اپنی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں:۔

"تصوّف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا ہاں جب تصوّف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات سے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس سے بغاوت کرتی ہے"۔

(شورش کاشمیری "فیضانِ اقبال" ص۔ 34-333)
(محمد اسلم جیراج پوری کے نام خط)

جب علامہ اقبالؒ کی پہلی فارسی تصنیف "اسرارِ خودی" 1915ء میں اشاعت پذیر ہوئی تو اس میں ایران کے مشہور شاعر حافظ شیرازی کے صوفیانہ مسلک اور غیر اسلامی تصوّف کے بارے میں اقبالؒ کے تنقیدی اشعار بھی شامل تھے۔ بعض تصوّف پرست افراد اور حلقوں کی جانب سے اقبالؒ کے خلاف مخالفت کا طوفان کھڑا ہو گیا۔ تصوّف کے حامی اور مخالفین ایک دوسرے سے قلمی جنگ کرنے لگے۔

خواجہ حسن نظامی مرحوم نے علاّمہ اقبالؒ کے خلاف اور حافظ کی حمایت میں مضامین لکھے۔ مولانا محمد اسلم جیراج پوری مرحوم اور دیگر اہلِ علم نے علاّمہ اقبالؒ کے مسلک کی حمایت میں لکھا۔ بعدازاں خواجہ حسن نظامی نے اپنی غلط فہمی کا اعتراف کیا اور وہ دوبارہ اقبالؒ کی دوستی کا دم بھرنے لگے۔ مولانا محمد اسلم جیراج پوری نے "الناظر" رسالے میں علاّمہ اقبالؒ کے نظریات کی درستگی کے بارے میں ایک طویل اور عالمانہ تبصرہ "اسرارِ خودی" کے بارے میں تحریر کیا تھا چنانچہ علاّمہ اقبالؒ نے اظہار تشکّر کے طور پر انہیں ایک خط لکھا تھا جس میں مندرجہ ذیل الفاظ بھی شامل تھے:۔

"آپ کا تبصرہ "اسرارِ خودی" پر "الناظر" میں دیکھا ہے جس کے لئے میں آپ کا بے حد شکر گذار ہوں...... تصوّف سے اگر اخلاص فی العمل مراد لی جائے (اور یہی مفہوم قرونِ اولیٰ میں اس کا لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا"۔

(مولانا محمد اسلم جیراج پوری کے نام خط مورخہ 17 رمئی 919ء)

ترجمانِ اسلام علاّمہ اقبالؒ کی رائے میں تصوّف محض لکھنے پڑھنے کی چیز نہیں بلکہ یہ عملی تربیت کا پروگرام ہے جو انسان کے اندر اعلیٰ صفات اور انسانی کمالات پیدا کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے چنانچہ وہ اپنے ایک عزیز دوست اور عقیدت مند کے نام خط میں لکھتے ہیں:۔

"تصوّف لکھنے پڑھنے کی چیز نہیں، کرنے کی چیز ہے۔ کتابوں کے مطالعے اور تاریخی تحقیقات سے کیا ہوتا ہے؟"۔

(سیّد نذیر نیازی "مکتوباتِ اقبال" ص۔ 10،
سیّد نذیر نیازی کے نام خط مورخہ 4 رجون 1929ء)

نثر کے علاوہ اپنی شاعری میں بھی حکیم الامّت اور مفکرِ اسلام علاّمہ اقبالؒ نے تصوّف کی تعریف میں کچھ کہا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں وہ اپنی ایک شعری تصنیف "زبورِ عجم" (مطبوعہ 1927ء) میں تصوّف و درویشی کے لئے محض علم، گدڑی اور ٹوپی کو لازمی نہیں سمجھتے بلکہ وہ ذوقِ نگاہ اور دنیاوی فرائض کو بھی اس کا جزوِ لاینفک خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

علمے کہ تُو آموزی، مشتاقِ نگاہے نیست
وا ماندۂ راہے ہست، آوارۂ راہے نیست
اقبالؔ قبا پوشد، در کارِ جہاں کوشد
دریاب کہ درویشی، با دلق و کلاہے نیست

(زبورِ عجم کلیّاتِ اقبال ص۔ 105)

جس طرح بادشاہ اپنی فوج کے اسلحہ کی بدولت دوسرے کو زیر کر لیتے ہیں اسی طرح فقر و تصوّف میں بھی "نگہ کی تیغ بازی" کے ذریعے انسانوں کے دلوں پر حکومت کی جاتی ہے۔ بادشاہ اپنے ظاہری رُعب داب کی بنا پر لیکن صحیح صوفی، فقیر، درویش اور مردانِ کامل اپنی باطنی پاکیزگی، کردار کی بلندی، اعلیٰ اخلاق کے سبب لوگوں کے قلوب واذہان کو مسخر کر لیتے ہیں چنانچہ اقبالؒ تصوّف کو "نگہ کی تیغ بازی" قرار دیتے ہوئے اپنی کتاب "بالِ جبریل" (مطبوعہ 1935ء) میں بجا کہتے ہیں۔

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی

(بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال ص۔ 17)

اس کے علاوہ علاّمہ اقبالؒ کی رائے میں تصوّف کی تعریف کا ایک پہلو دل کی سوز و مستی اور جذب و شوق رکھنے اور من کی دنیا میں ڈوب کر سراغِ زندگی پا جانے کا بھی نام ہے۔ وہ اس پہلو کو یُوں بیان کرتے ہیں۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن
من کی دنیا؟ من کی دنیا، سوز و مستی، جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا، سود و سودا، مکر و فن

تصوّف کا ارتقاء

اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے کہ علاّمہ اقبالؒ نے تصوّف کے مختلف پہلوؤں پر اپنی بیشتر تصانیف میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ تصوف کے بارے میں ان کے نظریات کو بخوبی جاننے کے لئے یہ بھی اشد لازمی ہے کہ ہم تصوف کی ابتداً اور درجہ بدرجہ ترقی سے متعلق کسی قدر آگاہ ہوں تاکہ ہمیں اس موضوع کے گوناگوں گوشوں کی ارتقائی ترقی اور تبدیلیوں کا مختصر جائزہ لینے میں مدد مل سکے۔ جہاں تک تصوّف کی تاریخ کا تعلق ہے یہ خاصی قدیم ہے جب سے انسان دنیا میں آیا ہے اس وقت سے اس کی رہنمائی اور فلاح کے لئے مختلف ادوار اور مختلف ممالک میں خدا کے برگزیدہ پیغمبر اور مصلحین آتے رہے ہیں۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے: لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (ہر ایک قوم کے لئے ہادی بھیجا گیا ہے)۔ خدا تعالیٰ نے گمراہ انسانوں کو راہ راست پر لانے اور انہیں جہالت و ضلالت کی تاریکیوں سے روشنی کی طرف لانے کے لئے ہمیشہ انبیاءؑ اور رُسلؑ کو مبعوث کیا تھا۔ آسمانی ہدایت انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی فلاح کی ضامن تھی جب مختلف عوامل اور اسباب کے تحت انسان گمراہی کا شکار ہو گئے تو نبیوں کے بعد ان کے نیک اور انسان دوست پیرو کاروں نے ان کی اصلاح و ہدایت کا فریضہ سرانجام دینا شروع کیا۔ بدلتے ہوئے حالات اور انسانی ذہن کی ترقی کے مطابق بعض اوقات انہوں نے بڑی نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ اصلاحِ باطن کے گوناگوں طریقے استعمال کئے چونکہ ہماری انفرادی اور اجتماعی تبدیلیاں سب سے پہلے ہمارے نفوس میں رونما ہوتی ہیں اس لئے انہوں نے خارجی انقلاب لانے سے پہلے اندرونی انقلاب پر زور دیا۔ انسان کی باطنی اصلاح،

اخلاقی تربیت، تعمیری اور صالح اندازِ فکر پیدا کرنے کے لئے ہر دَور میں اسی طرح کی کوششیں جاری رہی ہیں۔ اس لحاظ سے دنیا کی کوئی قوم بھی کسی دَور میں اصلاحِ نفس کے فیض سے محروم نہیں رہی۔ دنیا کی تمام قوموں کا ادبی اور ثقافتی سرمایہ تصوّف و معرفت کے مسائل اور اسرار سے خالی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تصوّف و معرفت کی نوعیت اور مقاصد مختلف رہے ہوں۔ ہندوؤں 'یونانیوں 'چینیوں 'مصریوں 'یہودیوں اور عیسائیوں کی اصلاحی اور الہامی کتابیں اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ ان کے مصلحین اپنے اپنے مخصوص انداز میں انسانوں کے فکر و عمل کی دُرستگی 'قلب و نظر کی تطہیر اور اعلیٰ مقاصدِ حیات کی تولید کے لئے سرگرم عمل رہے ہیں ان کا صوفیانہ لٹریچر مختلف ارتقائی مراحل سے گذرتا رہا ہے۔

اسلامی تصوف بھی اپنی ابتداء سے لے کر اب تک مختلف طرح کی تبدیلیوں کا حامل ہے۔ مسلم تصوّف سے متعلق کتب کا عمیق مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں تصوّف کا زیادہ تر رواج پہلی اور دوسری صدیوں کے دوران ہوا۔ اکثر محققین اور ناقدین کی رائے میں مسلم تصوّف کے اوّلین حامل حسن بصری؁ 'ابوہاشم 'ابراہیم بن ادہم 'رابعہ بصری؁ اور سفیان ثوری؁ وغیرہ تھے۔ بعض مؤرّخین اصحابِ صُفّہ سے تصوّف کی ابتداء خیال کرتے ہیں۔ اکثر و بیشتر تبصرہ نگاروں کے خیال میں ظہورِ اسلام سے تصوف کا آغاز ہو گیا تھا۔ مسلم تصوّف کے ناقدین اور مخالفین ہندومت 'یہودیت اور افلاطونیت کو مسلم تصوف کا اہم سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ غیر اسلامی تصوّف کے بارے میں ان ناقدین کی رائے کو تسلیم تو کیا جا سکتا ہے لیکن خالص اسلامی تصوّف کے بارے میں ان کی یہ رائے کوئی وزن نہیں رکھتی۔ اسلامی تصوّف کے حامی قرآن و سنّت کو اسلامی تصوّف کا اصل منبع تصوّر کرتے ہیں چنانچہ اپنے اس خیال کی تائید میں وہ کئی قرآنی آیات اور احادیث پیش کرتے ہیں۔ پہلی اور دوسری ہجری صدی میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ کافی دُور تک پھیل چکا تھا مختلف ممالک کی تسخیر اور وہاں کے باشندوں کے ساتھ میل ملاپ کی بنا پر زیادہ تر مسلمانوں کے خیالات و عقائد میں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ تہذیبی 'تمدنی 'ثقافتی 'سماجی 'سیاسی اور فکری تبدیلیوں کے علاوہ ان کے پاس دولت کی بھی ریل پیل تھی۔ سادہ طرزِ زندگی کی بجائے عیش و عشرت اور خدا فراموشی کا جذبہ بھی پیدا ہو رہا تھا۔ خلافت کی بجائے ملوکیت نے بھی عیش کوشی 'نشاط طلبی 'تن آسانی 'دین سے لاپروائی اور اخلاقی مصائب کو جنم دے دیا تھا۔ ایسے حالات میں نیک اور دین دار افراد نے دینِ اسلام کے قیام و استحکام کے لئے سعی کی اور بعض لوگ زیادہ سے زیادہ عبادت و زُہد میں مشغول ہونے لگے۔ اپنی دین داری 'سخت ریاضت و عبادت 'حبِ الٰہی 'دنیاوی جاہ و مال سے بے نیازی اور سادگی کے سبب وہ دوسرے لوگوں سے ممیّز نظر آتے تھے اور لوگ انہیں عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہوئے عبّاد اور زہّاد کہتے تھے۔ دوسری صدی ہجری میں یہ لوگ "صوفی" کہلانے لگے۔ دوسری صدی ہجری ہی میں یہ تصوّف پرست لوگ بصرہ اور کوفہ کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی پھیل گئے تھے۔ حسن بصری؁ کے صوفیانہ نظریات کی بنیاد خوف اور حُزن تھے 'اپنی گذشتہ کوتاہیوں اور لغزشوں پر وہ غم کھاتے تھے اور آئندہ اپنے گناہوں کی سزا سے بھی خوف کھاتے تھے۔ اسی صدی میں حضرت رابعہ بصری؁ اپنے زُہد و عبادت کی وجہ سے

کافی مقبول ہو گئی تھیں۔ انہوں نے تصوّف میں حُزن و خوف کے علاوہ خدا کی شدید محبّت کا عنصر بھی شامل کر دیا تھا۔ ان دونوں صدیوں کے معروف ترین صوفیاء حسن بصریؒ، رابعہ بصریؒ، سفیان ثوریؒ اور ابو ہاشمؒ اور ابراہیم بن ادہمؒ وغیرہ ہیں۔

تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں صوفیانہ مسلک کا زیادہ تر دارومدار حضرت رابعہ بصریؒ کے نظریۂ تصوّف یعنی خدا کی شدید لگن اور اس کی بے غرضانہ محبّت پر تھا۔ ان دو صدیوں میں تصوّف دیگر ممالک مثلاً مصر، شام اور ایران وغیرہ تک خوب پھیل چکا تھا۔ صوفیاء نے اپنے اپنے صوفیانہ مکتبِ فکر قائم کیے تھے۔ شیوخ نے باقاعدہ حلقہ ہائے ارادت میں رُشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کر کے لوگوں کے اذہان و قلوب کا تزکیہ کیا۔ ان دو اَدوار میں تصوّف میں نئی باتوں کا اضافہ بھی ہوا۔ فنائے نفس، اتحادِ ذاتِ رب، سُکر و بیخودی، شریعت و طریقت (علمِ ظاہر اور علمِ باطن) کے عقائد نے تصوّف کو زیادہ متنوع بنا دیا۔ اس کے علاوہ حسین بن منصور حلّاج کے نزاع خیز تصوّرات (حلول، حج کی عدم ضرورت، وحدتِ ادیان) نے اہلِ شریعت فقہا کو اہلِ طریقت (صوفیاء) کے خلاف بھڑکا دیا کیونکہ وہ صوفیاء کے بعض افکار کو نہ صرف شریعت بلکہ قرآنی تعلیمات کی نفی خیال کرتے تھے۔ ابو یزید بسطامیؒ اور منصور حلّاج کی شطحیات نے فقہا اور صوفیاء کی جنگ میں مزید شدّت پیدا کر دی تھی۔ ابو یزید بسطامیؒ کے قول "سبحانی ما اعظم شانی" (میں پاک ہوں، میری شان کتنی عظیم ہے) اور حسین بن منصور حلّاج کے قول "اَنَا الحَقّ" (میں حق ہوں) کو فقہائے کرام اور علمائے عظّام اعلانِ الوُہیت کے مترادف سمجھتے تھے۔ نعرۂ "اَنَا الحَقّ" بلند کرنے کی پاداش میں حلّاجؒ کو سزائے قتل دی گئی تھی۔ بعض صوفیاء طریقت کو شریعت پر اور باطنی کیفیات کو احکامِ شرع پر ترجیح دیتے تھے۔ یہ طریقِ کار علماء اور فقہاء کو ہرگز پسند نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ اس دَور سے لے کر اب تک طریقت اور شریعت کے درمیان امتیاز کیا جاتا ہے۔ اکابر صوفیاء کے نزدیک طریقت کی طرح شریعت کے ظاہری احکام کی پابندی بھی انتہائی ضروری ہے بلکہ وہ تو شریعت تک پہنچنے کے لئے طریقت کو ایک مفید ذریعہ قرار دیتے تھے۔ تیسری اور چوتھی صدی کے معروف ترین صوفیاء ذوالنون مصریؒ، معروف کرخیؒ، جنید بغدادیؒ، سری سقطیؒ، حارث محاسبیؒ، ابو یزید بسطامیؒ، ابو بکر شبلیؒ، ابو طالب مکیؒ اور حسین بن منصور حلّاج (244ھ تا 309ھ) تھے۔ اس دور کی چند بلند پایہ کتابیں یہ ہیں:۔

کتابِ امثال القرآن اور کتابِ رسائل (جنید بغدادیؒ)

کتاب الطّواسین (منصور حلّاجؒ)

قوت القلوب (ابو طالب مکیؒ)

پانچویں صدی ہجری کی تین ممتاز اور مشہور شخصیات ابو حامد امام غزالیؒ (450ھ تا 505ھ)، شیخ علی ہجویریؒ (متوفی 456ھ) اور ابو القاسم قشیریؒ (متوفی 465ھ) نے تبلیغ دین اور تصوّف کی اشاعت کے ضمن میں نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ امام غزالیؒ کی احیائے علوم الدّین، علی ہجویریؒ

کی کشف المحجوب۔ اور امام قیشریؒ کی الرسالۃ القیشریہ بلند پایہ تصنیفات خیال کی جاتی ہیں۔ جہاں تک اس دَور کی عظیم ترین شخصیت امام غزالیؒ کا تعلق ہے انہوں نے علمِ کلام اور فلسفہ پر تصوّف کو ترجیح دے کر دراصل عقل پر الہام ووجدان کی برتری کو ثابت کیا تھا۔ فلسفہ اور علمِ کلام کی دشت نوردی کرنے کے بعد انہیں کوچۂ تصوّف میں عافیتِ قلب حاصل ہوئی۔ مزید بر آں انہوں نے تصوّف کے خلاف علمائے شریعت اور فقہائے دینِ متین کی غلط فہمیوں کو رفع کر کے شریعت و طریقت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی سعئ بلیغ کی۔ کافی عرصہ تک اہلِ شریعت (اہلِ ظاہر یا اہلِ رسوم) اور اہلِ طریقت (اہلِ باطن اور اہلِ حقیقت) کے درمیان صلح و محبّت کی فضا قائم رہی لیکن آئندہ صدیوں میں صوفیاء اور فقہا پھر ایک دوسرے کو ہدفِ ملامت بنانے لگے۔ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں تصوّف کے اندر مزید نئے نئے تغیّرات آئے۔ فلسفہ اور علمِ کلام کا مطالعہ کرنے کے لئے تصوّف نے بھی فلسفیانہ زبان کا سہارا لینا شروع کر دیا اس طرح تصوّف میں کئی غیر ضروری مابعد الطبیعی مسائل کو زیرِ بحث لایا گیا۔ انسان اور خدا کے درمیان مغائرت دُور کرنے کے لئے وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود اور حلول کے عقائد داخل ہو گئے۔ علاوہ ازیں فرقۂ باطنیہ اور فرقہ اسماعلیہ کے بعض عقائد نظریۂ کشف و کرامت اور شطحیات کو بھی تصوّف کا لازمی جزو بنا دیا گیا۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور محی الدین ابنِ عربیؒ کو بعض نظریات کی بنا پر گمراہ اور مردُود قرار دیا گیا۔ فقہا اور علمائے شریعت کی رقابت اور تنگ نظری کے سبب شہاب الدین سہروردیؒ کو سزائے موت دلوائی گئی۔ علامہ ابنِ تیمیتہ، ابنِ خلدونؒ اور علامہ ابنِ حجر نے محی الدین ابنِ عربیؒ کے نظریۂ وحدۃ الوجود اور وحدتِ ادیان کے تصوّر پر سخت تنقید کی تھی۔ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں کئی قابلِ ذکر صوفیانہ مسالک مثلاً قادریہ، سہروردیہ، شاذلیہ اور مولویہ وغیرہ رائج ہو گئے تھے۔ اس دور کی یہ کتابیں بہت اہم خیال کی جاتی ہیں:۔

حکمۃ الاشراق (شیخ شہاب الدین سہروردیؒ)

الفتوحات المکیّۃ (محی الدین ابنِ عربیؒ)

آٹھویں صدی ہجری کے آخر اور نویں صدی ہجری کے آغاز میں ایک قابلِ ذکر شخصیت عبدالکریم الجیلیؒ نے بلند پایہ کتاب "الانسان الکامل" (انسانِ کامل) لکھ کر تصوّف و معرفت کے ادب میں نمایاں اضافہ کیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اپنی اس کتاب میں محی الدین ابنِ عربیؒ کے افکار و نظریات سے کافی استفادہ کیا ہے تاہم ان کا نظریۂ انسانِ کامل ان کی مخصوص فکر کا آئینہ دار ہے۔

آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے بعد کافی عرصہ تک جامد اندازِ فکر اور تقلیدِ کورانہ کی وجہ سے تصوّف میں تازگی پیدا نہ ہوئی۔ مولانا جامیؒ کی "نفحات الانس" رومی کی "مثنوی" اور دیگر ممتاز صوفیاء کی تصانیف تصوّف و معرفت کا گنجینہ خیال کی جاتی ہیں۔ برِ صغیر پاک و ہند میں خواجہ معین الدّین چشتیؒ، نظام الدین اولیاؒ، بو علی شاہ قلندرؒ، سید علی ہمدانیؒ، میاں میرؒ، داتا گنج بخش علی ہجویریؒ، بابا فریدؒ اور دیگر اکابر

صوفیاء نے اپنے اعلیٰ کردار اور دینی جوش کے سبب لاتعداد انسانوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا تھا۔ ان بزرگوں کی دینی خدمات اور اسلام پرستی کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں انقلاب پیدا کرنے سے قبل انہوں نے اپنی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ ان کے مثالی کردار کو دیکھ کر اغیار خود بخود ان کے دین کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ ایسے نفوسِ قدسیہ کی پُراثر شخصیت کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے یہ کہا تھا۔

من نمی دانم چہ افسوں می کند
روح را درتن دگرگوں می کند

(میں نہیں جانتا کہ وہ (مردِ کامل) کیا جادو کرتا ہے' وہ جسم میں روحانی انقلاب برپا کر دیتا ہے)

علامہ اقبالؒ نے بھی تصوّف کے ارتقاء کے چند پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ قارئین کو ان کے افکار و احساسات سے بھی آگاہی حاصل ہو سکے۔ وہ مسلمانوں کے فکری جمود' علمائے شریعت اور پیروانِ طریقت کے باہمی تنازعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"The rise and growth of ascetic Sufism which gradually developed under the influence of a non-Islamic character, a purely speculative side, is to a large extent responsible for this attitude. On its purely religious side Sufism fostered a kind of revolt against the verbal quibbles of our early doctors. The case of Sufyan Sauri is
and subtleties of contemporary legists drove him to ascetic sufism.

(The Recostruction of Religious thought in Islam) (P 150)

یعنی علامہ اقبالؒ کی رائے میں فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے راہبانہ تصوّف غیر اسلامی باتوں سے زیرِ اثر پروان چڑھا۔ اس قسم کے رہبانیت آمیز تصوّف کا ظہور اور نمود کافی حد تک اسلام میں فکری جمود کا ذمہ دار ہے لیکن مذہبی نقطۂ نظر سے تصوّف ہمارے قدیم فقہاء لفظی موشگافیوں کے خلاف ایک قسم کی بغاوت تھا۔ اس بارے میں سفیان ثوریؒ کی مثال دی جا سکتی ہے اس کے ہم عصر فقہا کی غیر دلچسپ موشگافیوں نے اسے راہبانہ تصوّف کی طرف مائل کر دیا تھا۔

ابتدائی دَور کے اسلامی تصوّف کے زُہد پرست صوفیاء اور بعد کے اَدوار کے فلسفہ زدہ صوفیاء کے بارے میں علامہ اقبالؒ یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سعید اللہ نے 21 نومبر 1937ء کو ان سے ملاقات کے دوران تصوّف کے بارے میں چند سوالات کئے جن کا جواب دیتے ہوئے حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے کہا:۔

"اسلام کے اوّلین دور کے صوفی زہّاد تھے۔ زُہد اور تقویٰ ان کا مقصد تھا۔ بعد کے

تصوّف میں مابعد الطبیعیات کا اضافہ نظر آتا ہے اس میں فسلفہ کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ ہمہ اُوست مذہبی مسئلہ نہیں یہ فلسفہ کا مسئلہ ہے وحدت و کثرت کی بحث سے اسلام کو کوئی سرو کار نہیں۔ اسلام کی روح توحید ہے اور اس کی ضد کثرت بلکہ شرک ہے وہ فلسفہ اور وہ مذہبی تعلیم جو انسانی شخصیت کی نشوونما کے منافی ہو' بیکار چیز ہے۔ گوش و چشم کو بند کرنا اور صرف چشم باطن پر زور دینا جمود اور انحطاط ہے۔ خالص اسلامی تصوّف یہ ہے کہ احکامِ الٰہی انسان کی اپنی ذات کے احکام بن جائیں۔

یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن"

وحدت الوجود نظریئے کے زبردست حامی اور مبلغ محی الدین ابنِ عربیؒ نے چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں خالق اور مخلوق کے اتحاد کو مسلم تصوّف کا جزولاینفک بنا دیا تھا۔ علامہ اقبالؒ تصوّف کے اس ارتقائی پہلو کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"مسلمانوں اور ہندوؤں کی تاریخ میں ایک عجیب و غریب ذہنی مماثلت ہے۔ جس نقطۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی' اسی نقطۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربیؒ اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی۔ انہوں نے مسئلہ وحدت الوجود کو اسلامی تخیّل کا لاینفک عنصر بنا دیا"۔

(دیباچہ مثنوی اسرارِ خودی' اشاعتِ اوّل 1915ء)

مفکرِ اسلام اور ترجمانِ حقیقت علامہ اقبالؒ تصوّف میں غیر اسلامی عناصر اور فلسفیانہ مسائل کی آمیزش اور ادغام کے مخالف تھے۔ مولانا عبدالمجید سالک نے اپنی کتاب "ذکر اقبال" میں علامہ اقبالؒ کے یہ الفاظ "تصوّف دین نہیں' فلسفہ ہے" تحریر کر کے ہمیں ان کی رائے سے آگاہ کیا ہے۔ برِ صغیر پاک و ہند کے ایک عظیم صوفی اور عالم شاہ سلیمان پھلواری کے نام ایک خط میں اقبالؒ یوں رقم طراز ہیں:۔

"یہ ضروری ہے کہ تصوّفِ اسلامیہ کی ایک تاریخ لکھی جائے جس سے معاملہ صاف ہو جائے اور غیر اسلامی عناصر کی تقطیع ہو جائے۔ سلاسلِ تصوّف کی تاریخی تنقید بھی ضروری ہے"۔

مزید برآں انہوں نے امرتسر سے شائع ہونے والے ایک رسالہ "وکیل" میں 15 ر جنوری 1915ء کو اسرارِ خودی اور تصوّف کے عنوان سے ایک مضمون تصوّف کے بارے میں لکھا تھا جس میں ان کے مندرجہ ذیل الفاظ بھی شامل تھے:۔

"تصوّف کی تحریک غیر اسلامی عناصر سے خالی نہیں اور میں اگر مخالف ہوں تو صرف ایک گروہ کا جس نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر بیعت لے کر دانستہ یا نادانستہ ایسے مسائل کی تعلیم دی ہے جو مذہب اسلام سے تعلق نہیں رکھتے ہیں"۔

"تصوّف" کی ابتداء کے بارے میں محققین نے مختلف آراء پیش کی ہیں لیکن اکثر و بیشتر تبصرہ نگاروں کے خیال میں یہ دوسری صدی ہجری کی پیداوار ہے۔ علاّمہ اقبالؒ بھی اِسی نقطۂ نگاہ کے حامی ہیں وہ کہتے ہیں:۔

"تصوّف کا لفظ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود نہ تھا۔ 150 ہجری میں یہ لفظ پہلے پہل استعمال ہوا اور رفتہ رفتہ تصوّف کے عجمی حامیوں نے ایک ایسا اخلاقی اور معاشرتی نصب العین پیدا کر دیا جو آخر کار مسلمانوں کی بربادی کا باعث ہوا"۔

(اسرارِ خودی مقالات ص۔ 178)

تصوّف کے آغاز، اوّلین دَور کے صوفیاء، صحیح اسلامی تصوّف اور ملوکیّت کے عمل سوز اثرات سے متعلق علاّمہ اقبالؒ کے یہ الفاظ بھی لائق توجہ ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں:۔

"سرچشمۂ اسلام یعنی قرآن و حدیث تصوّف کے لفظ تک سے ناآشنا ہیں۔ یہ لفظ دوسری صدی ہجری میں عربی زبان میں داخل ہوا۔ تاریخِ اسلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں جو لوگ تارک الدنیا اور گوشہ گیر ہو کر عبادت اور ریاضت میں مصروف رہتے تھے ان کو عام لوگ صوفی کے لقب سے پکارنے لگے۔ اس زمانہ میں تصوّف اخلاص کا نام تھا جس کو حدیث شریف میں "احسان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہی وہ تصوّف ہے جس کی مدح غزالیؒ وغیرہ ائمۂ اسلام نے لکھی ہے"۔

(مولانا اسلم جیراج پوری کے نام خط مورخہ 1919ء)

تصوّف کے ارتقاء کے موضوع کو ختم کرنے سے قبل مفکرِ اسلام اور شاعرِ مشرق کی وہ رائے بھی یہاں نقل کرنے کے لائق ہے جس کا تعلق مسلم تصوّف کے مختلف اَدوار میں صوفیوں اور فقیہوں کی باہمی قلمی جنگ سے ہے۔ میں اس سے پیشتر یہ عرض کر چکا ہوں کہ جب بعض صوفیاء نے اہلِ شریعت کو اہلِ ظاہر اور اہلِ رسوم ہونے کا طعنہ دیا تو فقہا اور علماء نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے ان صوفیاء کو بدعتی، مردود اور مخالفینِ اسلام ہونے کا فتویٰ دیا۔ بدقسمتی سے یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ علاّمہ اقبالؒ مسلم تصوّف کے اس پہلو پر یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:۔

"مجدّد الف ثانی اور مولانا اسماعیل شہید رحمتہ اللہ علیہم نے اسلامی سیرت کے احیاء کی کوشش کی مگر صوفیاء نے اس گروہِ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ کئی صدیوں سے علماء اور صوفیاء میں طاقت کے لئے جنگ ہو رہی تھی جس میں آخر کار صوفیاء غالب آئے۔ اب برائے نام علماء جو باقی ہیں جب تک کسی خانوادے سے بیعت نہ ہوں، ہر دلعزیز نہیں ہو سکتے"۔

(اکبر الٰہ آبادی کے نام خط)

تصوّف کے اہم موضوعات اور اقبالؒ

دوسری صدی ہجری میں مسلم تصوّف کا آغاز ہوا تھا۔ اس وقت اس کے موضوعات اور بنیادی نظریات بڑے محدود تھے لیکن بعد ازاں مرورِ ایّام کے ساتھ ساتھ اور دیگر اقوام سے رابطہ رکھنے کی بنا پر اس میں نئے نئے خیالات داخل ہو گئے تھے۔ شروع شروع میں یہ تصوّف زُہد و عبادت، حُزن و خوف اور محبت الٰہی پر مبنی تھا لیکن بعد ازاں اس میں علمِ کلام، فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کے مسائل اور اصطلاحات کا بھی رواج ہوتا گیا اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تصوّف کے موضوعات میں تنوع اور وُسعت پیدا ہوئی۔ علاّمہ اقبالؒ نے چونکہ مشرق و مغرب کے علوم خصوصاً فلسفہ، تصوّف اور الٰہیات کا بغور مطالعہ کیا تھا اس لئے ان کے کلام اور نثر میں بھی تصوّف کے تقریباً تمام اہم موضوعات کا تذکرہ ملتا ہے۔ آیئے ہم یہاں بڑے اختصار کے ساتھ ان موضوعات اور مسائل کا جائزہ لیں جو ہمیں علاّمہ اقبالؒ کی شاعری اور نثر پاروں میں تصوّف سے متعلق ملتے ہیں۔

(۱) عقل و عشق (عقل و الہام)

کائنات، زندگی اور حقیقتِ مطلقہ سے متعلق معلومات اور اَسرار جاننے کے لئے طالبانِ حقیقت فلاسفہ، حکماء اور عرفاء یا تو عقل کا سہارا لیتے ہیں یا عشق و الہام کا۔ قدیم یونانی مفکّرین خصوصاً ارسطو، افلاطون اور سقراط نے زیادہ تر عقل و خرد کی اہمیت پر زور دیا ہے بعد ازاں جب یونانیوں نے مسلمانوں پر اثر ڈالا تو وہ بھی عقل پرست بن گئے۔ اس عقل پرستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہبی اعتقادات میں کمزوری اور قرآنی

تعلیمات سے بے التفاتی کو فروغ ہوا۔ عقل پرست علماء اور فقہا کی اس روش کے خلاف اکثر صوفیاء اور مذہب پرستوں نے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے عشق و وجدان اور کشف کی اہمیت و افادیت پر زور دیا۔ جہاں تک اس بارے میں شاعرِ مشرق علامہ اقبال ؒ کا تعلق ہے وہ دنیاوی امور، مطالعۂ فطرت اور مشاہدۂ کائنات کے لئے عقل و خرد کے استعمال کے زبردست حامی ہیں کیونکہ قرآنِ حکیم میں جابجا تدبّر و تفکّر کا حکم دیا گیا ہے۔ جہاں تک ایمانیات اور عالمِ مادی سے ماوراء حقائق کا تعلق ہے وہ عقل سے زیادہ ایمان بالغیب، وجدان، الہام اور جذبۂ عشق کو اہم اور مفید خیال کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں عقل بھی حقیقتاً اسی کا ذریعہ ہے لیکن اس کی رفتار سُست اور بے یقین ہوتی ہے وہ عقل و خرد کو بھی "نور" قرار دیتے ہیں لیکن وہ اسے منزل کی بجائے محض "چراغِ راہ" سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

ذیل میں علامہ اقبال ؒ کی شعری تصانیف سے عقل و عشق کے بارے میں چیدہ چیدہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں تاکہ قارئین کرام کسی حد تک ان کے مسلک سے آشنا ہو سکیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ علامہ اقبال ؒ ہرگز عقل دشمن نہیں تھے وہ جائز حد تک مابعد الطبیعیاتی حقائق تک پہنچنے کے لئے عقل کی اہمیت و افادیت کے قائل تھے لیکن جب محدود عقل اپنی حد سے آگے بڑھ کر حقیقت شناس ہونے کا دعویٰ کرتی یا سعی کرتی ہے تو اقبال ؒ اس کے عجز اور نارسائی کو بیان کرتے ہیں۔ زندگی، کائنات اور دین کے بعض حقائق اور اعتقادات کو بلاچوں وچرا تسلیم کرنا پڑتا ہے وہاں عقل کی بے یقینی، کم نظری، عیب جوئی اور بے جا تنقید کو گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اب مندرجہ ذیل اشعار ہدیۂ قارئین کئے جاتے ہیں۔

عشق افلاطونِ علّت ہائے عقل ‌ ‌ بہ شود از نشترش سودائے عقل
جُملہ عالَم ساجِد و مسجود عشق ‌ ‌ سومناتِ عقل را محمود عشق

(عشق عقل کی بیماریوں کے لئے افلاطون ہے، عشق کے نشتر سے عقل کی دیوانگی ٹھیک ہو جاتی ہے۔
تمام دنیا عشق کے سامنے سجدہ ریز ہے، عشق عقل کے سومنات کیلئے محمود غزنوی کا درجہ رکھتا ہے)

(اسرار خودی ص۔ 69)

ہر کہ پیماں با ھُوالموجود بست ‌ ‌ گردنش از بندِ ہر معبود رَست
مومن از عشق است و عشق از مومن است ‌ ‌ عشق را ناممکنِ ما ممکن است

عقل دَر پیچاکِ اسباب و علل ‌ ‌ عشق چوگاں بازِ میدانِ عمل
عشق صَید از زورِ بازو افگند ‌ ‌ عقل مکّار است و دامے می زند
عقل را سرمایہ از بیم و شک است ‌ ‌ عشق را عزم و یقیں لاینفک است

(جس کسی نے ھُوالموجود (خدا) کے ساتھ پیمان اطاعت باندھا' اس کی گردن ہر معبود کی قید سے رہائی پا گئی۔
مومن اور عشق آپس میں لازم وملزوم ہیں، عشق کیلئے ہر ایک ناممکن بات ممکن ہو جاتی ہے۔
عقل ہمیشہ اسباب و وسائل کے چکر میں رہتی ہے لیکن عشق عقل کے میدان میں چوگاں بازی کرتا ہے۔
عقل کا سرمایہ خوف اور شک ہے اس کے برعکس عزم اور یقین عشق کا ناقابلِ جُدا حصہ ہیں)۔
(رموزِ بے خودی ص۔ 110۔ 109)

بو علی سیناؒ طب اور مختلف علوم میں کافی مہارت و شہرت کا مالک تھا۔ اس نے بھی عقلی علوم کے ذریعے کائنات کی گوناگوں حقیقتوں تک پہنچنے کی سعی کی تھی۔ مولانا رومؒ بھی علومِ عقلی و نقلی میں یدِطُولیٰ رکھتے تھے۔ انہوں نے حقیقت تک جانے اور اسے پانے کے لئے عقل و خرد کی بجائے عشق اور فلسفہ کی بجائے قرآنی معرفت کا سہارا لیا۔ علاّمہ اقبالؒ کی رائے میں رومیؒ نے تو حقیقت کے مَحمل کو جا لیا مگر بو علی سیناؒ اس عمل کو پانے کی بجائے ناقہ کے غبار میں گم رہا۔ مزید بر آں بو علی سیناؒ تنکے کی مانند عقل و خرد کے بھنور میں پھنسا رہا مگر رومیؒ نے بحرِ حقیقت تک پہنچ کر گوہرِ مقصود کو پا لیا۔ عقل و عشق کے اس فرق کو اقبالؒ ہی کے الفاظ میں سنئے۔

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گُم
دستِ رومی پردۂ مَحمل گرفت
ایں فرو تر رفت و تا گوہر رسید
آں بگردابے چو خس منزل گرفت

(بو علی تو اونٹنی کے غبار میں گم رہا لیکن رومی کے ہاتھ نے محمل کے پردے کو پکڑ لیا۔
رومی نے تہ تک پہنچ کر موتی کو حاصل کر لیا مگر بو علی تنکے کی مانند گرداب ہی میں پھنسا رہا)
(پیامِ مشرق ص۔ 106)

قرآنِ حکیم کی پیش کردہ تعلیمات اور حقائق کی رُو سے کائنات کے مطالعہ و مشاہدہ پر بہت زور دیا گیا ہے۔ عالمِ مظاہر کے بارے میں غور و فکر اور تدبّر و تفکر کو ایمان والوں کی صفت کہا گیا ہے۔ علاوہ ازیں عالمِ غیب سے متعلق حقائق کے بارے میں ایمان بالغیب کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ وہ حقائق ہماری ظاہری آنکھوں اور محدود عقل کی گرفت سے باہر ہیں۔ عقل ہمارے اندر عموماً تنقید، شک پرستی اور بے یقینی کی کیفیت پیدا کر کے ہمارے اعمال اور عزائم کو کمزور بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس ایمان بالغیب ہمارے دل و دماغ میں پختہ یقین، توکّل عَلَی اللہ، عمل پرستی اور بے خوفی کی صفات کو پیدا کرتا ہے۔ علاّمہ اقبالؒ کا یہ نظریہ ہے کہ قرآنی حقیقتوں کو ہر وقت عقل کی کسوٹی پر پرکھنا اور جذبۂ عشق و ایمان سے کام نہ لینا مفید نتائج پیدا نہیں کرتا۔ اس ضمن میں وہ عالمِ اسلام کی ایک نابغہ شخصیت اور قرآن کے شہرۂ آفاق مفسّر امام فخرالدین

رازیؒ کی بلند پایہ کتاب "تفسیرِ کبیر" کے عجیب و غریب عقلی اَسرار و نکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

علاجِ ضعفِ یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

(بالِ جبریل ص۔ 34)

علّامہ اقبالؒ نے جس طرح عقل کی دو قسمیں بیان کی ہیں اسی طرح وہ عشق و جنوں کی بھی دو قسموں کے قائل نظر آتے ہیں۔ وہ عقل اور عشق کے امتزاج کی تو تعریف کرتے ہیں لیکن وہ انہیں ایک دوسرے سے جُدا کرنے کے حامی نہیں۔ ان کی رائے میں عقل بھی حقیقت کی متلاشی ہے مگر اسے حضور کی نعمت نہیں ملتی۔ یہ نعمت صرف عشق کی قسمت ہی میں لکھی ہے۔ ایک عشق تو وہ ہے جو عقل و شعور کا بھی مالک ہے اور دوسرا عشق عقل و شعور سے تہی دامن ہے۔ اس ضمن میں ان کے دو مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

عقل گو آستاں سے دُور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں
اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے
اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں

(بالِ جبریل ص۔ 43)

علّامہ اقبالؒ کی شخصیت گوناگوں صفات کی حامل تھی۔ ان کے کلام میں بھی ہمیں یہی کیفیت نظر آتی ہے ایک طرف تو وہ مشرق و مغرب کے علوم سے آگاہ تھے اور دوسری طرف وہ اسلامی تعلیمات اور قرآنی بصیرت کے بھی ترجمان تھے۔ وہ بلاشبہ ایک بلند پایہ مُفکّر اور فلسفی تھے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ بہت بڑے عاشقِ رسولؐ اور عشق کی روایات کے بھی مبلّغ تھے؟ کبھی فلسفہ ان کے لئے باعثِ کشش ہوتا ہے اور کبھی جذبۂ اسلام ان کا دامن کھینچتا ہے کبھی وہ عقل و خرد کے مدح سَرا ہوتے ہیں اور کبھی وہ بے اختیار ہو کر عشق و محبت کے راگ الاپنے شروع کر دیتے ہیں۔ عقل و عشق کی یہ چپقلش ہمیں ان کے کلام میں بھی نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ ان کی زندگی کی راتیں کبھی تو سوز و سازِ رومیؒ میں گذر جاتی ہیں اور کبھی پیچ و تابِ رازیؒ میں، کبھی تو وہ اس کشمکش سے مغلوب ہو جاتے ہیں اور کبھی وہ اس سے دامن چھڑا کر عشق کی برتری کا بے خوف اعلان کر دیتے ہیں۔ وہ رومیؒ کی پیروی میں عقل پرستی کو چھوڑ کر عشق کے دامن میں پناہ لے لیتے ہیں۔ اس دلچسپ موضوع سے متعلق مندرجہ ذیل اشعار کی ایک جھلک بھی دیکھیے۔

بگذر از عقل و در آویز بہ موجِ یمِ عشق
کہ در آں جوئے تنک مایہ گہر پیدا نیست

(عقل کو چھوڑ کر عشق کے سمندر کی موج سے مل جا کیونکہ اس چھوٹی سی ندّی میں موتی موجود نہیں ہوتے)

(پیامِ مشرق ص۔ 170)

اس امر سے ہم بخوبی واقف ہیں کہ فلسفہ کا دارومدار عقل پر ہوتا ہے اور عشق کا دل پر انحصار ہے۔ عقل کی فراہم کردہ معلومات کا زیادہ تر تعلق عالمِ مادی اور مظاہرِ فطرت سے ہے اس کے برعکس دل کی کیفیات اور واردات کا زیادہ تر علاقہ غیر مادی حقائق اور عالمِ باطن سے ہوتا ہے۔ علاّمہ اقبالؒ نے اپنی ایک نظم ''عقل و دل'' میں عقل اور دل کے درمیان دلچسپ گفتگو کا حال یوں بیان کیا ہے۔

عقل نے ایک دن یہ دِل سے کہا بھُولے بھٹکے کی رہنما ہُوں میں
دِل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہُوں میں
رازِ ہستی کو تُو سمجھتی ہے اور آنکھوں سے دیکھتا ہُوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے اور باطن سے آشنا ہُوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش ربِّ جلیل کا ہوں میں

(بانگِ درا' ص۔ 42۔ 41)

جو لوگ خدا اور اس کے رسول برحق کی محبّت کا دم بھرتے ہیں ان کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ الہامی حقائق اور ایمانی امور کو بلاچُون وچرا قبول کرتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہو جائیں۔ خدا کے سچّے عاشقوں اور رسول کریمؐ کے صحابہ کرامؓ اور جان نثاروں کا یہی وطیرہ رہا ہے جو لوگ محبت و جان نثاری میں پختہ نہیں ہوتے وہ خدائی ہدایت پر فوراً عمل کرنے کی بجائے عقلی تاویلوں اور تنقید و شک سے کام لیتے ہیں۔ علاّمہ اقبالؒ کہتے ہیں۔

عاشقاں خود را بہ یزداں می دہند عقلِ تاویلی بہ قرباں می دہند
برمکاں و برزماں اسوار شو فارغ از پیچاکِ ایں زنّار شو

(خدا کے عاشق اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں' وہ تاویل، تنقید کرنے والی اپنی عقل کو عشقِ الٰہی پر قربان کر دیتے ہیں۔ تو عشقِ خدا کی بدولت زمان و مکان پر سوار ہو جا اور عقل کے زنّار کے چکر سے فارغ ہو جا)

(جاوید نامہ' ص۔ 24)

علامہ اقبالؒ کے نظریۂ عقل کے بارے میں بعض حضرات اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ علامہ اقبالؒ عقل کے زبردست مخالف بلکہ اس کے سخت دشمن ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی نامعقولیت، جہالت، اندھا دھند تقلید اور رسم پرستی کے مخالف ہیں۔ وہ تو جائز حد تک عقل کے استعمال پر زور دیتے ہیں وہ غور و فکر کے بھی قائل ہیں اور ذکر کے بھی۔ ان کی رائے میں عقل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عقل تو ہمیشہ دلیل و برہان سے کام لیتی ہے اور دوسری عقل وجدان اور الہام کے نور سے فیض یاب ہو کر ان کی پیروی اختیار کرتی ہے۔ علامہ اقبالؒ دانشِ برہانی پر دانشِ نورانی کو ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

اک دانشِ نورانی، اک دانشِ برہانی
ہے دانشِ برہانی، حیرت کی فراوانی

(بالِ جبریل)

گریز آخرز عقلِ ذو فنوں کرد دلِ خود کام را از عشق خوں کرد
ز اقبالِ فلک پیما چہ پرس حکیم نکتہ دانِ ما جنوں کرد

(آخر کار اس نے فنون کی حامل عقل سے پیچھا چھڑایا اور اپنے خود کام دل کو عشق سے پُرخوں بنا دیا۔ تو فلک پیما اقبالؒ کے بارے میں کیا پوچھتا ہے؟ ہمارے اس نکتہ داں فلسفی نے عشق اختیار کر لیا ہے)

(پیامِ مشرق، ص۔ 79)

پا گئی آسودگی کوئے محبّت میں وہ خاک
مدّتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی

(بانگِ درا، ص۔ 139)

عقل دادی ہم جنونے دہ مرا رہ بجذبِ اندرونے دہ مرا
زیرِ گردوں خویش را یابم غریب ز آنسوئے گردوں بگو اِنّی قریب
آنچنان من، جاودانی کُن مرا از زمینی آسمانی کُن مرا

(اے خدا! تو نے مجھے عقل دی ہے تو مجھے عشق بھی عطا کر، تو مجھے جذبِ باطنی کی طرف بھی راہ دے۔ میں آسمان کے نیچے اپنے آپ کو اجنبی پاتا ہوں، تو مجھے آسمان سے ماورا دنیا سے "اِنّی قریب" کہہ۔ میں فانی ہوں تو مجھے اپنے عشق کی بدولت جاوداں بنا دے، اس طرح تو مجھے زمینی سے آسمانی کر دے)

(جاوید نامہ، ص۔ 10-9)

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی ۔

(بالِ جبریل، ص۔ 17)

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل؟
حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں ۔

(بالِ جبریل، ص۔ 47)

(۲) جسم و روح (جان و بدن)

تصوّف و معرفت کا ایک اور اہم موضوع جسم و روح سے متعلق ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ تصوّف یعنی تزکیۂ نفس کا سارا دارومدار دل اور روح کی پاکیزگی پر ہے تاکہ ان میں انوارِ ایزدی کا پرتو پیدا ہو سکے اور انسان قربِ الٰہی اور صفاتِ خداوندی کی تحصیل کی نعمت سے مالا مال ہو جائے۔ ہندو تصوّف اور عیسائی تصوّف میں جسمانی تقاضوں کو کافی حد تک نظر انداز کرنے کی تلقین ملتی ہے لیکن صحیح اسلامی تصوّف میں روحانی تقاضوں کے ساتھ ساتھ جسمانی تقاضوں کی تکمیل پر بھی زور دیا گیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشادِ خداوندی ہے ______ ترجمہ "(قیامت کے دن نعمتوں کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا)" خالقِ کائنات اور خدائے رحیم و کریم نے انسان کو ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ ان نعمتوں میں جسمانی، ذہنی اور روحانی نعمتیں بھی شامل ہیں۔ اسلام کی رو سے جسم و روح ایک ہی حقیقت کے دو مختلف نام ہیں۔ اسلام جسم اور نفس کی طاقتوں کو برباد اور ضائع کرنے کے خلاف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے جسم پر روح کو فوقیت دی ہے لیکن وہ جسم کی افادیت و اہمیت کا بھی قائل ہے۔ قرآنی تعلیمات اور سنتِ نبوی ؐ سے روشناس صوفیاء اور عرفاء نے ہمیشہ روح کی پاکیزگی اور ترقی کے ساتھ ساتھ جسم کی طہارت پر بھی نظر رکھی ہے۔ علامہ اقبالؒ بھی جسم اور روح دونوں کی تطہیر اور ترقی پر زور دیتے ہیں۔

جب تصوّف میں فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کے مسائل شامل ہو گئے تو پھر روح کی حقیقت اور نوعیت جاننے کے بارے میں فلسفیانہ موشگافیوں سے بھی کام لیا گیا ہے۔ فلاسفہ، مفکّرین اور متکلّمین کی طرح صوفیاء نے بھی فلسفیانہ اصطلاحات کا سہارا لے کر روح کی ماہیت کے بارے میں اپنے اپنے افکار کا اظہار

کیا ہے۔ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے انسانی روح کی ابتدا اور ماہیت کو یا تو مادہ یا خدا کے حوالے سے معلوم کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ فلاسفہ اور حکماء کا ایک گروہ انسانی روح کے آغاز کو مادہ کی کرشمہ سازی قرار دیتا ہے وہ موت کے بعد روح کی زندگی کا قائل نہیں اس کے برعکس ایک گروہ اسے خدا کی حکمتِ کاملہ کی کارفرمائی سمجھتا ہے۔ نبی اکرمؐ کے عہدِ ہمایوں میں بھی انسانی روح کے بارے میں سوال اٹھایا گیا تھا چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ایزدی ہے...... "یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی" (اے محبوبؐ! لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے) ہادیٔ برحقؐ اور صدرِ بزمِ انبیاءؐ نے روح کے بارے میں زیادہ کرید، جستجو اور بیکار خیال آرائیوں سے منع کیا تھا۔ تصوّف چونکہ دیگر اقوام کے فلسفیانہ نظریات سے بھی متاثر ہو چکا تھا اس لئے اس میں بھی انسانی روح سے متعلق ہمیں علمی بحثیں ملتی ہیں۔ جسم و روح یا جان و بدن کے باہمی تعلق اور ردِّ عمل نے بھی بے شمار فلسفیانہ نظریات کو جنم دیا ہے۔ مندرجہ ذیل نظریات زیادہ مشہور ہیں:۔

(1) فلاسفہ اور حکماء کا ایک گروہ روح کو مادہ کی ترقی یافتہ شکل تصوّر کرتا ہے۔

(2) دوسرا گروہ اس خیال کا حامی ہے کہ مادہ روح کی ظاہری شکل کا نام ہے۔

(3) تیسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ روح اور مادہ ایک دوسرے سے الگ اور آزاد ہیں۔

(4) چوتھا گروہ یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ روح اور مادہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کو چونکہ اسلامی تعلیمات اور تصوّف و معرفت کے موضوع سے گہری دلچسپی تھی اس لئے انہوں نے بھی اپنے مخصوص انداز میں اس اہم موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کے اندازِ فکر کے یہ پہلو ملاحظہ ہوں۔ وہ فرماتے ہیں۔

خطر تاب و تواں را امتحان است
عیارِ ممکناتِ جسم و جان است

(خطر پسندی تاب و تواں کے لئے امتحان ہے، خطرات کو مول لینا دراصل جسم اور روح کی مخفی صلاحیتوں کی کسوٹی ہے)

(پیامِ مشرق، ص۔ 123)

میں اس سے قبل بیان کر چکا ہوں کہ علامہ اقبالؒ جسم اور روح کی دوئی کے قائل نہیں اس لئے وہ جسم کو روح کی حالتوں میں سے ایک ضروری اور مفید حالت تصوّر کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں اسی تصوّر کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

اے کہ گوئی محملِ جان است تن سرِّ جاں را در نگر، بر تن متن
محملے نے، حالے ز احوالِ اوست محملش خواندن، فریبِ گفتگو ست
چیست جاں؟ جذب و سرور و سوز و درد ذوقِ تسخیرِ سپہرِ گرد گرد

چیست تن' با رنگ و بُو خُو کردن است	بامقامِ چار سُو خُو کردن است
این بدن باجانِ ما انباز نیست	مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست

(اے کہ تو جسم کو روح کا محمل کہتا ہے' تو ذرا روح کے راز کو سمجھ اور جسم پر ناز مت کر
جسم روح کا محمل نہیں بلکہ اس کے احوال میں سے ایک کیفیت ہے۔ جسم کو روح کا محمل قرار دینا فریبِ گفتگو ہے۔

روح کیا ہے؟ یہ جذب' سرور اور سوز و درد کا دوسرا نام ہے' یہ تو متحرک آسمان کو مسخر کرنے کا ذوق ہے
جسم کیا ہے؟ یہ رنگ و بو کا عادی ہوتا ہے' جسم مادی کائنات کا خوگر ہوتا ہے
یہ جسم ہماری روح کے ساتھ شریک نہیں ہے اس لئے یہ مٹھی بھر خاک (جسم) ہماری پرواز میں رکاوٹ نہیں۔

(جاوید نامہ' ص۔ 24)

علاّمہ اقبالؒ جسم اور روح کی حفاظت کو کائنات کی حکومت کا ایک مؤثر ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں روح کی حفاظت اور ترقی کے لئے بے اندازہ ذکرِ الٰہی اور غور و فکر کی اہمیّت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اسی طرح وہ جسم کی حفاظت و ترقی کے لئے جوانی میں ضبطِ نفس کو لازم گردانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ۔

حفظِ جاں ہا' ذکرِ و فکرِ بے حساب	حفظِ تن ہا' ضبطِ نفس اندر شباب
حاکمی در عالَمِ بالا و پست	جُز بہ حفظِ جان و تن ناید بدست

(جانوں کی حفاظت بے حساب ذکر و فکر ہے' جسموں کی حفاظت جوانی میں ضبطِ نفس ہے
عالِمِ بالا اور عالمِ پست کی حاکمی جسم اور جان کی حفاظت کے بغیر ہاتھ نہیں آتی)

(جاوید نامہ' ص۔ 203)

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ موجودہ تہذیب مادہ پرستی' دہریّت اور ہوس کاری کا شکار ہو کر زندگی کی اعلیٰ اقدار اور انسانی کمالات سے محروم ہوتی جارہی ہے۔ دولت کے لالچ نے انسانوں کو اندھا کر دیا ہے اس لئے وہ اسے حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی اخلاقی اور انسانی قیود سے آزاد ہو کر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں۔ حیرت انگیز مادی ترقیوں کے باوجود موجودہ زمانے کے بیشتر انسان روحانی سکون اور ذہنی مسرت سے عاری ہوتے جارہے ہیں۔ ہر بات کو زر کی ترازو میں تولا جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر کوئی زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی خاطر مذہب' اخلاق' تہذیب' شرافت' ضمیر اور اپنائیت کے احساس سے بیگانہ ہو کر دوسروں کے جائز حقوق بھی غصب کرتا چلا جارہا ہے۔ سرمایہ دار مزدور کا' زمیندار مزارع کا اور صنعت کار غریب صناع کا خون چوس کر مزید دولت مند بنتا جارہا ہے۔ یہی حال دنیا کی

طاقتور قوموں کا ہے۔ وہ ترقی، مالی امداد اور تہذیب کے نام پر کمزور، غریب، محکوم اور پسماندہ اقوام کا استحصال کر رہی ہیں۔ یہ لوٹ کھسوٹ ہر ملک اور ہر سوسائٹی کا وطیرہ بن گیا ہے۔ اس تمام زبوں حالی اور پریشان نظری کا سب سے بڑا سبب مادہ پرستی اور خدا کی محبت سے لاپروائی ہے۔ علامہ اقبالؒ اس مادہ پرستی کے دَور میں روحانی اور انسانی اقدار کے فروغ کے حامی ہیں، وہ کہتے ہیں۔

عصرِ تُو از رمزِ جاں آگاہ نیست دینِ اُو جُز حُبِّ غیر اللہ نیست
فلسفی ایں رمز کم فہمیدہ است فکرِ اُو بر آب و گل پیچیدہ است
دیدہ از قندیلِ دل روشن نکرد پس ندید اِلاّ کبود و سرخ و زرد

اے خوش آں مَردے کہ دل با کَس نداد
بندِ غیر اللہ را از پا کشاد

(تیرا زمانہ روح کے اَسرار سے واقف نہیں ہے۔ اس کا مذہب غیر اللہ کی محبت کے سوا کچھ بھی نہیں۔
فلسفی نے اس راز کو کم سمجھا ہے۔ اس کی فکر پانی اور مٹی (مادہ) کے ساتھ لپٹی ہوئی ہے۔
مادہ پرست فلسفی نے اپنی آنکھ کو دل کی قندیل سے روشن نہیں کیا اس لئے اسے نیلی سرخ اور زرد چیزوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔
وہ انسان بڑا خوش نصیب ہے جس نے اپنا دل کسی کو نہیں دیا اور جس نے اپنا پاؤں غیر اللہ کی بیڑی سے چھڑا لیا ہے۔)

(پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، ص۔ 8)

علامہ اقبالؒ نے دورِ حاضر کی مادہ پرستی، بے دینی اور غیر اخلاقی قدروں کے خلاف جو جہاد کیا ہے اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے روحانی مُرشد مولانا رومؒ نے بھی اپنے زمانے کی غیر اسلامی تعلیمات اور الحاد آمیز مسائل کے خلاف زبردست قلمی جہاد کیا تھا۔ روحانی اقدار کے فروغ اور اسلامی تعلیمات کے غلبہ کے لئے علامہ اقبالؒ نے جو سعی کی ہے وہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

چُوں رُومی در حَرَم دادم اذاں من ازو آموختم اسرارِ جاں، من
بَدورِ فتنۂ عصرِ کہن اُو بَدورِ فتنۂ عصرِ رواں، من

(رومی کی طرح میں نے بھی حرم میں اذان دی ہے۔ میں نے اس سے روح کے اَسرار سیکھے ہیں۔
اس نے پرانے زمانے کے فتنوں اور میں نے موجودہ دَور کے فتنوں میں یہ فریضہ سرانجام دیا ہے۔)

(۳) تخلیقِ کائنات

کائنات کی تخلیق بھی تصوف کے اہم موضوعات میں سے ہے۔ کائنات کی تخلیق نہ صرف

سائنس دانوں، فلاسفہ اور مفکرّین کی دلچسپی اور تحقیق کا باعث ہے بلکہ صوفیائے کرام اور مذہبی علماء نے بھی اپنی ذہنی استعداد اور علمی مدارج کے مطابق اس پر اپنے اپنے خیالات بیان کیے ہیں۔ اکثر سائنس دان اور مفکرّین مادہ کو اس کائنات کی تخلیق کا اصل سبب قرار دیتے ہیں۔ بعض مفکرّین اور بیشتر صوفیاء اور مذہبی علماء کی رائے میں یہ کائنات اپنی اصل کے اعتبار سے روحانی ہے۔ غیر مسلم صوفیاء کی طرح مسلم صوفیاء نے بھی اپنی مذہبی معلومات اور باطنی واردات کی روشنی میں زندگی اور کائنات کی پیدائش کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ مسلمان صوفیاء اور عرفاء کی اکثریت اس بات کی حامی ہے کہ جذبۂ نمود نے حسنِ مطلق کو بے نقاب کر کے زندگی اور کائنات کو جنم دیا ہے۔ اظہارِ حُسن کی اس شدید خواہش کو حرکتِ حُبّی، کا بھی نام دیا جاتا ہے۔ اس نظریئے کے حامی مندرجہ ذیل حدیثِ قدسی کو اپنے خیال کی تائید میں پیش کیا کرتے ہیں۔ حدیثِ قدسی کے الفاظ یہ ہیں:۔

"کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَحبَبْتُ اَنْ اُعرِفَ فَخَلَقتُ الْخَلْق"

(میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا پس میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔ اس لئے میں نے مخلوقات کو پیدا کیا)

محبّتِ الٰہی کا یہ شدید جذبۂ نمود کائناتِ دوجہاں کی تخلیق کا باعث بنا۔ گویا کہ یہ محبّت آمیز حرکت آفرینشِ عالم کی بنیاد بنی چونکہ خدا تعالیٰ حُسنِ کامل ہے اس لئے وہ پردوں میں پوشیدہ رہتا ہے۔ خود نمائی کی خواہش ہی اس عالمگیر حُسن کی بے حجابی کی اساس ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں۔

حُسنِ کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب
وہ جو تھا پردوں میں پنہاں خود نما کیونکر ہوا؟

(بانگِ درا، ص۔ 19)

اسی خیال کو مفکّرِ اسلام اور شاعرِ فطرت علاّمہ اقبالؒ ایک اور جگہ یوں بیان کرتے ہیں۔

بہ ضمیرت آرمیدم، تُو بجوشِ خود نمائی
بکنارہ برفگندی دُرِ آبدارِ خود را

(اے خدا! میں تیرے ضمیر میں آرام کر رہا تھا لیکن تو نے خُود نمائی کے جوش میں اپنے آبدار موتی کو کنارے پر پھینک دیا)

(زبورِ عجم، ص۔ 8)

بعض حضرات کی رائے میں حُسنِ ایزدی کے لئے یہ مادی کائنات حجاب کا درجہ رکھتی ہے اس لئے انسان اس حُسن کو دیکھنے سے مجبور ہے۔ علاّمہ اقبالؒ کے خیال میں کاملین اور خدا کے برگزیدہ انسانوں

کے لئے یہ جلوۂ مستور نمایاں ہوتا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

ذاتِ حق را نیست ایں عالَم حجاب
غوطہ را حائل نہ گردد نقشِ آب

(یہ دنیا ذاتِ حق کے لئے پردہ نہیں ہے کیونکہ ماہر غوطہ لگانے والے کے لئے پانی کی سطح حائل نہیں ہوتی)
(جاوید نامہ، ص۔ 9)

وہ جاوید نامہ (ص۔ 51) میں دوبارہ فرماتے ہیں۔

گرچہ اندر خلوت و جلوت خداست
خلوت آغاز است و جلوت انتہاست

(گرچہ خلوت اور جلوت میں خدا ہے لیکن اس کا آغاز خلوت ہے اور اس کی انتہا جلوت ہے)

کائنات کی پیدائش کے سلسلے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ بعض حکماء اور صوفیاء کے خیال میں خدا تعالیٰ نے کائنات کو ایک خاص پروگرام اور نظم کے ساتھ پیدا کیا ہے اور بعدازاں کائنات کے تمام واقعات اور حادثات اس مقررہ پروگرام کے مطابق ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کو اس نظریئے سے سخت اختلاف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ کائنات پہلے سے تکمیل شدہ چیز نہیں ہے کیونکہ ابھی تک خدا کی خلّاقی صفت نئی نئی چیزوں کو معرضِ وجود میں لا رہی ہے۔ خدا تعالیٰ حیّ و قیوم ہے اس کی صفات بھی دوامی ہیں۔ قرآن حکیم میں خدا تعالیٰ کی مسلسل صفتِ تخلیق کو یوں بیان کیا گیا ہے "کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ" (وہ (خدا) ہر روز نئی جلوہ گری میں مصروف رہتا ہے) بقول غالب۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

علامہ اقبالؒ کی رائے میں یہ کائنات ابھی تک مراحلِ ارتقاء سے گذر رہی ہے اس لئے یہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچی۔ وہ اپنے اس نظریئے کو ان خیال افروز الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کُن فَیَکُوْن

(بالِ جبریل، ص۔ 21)

(۴) جبر و قدر

جبر و قدر کا نظریہ نہ صرف فلسفہ و حکمت کا ایک دشوار اور لاینحل مسئلہ ہے بلکہ مذہب و اخلاق کے لحاظ

سے بھی وہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمان ایمان ویقین کی دولت سے مالا مال تھے اس لئے وہ قرآنی تعلیمات کو بدل وجان قبول کرتے ہوئے ان پر فوراً عمل پیرا ہونے لگتے تھے۔ آہستہ آہستہ معاشرتی، تہذیبی اور فکری تبدیلیوں کے زیرِ اثر ان کا یقین بے یقینی اور ان کا پختہ ایمان فلسفیانہ تشکیک پرستی میں تبدیل ہوتا گیا اب وہ قرآنی تعلیمات اور اسلامی مسلّمات پر فوراً عمل کرنے کی بجائے سُستی، لاپروائی اور کمزوری کا شکار ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قرآن کے احکام کی من مانی تاویلیں کر کے امتِ مسلمہ کی پریشان نظری اور زوال کا باعث بن گئے۔ علاّمہ اقبالؒ ایسے ہی فقہاء اور علماء کی تاویل پرستی کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

قرآنِ حکیم کی رو سے انسان کو روئے زمین پر نیابت کا منصب عطا کیا گیا ہے تاکہ وہ احکامِ خداوندی کو نہ صرف خود بجالائے بلکہ دوسروں کو بھی ان کی اطاعت پر مائل کرے۔ ظاہر ہے کہ کٹھ پتلی نائب حق یہ فریضہ بطریق احسن ادا نہیں کر سکتا۔ انسان کو خدا تعالیٰ نے علم، حکمت، قوتِ فکر، قوتِ عمل اور خیر وشر میں انتخاب کی کسی قدر صلاحیت دی ہے انسان کے مقابلے میں کائنات کی دیگر مخلوقات کو یہ خوبیاں نہیں دی گئیں اس لئے وہ نیابتِ الٰہی کی حامل نہیں ہو سکتی تھیں۔ علاوہ ازیں اگر انسان کو مکمل طور پر مجبور تسلیم کر لیا جائے تو پھر آسمانی کتابیں اور انبیاء کے بھیجنے کی غرض وغایت بیکار ہو جاتی ہے۔ اگر انسان بالکل مجبور ہے تو پھر قیامت کے روز جزاو سزا کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ قرآنِ حکیم میں جہاں اس طرح کی آیات ہیں وہاں سعی وعمل کو اُبھارنے والی آیات بھی ملتی ہیں۔ قرآن میں ارشادِ خداوندی ہے......اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر (بے شک اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز پر قادر ہے) خدا نے اپنی قدرتِ کاملہ میں سے انسان کو دست وپا ہلانے کی طاقت ودیعت کی ہے وہ جب چاہے یہ طاقت واپس لے سکتا ہے۔ قرآن میں جا بجا ایمان اور عملِ صالح پر زور دیا گیا ہے۔ اگر انسان میں عمل کرنے کی طاقت نہ ہوتی تو پھر خدا تعالیٰ اسے عملِ صالح کا حکم کیوں دیتے؟۔ کیا قرآنِ حکیم میں یہ آیت موجود نہیں۔۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (انسان کے لئے اس کی کوشش کا ثمرہ ہے) اس طرح کی ایک اور آیت بھی ہے.....اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْعٰمِلِیْنَ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ عمل کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا) یہ لازمی نہیں کہ عمل کرنے والے مسلمان ہی ہوں۔ قدرت کے بنائے ہوئے قوانین کے نتائج سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو ان پر عمل پیرا ہوں۔ خدا تعالیٰ کو تو اپنے آئین کی پابندی کرنے والے ہی پسند ہوں گے جب مسلمان فلسفیانہ موشگافیوں اور تنقیدی عادات کا شکار ہو گئے تو وہ لامحالہ انسان کو یا تو مکمل طور پر مجبور یا کلیتاً خود مختار ثابت کرنے کے درپے ہو گئے اور عمل کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی وقت ہی نہ رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان نہ تو مکمل طور پر مجبورِ محض ہے اور نہ ہی وہ پوری طرح خود مختار ہے بلکہ وہ جبر واختیار کا مجموعہ ہے۔ بعض چیزوں

میں اسے اختیار دیا گیا ہے اور بعض چیزوں میں وہ مجبور ہے۔ رسول کریمؐ کا ارشاد ہے۔۔۔ "خیر الامور اوسطھا" (میانہ روی بہترین کام ہے) دینِ فطرت ہونے کی حیثیت سے اسلام اعتدال پسندی اور میانہ روی کا نظامِ حیات ہے اس سلسلے میں علاّمہ اقبالؒ کے نظریات کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔ وہ کہتے ہیں ؎

در اطاعت کوش اے غفلت شعار! می شود از جبر پیدا اختیار
سبزہ بر دینِ نمو روئیدہ است پائمال از ترکِ آں گردیدہ است

(اے لاپرواہ انسان! تو اطاعت اختیار کرنے کی کوشش کر کیونکہ اطاعت پذیری (جبر) سے اختیار پیدا ہوتا ہے۔
نشوونما کے اصول پر چل کر سبزہ اُگا ہوا ہے اور اسے ترک کر کے وہ پاؤں تلے روندا جاتا ہے)
(اسرارِ خودی ، ص۔ 40)

عشق و اطاعت اسلامی تعلیمات کے اساسی اصولوں میں سے ہیں۔ بلاشک وشبہ خدا اور اس کے رسولِ مقبولؐ کی اطاعت ہی دراصل حبِّ الٰہی اور عشقِ رسولؐ کا صحیح معیار ہے۔ اگر کوئی مسلمان محض زبانی عشق و محبّت کا اظہار کرے اور خالقِ کائنات اور پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ کی اطاعت بدل و جان نہ کرے تو اس کا دعوئ محبّت مشکوک اور بے بنیاد ہے۔ قرآن حکیم میں سچے مسلمانوں کا مقصدِ حیات یوں بیان کیا گیا ہے:۔ "اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" (بے شک میری صلوٰۃ، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب اس اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے) جب خدا کا سچا عاشق ہر بات میں اور ہر وقت خدا، رسول کریمؐ اور قرآن و سنت کی صحیح انداز میں اطاعت اختیار کرتا ہے تو پھر خدا کو بھی اس کے جذبۂ تسلیم و رضا کو دیکھ کر اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ اس وقت خدا تعالیٰ محب بن جاتا ہے اور وہ بندہ خدا کا محبوب ہو جاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے محبوب بندے کی خواہش اور دُعا کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں خدا اپنے فرمانبردار اور سچے بندے کی رضا معلوم کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اسے قبول کر سکے۔ علاّمہ اقبالؒ نے اسی لئے تو یہ درست کہا تھا ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

مسلمان کی مکمل اور صحیح اطاعت کی بنا پر خدا کی مرضی اس انسانِ کامل اور بندۂ مومن کی رضا میں گم ہو جاتی ہے۔ درحقیقت اس بندۂ خدا کی کوئی خواہش اور مرضی خدا کی مرضی اور حکم کے خلاف ہوتی ہی نہیں کیونکہ وہ اپنی تمام خواہشات کو خدا کی محبت میں گم کر دیتا ہے۔ ترجمانِ قرآن اور مفکرِ اسلام علاّمہ اقبالؒ مزید

کہتے ہیں:۔

طبعِ مسلم از محبت قاہر است مسلم ار عاشق نباشد' کافراست
تابعِ حق دیدنش نادیدنش خوردنش' نوشیدنش' خوابیدنش
در رضایش' مرضیٔ حق گم شود ایں سخن کے باورِ مردم شود؟

(مسلمان کی طبیعت محبت سے قاہر ہوتی ہے' مسلمان اگر عاشق اسلام نہ ہو تو وہ کافر ہے۔
صحیح مسلمان کا دیکھنا' کھانا' پینا اور سونا وغیرہ خداتعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔
اس کی مرضی میں خدا کی مرضی گم ہو جاتی ہے' عام لوگ اس بات پر کیسے یقین کرتے ہیں؟)

تقدیر کا مسئلہ کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے۔ اس کو غلط طور پر سمجھنے سے انفرادی اور انسانی زندگی کا نظام خراب ہو جاتا ہے۔ جو لوگ انسان کو مجبورِ محض قرار دیتے ہیں وہ انتہا پرستی کا شکار ہیں اس طرح جو حضرات انسان کو ہر چیز میں خود مختار خیال کرتے ہیں وہ بھی انتہا پرست ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا تھا: "اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَ الرَّجَاء" (ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے) جبر پرست انسان اپنے آپ کو ہر بات میں مجبور سمجھ کر خوف اور مایوسی کا شکار رہتا ہے اس کے برعکس اختیار پرست انسان اپنے آپ کو ہر اَمر میں آزاد اور خود مختار خیال کرکے پُرامید ہوتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ انسان کو ایک ٹانگ پر کھڑے ہونے کا تو کسی قدر اختیار دیا گیا ہے لیکن وہ دونوں ٹانگوں پر ہوا میں کھڑا نہیں ہو سکتا؟۔ کیا یہ ہمارا مشاہدہ نہیں کہ جب ہم کتے پر پتھر پھینکتے ہیں تو وہ پتھر کو کاٹنے کی بجائے ہمیں کاٹنے کیلئے ہماری طرف ہی دوڑتا ہے؟۔ ایک معمولی جانور کو بھی یہ بات معلوم ہے کہ پتھر تو مجبورِ محض ہے اس لئے اس کا کوئی قصور نہیں اصل قصوروار تو وہ انسان ہی کو سمجھتا ہے کیونکہ اسے پتھر پھینکنے کا خدا نے اختیار دے رکھا ہے۔ علامہ اقبالؒ جمادات و نباتات کو مجبور اور مومن کو خدا کے احکام کی اطاعت کا پابند سمجھتے ہیں بندۂ مومن کی یہ خصوصیت دیکھئے۔

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

تقدیر کا لفظی مطلب ہے اندازہ یا پیمانہ۔ خالقِ کائنات نے دنیا کے تمام امور اور اعمال کے اندازے اور پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ کائنات کا صحیح طور پر انتظام چلانے کیلئے اس نے کچھ اصول اور قواعد تیار کئے ہوئے ہیں۔ اسے اپنے آئین و قانون کی پابندی بے حد پسند ہے زہر کھانے سے ہلاکت کا قانون اور قندِ نبات کھانے سے حلاوت کا آئین حرکت میں آجاتا ہے۔ زہر خواہ غیر مسلم کھائے یا مسلمان دونوں صورت میں خدا کا بنایا ہوا قانون اپنے نتائج پیدا کرکے رہے گا۔ یہ نتائج خاص کام کرنے سے حاصل ہوتے ہیں اس طرح اس نے اور بھی اصول اور قوانین بنائے ہیں جنہیں فطرتی قوانین کہا جاتا ہے اگر ایک

عمل سے مخصوص نتیجہ بر آمد نہ ہو تو پھر عمل و حرکت کو ترک کرنے کی بجائے مزید سعی کی ضرورت لازمی ہوگی۔ اس طرح معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ نے چیزوں اور اعمال کے خاص پیمانے مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق مخصوص نتائج پیدا ہوتے ہیں کیا یہ امر مسلّمہ نہیں ہے کہ ہمارے تمام اعمال ہمارے خیالات کے آئینہ دار ہوتے ہیں ؟۔ جیسا ہمارا خیال یا نظریہ ہو گا ویسے ہی ہم عمل کریں گے اگر ہم قنوطیّت اور بد دلی کے عادی ہوں گے تو لازماً ہم زندگی کے بارے میں قنوطیّت پرست اور بد دل ہوں گے اسی طرح اگر ہم صالح اور مثبت اقدار میں یقین رکھتے ہوں گے تو ہم لامحالہ نیک اعمال کی طرف راغب ہوں گے علاّمہ اقبالؒ کے مندرجہ ذیل اشعار اسی حقیقت کے عکاس ہیں وہ کہتے ہیں ؎

گر زیک تقدیر خوں گردد جگر　خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر
تو اگر تقدیرِ نَو خواہی، رواست　زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاست
خاک شو، نذرِ ہوا سازد ترا　سنگ شو، بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی؟ افتندگی تقدیرِ تست　قلزمی؟ پایندگی تقدیرِ تست

نوعِ دیگر بیں، جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسمان، دیگر شود

(اگر ایک تقدیر سے تیرا جگر خون ہو جائے تو پھر تو خدا سے دوسری تقدیر کا حکم مانگ۔
تو اگر نئی تقدیر مانگے تو یہ درست ہو گا کیونکہ خدا کی تقدیریں لا انتہا ہیں۔
اگر تو خاک ہو جائے تو تقدیر تجھے ہوا کی نذر کر دے گی۔ اگر تو پتھر بن جائے تو وہ تجھے شیشے پر پھینک دے گا۔
کیا تو شبنم ہے ؟ اگر ایسا ہے تو عاجزی تیری تقدیر ہوگی۔ کیا تو سمندر ہے ؟۔ اگر ایسا ہے تو طاقت تیری تقدیر ہو گی۔
تو اپنا انداز فکر بدل لے تو دنیا بھی بدل جائے گی۔ تیری سوچ کے مطابق یہ زمین و آسمان بھی کچھ اور ہو جاتے ہیں)۔

(جاوید نامہ، ص۔ 109۔ 107)

تسلیم و رضا کے حامل ہی بلند ہمّت اور باکمال کہلا سکتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے مقررہ قوانین اور اصولوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اور رضا و رغبت کے ساتھ ان پر عمل کرنے کے نتائج عموماً حیات بخش، مفید اور انسانیت ساز ثابت ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ خدا کے متعیّن اور ابدی اصولوں کو اختیار کرنے کیلئے اپنے اوپر ضبطِ نفس اور قانون کی پابندی عائد کر لیتے ہیں اس لئے ان کا یہ جبر بعد ازاں قوت و غلبہ کا سبب بنتا ہے اس کے برعکس جو انسان اپنے نفسِ امارہ پر جبر کر کے اسے خدا کا مطیع نہیں بناتے وہ خدا کی اطاعت اختیار نہ کر کے صاحبِ اختیار بھی نہیں ہو سکتے۔ جو انسان اپنے نفس پر قابو نہیں پا سکتا وہ دنیا کی دیگر چیزوں پر کیسے

غالب آسکتا ہے؟۔ وہ اپنے آپ کو مجبورِ محض خیال کر کے کوئی عظیم کام نہیں کر سکتا نتیجتاً وہ ہمیشہ مایوسی اور سُستی کا شکار رہتا ہے۔ علامہ اقبالؒ چونکہ عمل اور حرکت کے قائل ہیں اس لئے وہ ہر قسم کے جمود اور کاہلی کے زبردست مخالف ہیں۔ وہ پختہ مرد اور مردِ خام کے جبر کے فرق کو یوں بیان کرتے ہیں۔

جبر دینِ مردِ صاحب ہمت است جبرِ مرداں از کمالِ قوت است
پختہ مردے پختہ تر گردد ز جبر جبر مردِ خام را آغوشِ قبر
جبرِ خالدؓ عالمے برہم زند جبرِ ما بیخ و بنِ ما برکند
کارِ مرداں است تسلیم و رضا بر ضعیفاں راست ناید ایں قبا

(جبر بلند ہمت آدمی کا مسلک ہے۔ بہادر انسانوں کا جبر طاقت کے کمال کی وجہ سے ہے۔
پختہ انسان جبر کی بدولت پختہ تر ہو جاتا ہے لیکن کمزور آدمی کا جبر اسے قبر کی گود میں لے جاتا ہے۔
حضرت خالدؓ کا جبر دنیا کو زیر و زبر کرتا ہے جبکہ ہمارا جبر ہماری جڑ کو کاٹ دیتا ہے۔
بلند ہمت انسانوں کا کام تسلیم و رضا ہے اس لئے یہ پوشاک کمزور آدمیوں کیلئے موزوں نہیں)۔
(جاوید نامہ۔ ص۔ 121)

مخالف حالات سے ستیزہ کاری اور اپنے پسندیدہ جہانِ نو کی تخلیق و تعمیر جبر پرستوں اور قنوطیت آمیز فلسفہ و تصوّف کے علمبرداروں کا شیوہ نہیں ہوا کرتا۔ اپنے آپ کو کلیتاً مجبور قرار دینے والے اور کاہلی اختیار کرنے والے ناساز گار حالات اور حوصلہ شکن واقعات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے زمانہ سازی کو اپنا مسلک بنا لیتے ہیں۔ ایسے ہی پست ہمت اور حقائق نا آشنا لوگ ہر وقت ناساز گار زمانے اور تقدیر کا شکوہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ بقول اقبالؒ۔

مردِ بے حوصلہ کرتا ہے زمانے کا گلہ
بندۂ حُر کے لئے نشترِ تقدیر ہے نوش

....

حدیثِ بے خبراں ہے "با زمانہ بساز"
زمانہ با تُو نسازد، تُو بازمانہ ستیز

(حقیقت سے ناواقف لوگوں کا یہ قول ہے کہ تو زمانے کا ساتھ دے، میں تو یہ کہوں گا کہ اگر زمانہ تیرے موافق نہ ہو تو تُو زمانے کے ساتھ جنگ کر)

(بالِ جبریل، ص۔ 16)

علامہ اقبالؒ کو افسوس ہے کہ موجودہ مسلمان اپنی بے عملی، کاہلی اور اسلامی تعلیمات سے اغماض کی

بناپر اپنے اصل مقامِ عظمت سے دور جاچکے ہیں۔ اگر وہ اپنے اسلاف کی طرح خدااور اس کے رسولؐ کی مکمل اطاعت کو اپنا وظیفۂ حیات بنالیں تو وہ دوبارہ شاندار عظمت، تابناک مستقبل اور دنیاوی سیادت کے مالک بن سکتے ہیں۔ وہ بجا کہتے ہیں۔

مُرغکِ اندر شاخسارِ بوستاں برمرادِ خویش بندد آشیاں
تو کہ داری فکرتِ گردوں مسیر خویش را از مرغکے کم تر مگیر
دیگر ایں نُہ آسماں تعمیر کُن بر مرادِ خود جہاں تعمیر کُن
چوں فنا اندر رضائے حق شود بندۂ مومن قضائے حق شود
در رضائے حق، فنا شَو چوں سلف گوہرِ خود را بروں آر از صَدَف

(ننھا سا پرندہ باغ کی شاخوں کے اندر اپنی خواہش کے مطابق اپنا آشیانہ بناتا ہے۔
تجھے خدا نے آسمان گیر تخیّل دیا ہے اس لئے تو اپنے آپ کو اس چھوٹے پرندے سے کم تر خیال نہ کر۔
تُو نو آسمانوں کو دوبارہ تعمیر کر، تو اپنی مراد کے مطابق اپنا جہاں تعمیر کر۔
جب بندۂ مومن خدا کی مرضی پر قربان ہو جاتا ہے تو پھر خدا کا فیصلہ بن جایا کرتا ہے۔
تو اپنے اسلاف کی مانند خدا کی مرضی پر قربان ہو جا اور سیپی سے اپنا موتی باہر نکال لا)
(پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، ص۔ 14۔ 13)

(۵) انسان

فلسفہ، اخلاقیات، الٰہیات، عمرانیات اور تصوّف و معرفت میں انسان کی تخلیق اور اس کے مقام کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مختلف مذاہب اور نظامہائے فکر میں اس کی پیدائش، اس کی نوعیّت اور اس کی اہمیّت سے متعلق ہر طرح کے خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ اکثر مفکّرین، فلاسفہ، صوفیاء، عرفاء اور مصلحین کی رائے میں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود انسان اپنی خداداد صلاحیتوں اور قوتِ تسخیر کی بدولت کائنات کی دیگر تمام مخلوقات سے افضل و اعلیٰ ہے۔ عہدِ عتیق میں انسان زیادہ تر مظاہرِ فطرت کی پرستش کا خُوگر تھا لیکن بعد ازاں خدائی ہدایت اور ذہنی ترقی کی وجہ سے اسے اپنے اعلیٰ اور اصلی مقام کی آگاہی حاصل ہو گئی۔ وہ "ہستی بینا ہے، دانا ہے، توانا ہے" علم و حکمت، دانش و بینش اور امتیازِ خیر و شر کی بناپر دیگر اشیائے کائنات کو مسخر کر چکا ہے۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور علم و حکمت کے میدان میں اس نے حیرت انگیز ترقی حاصل کی ہے۔ ارضی کائنات کی تسخیر کے بعد وہ اب آسمانی تسخیر کے بھی درپے ہے۔ علم و حکمت اور سائنس کی اس تمام حیرتناک ترقی کے باوجود وہ اپنی باطنی دنیا کی حقیقت و اہمیّت اور غلبہ و تسخیر سے کماحقہٗ باخبر نہیں۔ وہ مظاہرِ فطرت کی حقیقت سے تو آگاہ ہو چکا ہے لیکن وہ اپنی ذات کی حقیقت سے لاعلم

ہے۔ علامہ اقبالؒ نے انسان کی ذات یا نفس کی معرفت اور استحکام پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ وہ خودی (معرفتِ نفس، شعورِ ذات، خودنگری اور خودشناسی) کو فنا کرنے کی بجائے اسے اطاعتِ خداوندی، عشقِ رسولؐ اور ضبطِ نفس کے ذریعے نیابتِ الٰہی کے فریضہ کے لئے تعمیر کرنے کے حامی ہیں۔ وہ انسانی ذات کی انفرادیت برقرار رکھنے کے حق میں ہیں۔ انسانی ذات کو خدا کی ذات میں فنا یا گم کرنے کی بجائے وہ اس میں خدائی صفات کی جلوہ گری کی تلقین کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا نظریۂ ذاتِ انسانی ملاحظہ ہو۔ وہ کہتے ہیں۔

اے کہ مثلِ گُل ز گِل بالیدۂ   تُو ہم از بطنِ خودی زائیدۂ
از خودی و مگزر بقا انجام باش   قطرۂ می باش و بحر آشام باش
تو کہ از نورِ خودی تابندۂ   گر خودی محکم کُنی، پائندۂ

(اے کہ تو پھول کی مانند خاک سے بلند ہوا ہے، تو بھی خودی کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔
تو خودی کو مت چھوڑ اور بقا حاصل کر لے، تو قطرہ بن کر سمندر کو پینے والا بن جا۔
تو کہ خودی کے نور سے درخشاں ہے، تو اگر خودی کو مضبوط کرے تو تو پائندہ رہے گا)۔
(اسرارِ خودی، ص۔ 65)

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی ذہن بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح ارتقاء کے مراحل و مدارج سے گذرتا رہتا ہے۔ خارجی اور نفسیاتی تبدیلیوں کے ساتھ ہمارے افکار و خیالات بھی تغیّر پذیر رہتے ہیں۔ ان تغیرات کی وجہ سے ہمارے خیالات میں بعض اوقات تضاد نظر آتا ہے۔ انسانی خیالات میں تضاد اور نقص موجود ہوتا ہے؟ لیکن خدائی ہدایت کے علمبردار ہمیشہ ابدی اور فطرتی حقائق کو پیش کرتے ہیں اس لئے ان کی تعلیمات اور خدائی احکام میں تضاد نہیں ہوتا۔ اقبالیات سے گہری دلچسپی رکھنے والے اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ علامہ اقبالؒ بھی انسان ہونے کی حیثیت سے اس تضادِ خیال سے مبرّا نہیں۔ ان کا ذہن بھی ارتقاء و تغیّر کے مختلف مدارج سے گذرا ہے۔ ان کے بعض خیالات شروع سے لے کر بعض ٹھوس حقائق پر مبنی رہے لیکن چند خیالات شروع میں کچھ تھے لیکن بعد ازاں ان میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اگر یہ تبدیلی بہتر اور زیادہ مفید ہو تو اس تبدیلی کا خیر مقدم کرنا چاہئے نہ کہ اسے رَد کیا جائے۔ اگر یہ تبدیلی بدتر ثابت ہو تو پھر اسے تنقید کے بغیر قبول کرنا اندھا دھند نقالی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تضادِ خیال کی صورت میں ہمیں کسی شاعر اور مفکّر کے ان خیالات کو قبول کرنا ہو گا جن میں تواتر اور کثرت کا عنصر شامل ہو۔ انسان کی عظمت، اہمیت، حقیقت اور افادیت کے بارے میں علامہ اقبالؒ کے بیشتر اشعار، افکار اور اقوال ملتے ہیں لیکن شاذ و نادر چند اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جو انسان کے غیر حقیقی ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ اشعار ان کے ذہنی سفر کی ابتدائی منزل سے تعلق رکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی جلوہ پیرائی کے سامنے

انسان کے وجود کی کوئی حقیقت نہیں لیکن انسانی وجود بھی تو خدا کا عطا کردہ ہے اس لئے یہ غیر حقیقی نہیں ہو سکتا۔ قرآنی تعلیمات کی رُو سے انسان اور کائنات ہر گز باطل نہیں اگرچہ ان کی حقیقت ثانوی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے مندرجہ ذیل شعر سے روایتی تصوّف کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

میں جبھی تک تھا کہ تیری جلوہ پیرائی نہ تھی
جو نمودِ حق سے مٹ جاتا ہے وہ باطل ہوں میں

(بانگِ درا، ص۔ 107)

انسان زمین پر خلیفہ ہونے کی حیثیت سے خدائی صفات کا بھی عکاس اور مظہر ہونا چاہئے خدا تعالیٰ رحیم، کریم اور ستار ہے۔ رحم، کرم اور عیب پوشی اور دیگر صفات اس کی ذات میں منعکس ہونی چاہئیں۔ مذہبی تعلیمات، اخلاقیات اور تصوّف میں انسانی ہمدردی، انسانی خدمت اور انسانی محبت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو "دردِ دل" کے واسطے پیدا کیا ہے ورنہ اطاعت کے لئے فرشتے کم نہیں تھے۔ ایک مشہور صوفی شاعر طریقت یعنی تصوّف و معرفت کا حقیقی مقصد ہی انسانی خدمت کو قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

اسلامی نظام حیات کا مفکّر اور آفاقی اقدار کا ترجمان ہونے کے لحاظ سے برِ صغیر پاک و ہند کی شہرۂ آفاق شخصیت یعنی علامہ اقبالؒ بھی اسی نظریۂ زندگی کے زبردست حامی ہیں۔ وہ اپنی انسانیت دوستی کا اظہار کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

(بانگِ درا، ص۔ 141)

انسان کی تخلیق کا اصلی مقصد قرآنی تعلیمات کی رو سے عبادت قرار دیا گیا ہے جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" (میں نے جن و انسان کو پیدا کیا ہے تاکہ وہ میری عبادت کر سکیں)۔ عبادت کا وسیع مفہوم محض جسمانی پرستش پر مبنی نہیں بلکہ اس میں زندگی کے تمام شعبہ جات میں خدا کی اطاعت شامل ہے۔ جنّوں اور فرشتوں پر انسان کو فوقیت حاصل ہے کیونکہ وہ

محض زبان سے خدا کی اطاعت کا اعلان نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی زندگی میں بھی خدا کے احکام کو بجالاتا ہے۔ علاوہ ازیں اسے نیکی کی راہ پر چلنے کیلئے بے شمار آزمائشوں اور تکلیفوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی جفاکشی، نیکی جوئی اور خدا پرستی اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ فرشتے خدا کی عبادت کرتے ہیں لیکن انہیں صبر آزما حالات اور حوصلہ شکن واقعات سے سابقہ نہیں پڑتا۔ ان کا کام محض تسبیح و تہلیل ہے لیکن انسان اپنے عشق الٰہی کی بدولت بدی کی طاقتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اس کے حیات بخش اصولوں کو غالب کرنے کے لئے اپنی عزیز جان کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ علامہ اقبال" فرشتوں پر انسان کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ می خواہی، ز خاکی بیش ازاں خواہی

مسِ خامے کہ دارم از محبت کیمیا سازم
کہ فردا چوں رسم پیشِ تو، از من ارمغاں خواہی

(بندگی کا مقام اور عاشقی کا مقام ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اے خدا! تو فرشتے سے سجدہ چاہتا ہے مگر انسان سے اس سے زیادہ مطالبہ کرتا ہے۔
میں اپنی مسِ خام کو محبت سے کیمیا بناتا ہوں کیونکہ جب میں قیامت کے دن تیرے سامنے آؤں گا تو تو مجھ سے تحفہ چاہے گا)۔

(زبورِ عجم، ص۔ 43)

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ علامہ اقبال" مرحوم و مغفور انسان کی ہمہ گیر اہمیت اور مقامِ رفیع میں پختہ ایمان رکھتے تھے۔ وہ کائنات میں انسان کے اعلیٰ مقام اور اس کے عشقِ الٰہی کے جذبے کو سراہتے ہوئے یوں گویا ہوئے ہیں۔

اک تُو ہے کہ حق ہے، اس جہاں میں
باقی ہے نمودِ سیمیائی

خُودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(بالِ جبریل، ص۔ 54)

مذہبی علماء اور عرفاء کی رائے میں یہ کائنات خدا کے حُسنِ کامل کی مظہر ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے حُسن کی نمود کیلئے اس کائنات اور اس کی اشیاء کو خلعتِ آفرینش سے نوازا ہے۔ انسان فطری طور پر اس حُسن کی دلکشی سے متاثر ہو کر اس کے جلووں کی دید کا مشتاق دکھائی دیتا ہے۔ خدا کے پیدا کردہ سورج کی تمازت کو

ہماری کمزور آنکھیں زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتیں چہ جائیکہ ہم اس کائنات کے خالق کے حُسن کو دیکھ سکیں۔ انسانی آنکھوں کی کمزوری کے باوجود انسان خدا کے لازوال حُسن و جمال کے نظارے کا طالب ہے۔ حضرت موسیٰ نے جب خدا تعالیٰ کے دیدار کی تمنّا کی تو انہیں جواب ملا "لن ترانی" (تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکے گا) جب کوہِ طور پر حُسنِ مطلق کی ذرا سی جلوہ ریزی ہوئی تو حضرت موسیٰ اس کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو کر گر پڑے "وَخَرَّ مُوسیٰ صَعِقاً" یہ شرف صرف سردار انبیاء اور فخرِ اتقیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا تھا۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

موسیٰؑ زہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری، در تبسّمی

(موسیٰ صفات ایزدی کے ایک جلوے ہی سے بے ہوش ہو گئے لیکن آپ ذاتِ خداوندی کو دیکھتے ہیں اور متبسّم بھی ہیں۔)

علامہ اقبالؒ تصوف و شریعت کے اس مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خالقِ کائنات تو اپنے حُسن کو ظاہر کر رہے ہیں لیکن انسانی آنکھیں اس حُسن کو نہیں دیکھ سکتیں۔ وہ کہتے ہیں۔

وہ اپنے حُسن کی مستی سے ہیں مجبورِ پیدائی
مری آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسبابِ مستوری

(بالِ جبریل، ص۔ 60)

(۶) خدا

قرآنی تعلیمات کے مطابق مسلمان کو اپنے اندر خدائی صفات کا رنگ پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے تاکہ وہ دنیا اور دنیا والوں کے لئے پیامِ امن و رحمت کا باعث بن سکے۔ خدا تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے نقص اور عیب سے پاک اور منزّہ ہے اس کے برعکس انسان نسیان و خطا کا پتلا ہے وہ اگر اس ذاتِ بے ہمتا کی صفاتِ حسنہ کا اپنی ذات میں رنگ پیدا کر لے تو وہ کافی عیوب اور خامیوں سے پاک ہو سکتا ہے۔ اس نازک بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ انسان اپنے اندر خدائی صفات کو جلوہ گر کر کے الوہیت کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ خدا خُدا ہے اور انسان انسان۔ عبد اور معبود کا فرق کبھی مٹ نہیں سکتا یہ اٹل بحث ہے کہ لوہا آگ میں پڑ کر آگ کی خصوصیتِ حرارت اختیار کر لیتا ہے لیکن وہ لوہا ہی رہتا ہے۔ انسان خدائی صفات کا رنگ پیدا کرنے کی قرآن میں یوں تلقین کی گئی ہے "صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً" (اللہ کا رنگ ہی کچھ اور ہے اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ زیادہ بہتر ہو سکتا ہے؟)۔ نبی کریمؐ نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے "تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰه" (تم اپنے اندر خدائی اخلاق پیدا

کرو) ۔ اسلام کی ان تعلیمات کی ترجمانی کرتے ہوئے مفکرِ اسلام اور ترجمانِ ملّتِ اسلامیہ علاّمہ اقبالؒ کہتے ہیں۔

قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ — عشق را ناموس و نام و ننگ دہ
طبعِ مُسلم از محبت قاہر است — مُسلم ار عاشق نباشد کافر است

(اسرارِ خودی، ص۔ 62)

(تو اپنے دل میں اللہ کا رنگ پیدا کر اور اس طرح عشق کو عزت و ناموس عطا کر
مسلمان کی طبیعت محبت سے قاہر ہے، مسلمان اگر عاشقِ اسلام نہ ہو تو وہ کافر ہے)

اگر تصوف و معرفت کا راستہ ہمیں عشقِ الٰہی اور محبتِ رسولؐ کی منزل کی جانب لے جاتا ہے تو پھر ایسا تصوّف بلاشبہ اسلامی اور قرآنی تصوّف ہے۔ تصوّف در حقیقت ہمیں اپنے دل و دماغ میں خدائی صفات کا رنگ پیدا کرنے کا طریقہ بتاتا ہے۔ نیک مقصد کے لئے طریقِ عمل کا بھی درست ہونا اشد ضروری ہے کیونکہ اسلام نیک مقاصد کے لئے غیر اسلامی طریقے اختیار کرنے سے سخت ممانعت کرتا ہے۔

علاّمہ اقبالؒ جب موجودہ دَور کے مسلمانوں کے قُلوب و اذہان کو عشقِ الٰہی سے خالی دیکھتے ہیں تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب "اسرارِ خودی" میں "دُعا" کے عنوان سے خدا کی بارگاہ میں جذبۂ عشقِ خدا، چشمِ بے خواب، دلِ بیتاب، عشقِ سلمانؓ و بلالؓ اور دلِ ناشاد کی تسکین کے لئے التجا کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے چو جاں اندر وجودِ عالمی — جانِ ما باشی و از ما می رمی
باز تسکینِ دلِ ناشاد شو — باز اندر سینہ ہا آباد شو
باز از ما خواہ ننگ و نام را — پختہ تر کُن عاشقانِ خام را
از تہی دستاں رُخِ زیبا مپوش — عشقِ سلمانؓ و بلالؓ ارزاں فروش
چشمِ بے خواب و دلِ بیتاب دہ — باز مارا فطرتِ سیماب دہ

(اے خدا! تو جان کی مانند عالمی وجود کے اندر ہے، تُو ہماری روح ہو کر ہم سے بھاگتا ہے۔
تُو دوبارہ ہمارے ناشاد دل کی تسکین بن جا، تُو پھر ہمارے سینوں کے اندر آباد ہو جا۔
تُو پھر ہم سے ننگ و نام کا مطالبہ کر اور تُو خام عاشقوں کو زیادہ پختہ کر دے۔
تُو ہم تہی دستوں سے اپنا جمال مت چھپا، تُو ہمیں حضرت سلمانؓ اور حضرت بلالؓ کا عشق دے۔
تُو ہمیں ایک بار پھر بے خواب آنکھیں، بے چین دل اور سیمابی فطرت عطا کر دے)

(اسرارِ خودی، ص۔ 76-75)

قرآنِ حکیم میں ارشادِ خداوندی ہے "وَاِلَیٰ رَبِّکَ الْمُنْتَهٰی" (تیرا پروردگار ہر چیز کی انتہا ہے) ۔ کیا یہ مسلّمہ حقیقت نہیں کہ کائنات کی ابتداء اور انتہا وہی ذاتِ سرمدی ہے جس نے دنیا و مافیہا کو آفرینش سے نوازا ہے؟ چونکہ کائنات کی تخلیق مادی نہیں بلکہ روحانی ہے اس لئے ہر چیز آخر کار لوٹ کر وہاں ہی جائے گی۔ اشرف المخلوقات ہونے کے لحاظ سے انسان کی آخری منزل بھی وہی ہے دوسرے نقطۂ نگاہ سے ہماری زندگی کا مقصدِ حقیقی ذاتِ کبریا ہے۔ ہماری منزلِ مقصود وہی ہے اس لئے ہمارا جینا' مرنا' کھانا پینا اسی کے لئے ہونا چاہئے۔ قرآنِ حکیم کی اس تعلیم کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اکابر صوفیاء نے بھی ہمیں خدا تعالیٰ کی مکمل اطاعت کی تلقین کی 'صرف اسی کو اپنا معبود' مقصود اور مطلوب بنانا چاہئے۔ علاّمہ اقبالؒ بھی اسی اسلامی تصوّف کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اپنے روحانی مُرشد مولانا رومؒ کے ان الفاظ "منزلِ ما کبریا است" کو اپنے مندرجہ ذیل شعر میں بڑی خوبصورتی' مہارت اور عقیدت کے ساتھ شامل کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

شعلۂ در گیر زد بر خس و خاشاکِ من
مرشدِ رومیؒ کہ گفت "منزلِ ما کبریا است"

(مُرشدِ رومیؒ نے کہا ہے کہ ہماری منزل خدا ہے' ان کے اس قول نے میرے خس و خاشاک کو شعلہ زن کر دیا ہے)

(پیامِ مشرق' ص۔ 171)

قرآنی تعلیمات کی رُو سے خدا تعالیٰ کی ذات ہر قسم کی مکانیّت سے پاک ہے۔ وہ زمان و مکان کی پابندیوں سے قطعاً آزاد ہے کیونکہ جو زمان و مکان اور مادی وجود میں محدود ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ وہ ہر جگہ موجود' حاوی اور ناظر ہے۔ جس دل میں اس کی محبّت موج زن ہو اور وہ اس نور سے متنیر ہو وہاں پر خدا کی خاص نظرِ کرم ہوتی ہے۔ ایک قرآنی آیت ہے .... "اِنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ" (بے شک اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حول کئے ہوئے ہے) ۔ وہ دلوں میں کیسے سمایا ہوا ہے' اس کی حقیقت انسانوں کو معلوم نہیں۔ وہ ذاتِ بزرگ و برتر ہی اس بات کو جانتی ہے۔ اس کی ذات کو کسی بھی چیز سے صحیح طور پر تشبیہ نہیں دی جا سکتی کیونکہ وہ ہمارے حواس میں نہیں سما سکتا۔ "لَیْسَ کَمِثْلِهٖ الخ" (کوئی شے بھی اس کی مِثل نہیں) ۔ وہ ہوالاوّل' ہوالآخر' ہوالظاہر' ہوالباطن (وہی ذات اوّل' آخر' ظاہر اور باطن) ہے۔ اگرچہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے تاہم ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ ان قرآنی تعلیمات کا عکس ہمیں صحیح مسلم صوفیاء اور عرفاء کے کلام میں ملتا ہے۔ علاّمہ اقبالؒ کو چونکہ تصوّف کے اس اہم موضوع سے خاصی دلچسپی ہے اس لئے انہوں نے اسے بھی اپنی شاعری اور نثر میں اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ اس موضوع کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

نہ تُو اندر حرم گنجی نہ در بت خانہ می آئی
ولیکن سُوئے مشتاقاں چہ مشتاقانہ می آئی

قدم بیباک تر نِہ در حریمِ جانِ مشتاقاں
تُو صاحب خانۂ آخر چرا دُزدانہ می آئی

بیا اقبالؔ! جامے از خُمستانِ خود درکش
تُو از میخانۂ مغرب زِ خود بیگانہ می آئی

(پیامِ مشرق، ص۔ 173)

(اے خدا! تُو نہ تو حرم میں سماتا ہے اور نہ ہی بُت خانہ میں آتا ہے لیکن تو اپنے چاہنے والوں کی جانب کس شوق کے ساتھ آتا ہے۔

تو اپنے مشتاقوں کی جان کے حریم میں بیباکی کے ساتھ آ، تُو تو صاحبِ خانہ ہے آخر چوری چھپے کیوں آتا ہے؟۔

اے اقبال! تو خودی کے خُمستان سے ایک جام لے کیونکہ تو میخانۂ مغرب سے اپنی ذات سے بیگانہ ہو کر آیا ہے)۔

اے کہ تُو نزدیک تر از جانی و پنہاں زِ نگہ
ہجرِ تُو خوشترم آید زِ وصالِ دگراں

(اے خدا! تو میری جان سے زیادہ نزدیک لیکن نگاہ سے دُور ہے، مجھے دوسروں کے وصال سے تیری جدائی زیادہ اچھی لگتی ہے)

(پیامِ مشرق، ص۔ 175)

"وحدت الوجود" (وجود کی وحدت) تصوّف و معرفت کا ایک اہم اور خاصا بحث طلب مسئلہ بن چکا ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے خدا اور کائنات دو نہیں بلکہ خدا ہی کائنات کی سب چیزوں میں جاری و ساری ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر جگہ ہر شے میں وہی موجود اور شامل ہے۔ حقیقی وجود اللہ کا ہے اور باقی تمام اشیائے کائنات اور لاتعداد مخلوقات کا وجود غیر حقیقی ہے۔ چونکہ وہی ذاتِ باری ہر شے میں موجود اور پنہاں ہے اس لئے اس کے وجود کی وحدت کثرت کی شکل میں پھیل گئی ہے۔ قرآنی تعلیمات کی رُو سے یہ نظریہ مکمل طور پر درست نہیں، کیونکہ اشیائے کائنات اور خالقِ کائنات ایک نہیں بلکہ جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں، مخلوقات کا وجود خدا تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہے زندگی خالقِ کائنات کی سب سے بڑی نعمت اور اس کی صفتِ خلاقی ربوبیتِ عامہ اور رحمتِ خاص کا نتیجہ ہے خالق، خالق ہے اور مخلوق، مخلوق عابد اور معبود خالق اور مخلوق، شاہد اور مشہود، رب اور مربوب ایک وجود نہیں ہیں، اگر ایسا ہوتا تو شریعت

کے احکام ' رُشد وہدایت کا سلسلہ ' خیر و شر کا امتیاز اور کتبِ آسمانی کا نزول بے معنی ہو جائے۔ اگر خدا اور مخلوق ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں تو پھر مخلوق پر شریعت کی پابندی کیسی؟۔ علاّمہ اقبال ؒ اپنے ذہنی سفر کی اوّلین منزلوں میں وحدت الوجود کے قائل تھے لیکن بعد ازاں قرآن حکیم کے عمیق مطالعہ اور مزید غور وفکر کے نتیجے میں انہوں نے یہ نظریہ ترک کر کے " وحدت الشہود " (شہود کی وحدت) کا نظریہ اختیار کیا۔ اس نظریئے کی رُو سے خداتعالیٰ حُسنِ مطلق ہونے کی حیثیت سے اپنے بے مثال جمال کو کائنات کی تمام چیزوں میں ظاہر کر رہا ہے۔ تمام مخلوقات کی زندگی اسی " نورِ قاہر " کی کرشمہ سازی ہے۔ اس تصوّر کے مطابق مخلوقات کا وجود حقیقی ہے کیونکہ وہ خدا کی صفتِ تخلیق کا مظہر اور شاہد ہے۔ مخلوقات اور اشیاء کا وجود ثانوی حقیقت رکھتا ہے۔ قرآنی تعلیمات اس کائنات کی تخلیق کو " بالحق " قرار دیتے ہوئے ہمیں دین کی بھلائیوں کے علاوہ دنیاوی حَسنات کے حصول کی بھی ترغیب دیتی ہیں۔ ارشادِ ایزدی ہے۔ " رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا " (اے ہمارے پرور گار! تو نے اس نظامِ کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا)۔ ایک اور جگہ دنیا کو حقیقی سمجھتے ہوئے ہمیں اس دعا کی تلقین کی گئی ہے۔ " رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّار " (اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں دنیا اور آخرت کی بھلائیاں عطا کر اور ہمیں عذاب نار سے بھی محفوظ رکھ)۔ قرآن میں ہمیں بار بار کائنات کے مطالعہ ومشاہدہ اور اس کی تسخیر کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ اگر یہ کائنات اور اس کی اشیاء ' وجود باطل ہیں تو پھر باطل کے مطالعہ و تسخیر کا حکم کیسے دیا گیا ہے؟ اگر خدا اور انسان الگ الگ وجود نہیں رکھتے تو پھر انسان کو صوم و صلوٰۃ اور زکوٰۃ وجہاد وغیرہ کا حکم دینے کے کیا معنی ہیں؟۔ علاّمہ اقبال ؒ کے ذہنی ارتقاء کے اس مرحلے کی چند مثالیں درج ذیل کی جاتی ہیں۔ وہ کائنات میں پھیلے ہوئے حُسن و جمال کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

حُسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے' غنچے میں وہ چٹک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو؟
ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہو

(بانگِ درا' ص۔ 85)

محفل قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حُسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حُسن

حُسن کوہستاں کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے
مہر کی ضَوگستری' شب کی سیہ پوشی میں ہے
آسمانِ صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ
شام کی ظلمت' شفق کی گُل فروشی میں ہے یہ

چشمۂ کہسار میں' دریا کی آزادی میں حُسن
شہر میں' صحرا میں' ویرانے میں' آبادی میں حُسن
کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تُو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے' رگِ گُل سے قطرہ انسان کے لہو کا

چمک تیری عیاں بجلی میں' آتش میں' شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں' سورج میں' تارے میں
بلندی آسمانوں میں' زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں' افتادگی تیری کنارے میں
جو ہے بیدار انساں میں' وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں' پھول میں' حیواں میں' پتھر میں' ستارے میں

(بانگِ درا' ص۔ 137۔ 138)

جو ایک تھا اے نگاہ! تُو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہو گا؟

(بانگِ درا' ص۔ 141)

تصوّف و معرفت کا ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ وہ انسان کے اندر اس عظیم ہستی کا احساس اور خیال ہمیشہ بیدار رکھے جس نے کائنات کے اس حیرت انگیز نظام کو قائم کر رکھا ہے۔ اس ذاتِ کامل کا احساس ہمیں اس کی اطاعت و محبّت کے جذبہ سے وابستہ رکھتا ہے تاکہ ہم زندگی کی مادی ضرورتوں' نفس کی آلائشوں اور معاشرتی بندھنوں ہی میں گرفتار اور پریشان نہ رہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے "اَلتَّصَوُّفُ تَصْفِیَۃُ الْقُلُوبِ" (تصوّف دراصل دلوں کی صفائی کا نام ہے)۔ اسلام ہمیں دنیاوی

فرائض، معاشرتی اختلاط اور مادی ضرورتوں کی جائز اور صحیح تکمیل سے باز نہیں رکھتا لیکن دُنیا اور مادہ کے تقاضوں میں اُلجھ کر اپنے خالق، مالک اور رازق کو بھلا دینے سے ضرور منع کرتا ہے۔ خدائی احکام اور مشیّت کے مطابق جو کام بھی کیا جائے وہ اسلامی تعلیمات کی روح سے عبادت ہی کہلاتا ہے۔ دَورِ حاضر کا انسان اپنی زندگی کے خارجی اور مادی مسائل اور ضرورتوں کا شکار ہو کر اپنے خالق اور آقا کے رشتے کو اُستوار نہیں رکھ سکا اسی لئے وہ گوناگوں ذہنی، سماجی، اقتصادی، سیاسی اور روحانی پریشانیوں میں مبتلا ہو چکا ہے۔ علاّمہ اقبالؒ قرآن اور اسلامی تصوّف کے اس پہلو کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ما تُرا جوئیم و تُو از دیدہ دُور
نے غلط، ما کور و تُو اندر حضور

(اے خدا! ہم تجھے تلاش کرتے ہیں اور تُو ہماری آنکھ سے دُور ہے، غلط نہیں کہ تُو تو یہاں ظاہر ہے اور ہم ہی اندھے ہیں)۔

(جاویدنامہ ص۔ 9)

بانگِ درا کے مندرجہ ذیل اشعار مذکورہ بالا حقیقت کی یُوں ترجمانی کرتے ہیں۔

مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی کیا خرَد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے
ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

(ص۔ 82)

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگذر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں

(بانگِ درا، ص۔ 105)

حُسنِ ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں
کہتے ہیں بے قرار ہے جلوۂ عام کے لئے

(بانگِ درا، 124)

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگہ کو نظّارے کی تمنّا ہے، دل کو سودا ہے جستجو کا

(بانگِ درا، ص۔ 137)

قرآن حکیم کی تعلیمات کی رُو سے خدا تعالیٰ ہر وقت جلوہ گری کر رہا ہے۔ وہ کائنات کی تخلیق کر کے بیکار نہیں بیٹھا ہوا بلکہ دنیا اور دنیا والوں کے معاملات اور واقعات کے ساتھ اب بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ خدا تعالیٰ کی مسلسل صفتِ تخلیق کو قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ " (وہ (خدا) ہر روز نئی نئی جلوہ گری میں مصروف رہتا ہے) خدا تعالیٰ کے بارے میں یہ تصوّر کہ وہ دنیا اور انسانوں سے لاتعلق ہو کر عرش پر بیٹھا ہوا ہے درست نہیں۔ "هُوَ مَعَکُمْ" (وہ تمہارے ساتھ ہے) کے بمصداق ہمیں خدا کی معیت کا ہمیشہ احساس کرنا چاہئے۔ اسلامی تصوّف میں قرآنی تعلیم کا یہ پہلو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ صوفیانہ موضوعات اور عارفانہ مسائل سے گہری دلچسپی رکھنے کی بناء پر علاّمہ اقبالؒ قرآن کے اس تصورِ خدا پر روشنی ڈالتے ہیں:۔

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اسے واعظ!
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

(بانگِ درا، ص۔ 106)

انسانی فطرت میں پوشیدہ اور پردے میں مخفی اشیاء و حقائق کی تلاش اور دید کا شدید جذبہ پایا جاتا ہے۔ جب سے یہ کائنات معرضِ وجود میں آئی ہے اس وقت سے لے کر اب تک انسان حُسنِ مطلق اور خالقِ دو جہاں کے جلوے کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہے۔ اگرچہ انسانی آنکھیں جمالِ ایزدی کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتیں اس کے باوجود انسان اس ذاتِ بے ہمتا کی دید کے لئے مشتاق ہے۔ خدا تعالیٰ اپنی جلوہ گری اور مظاہرِ قدرت کے حسین مناظر کے ذریعے اپنے جمال کو بے نقاب کر رہا ہے۔ صحیح رویتِ الٰہی کے لئے جنّت کو منتخب کیا گیا ہے۔ علاّمہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ خدا کے دیدار کا مطالبہ حضرت موسیٰؑ نے کیا تھا۔ اُن کے لئے یہ مطالبہ روا تھا لیکن مجھ جیسے انسانوں پر ایسا تقاضا حرام ہے۔ وہ فرماتے ہیں ۔

تھا ارنی گو کلیمؑ، میں ارنی گو نہیں
اس کو تقاضا روا، مجھ پہ تقاضا حرام

(بالِ جبریل، ص۔ 62)

قرآنِ حکیم میں ارشاد خداوندی ہے "لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ" (اُس (خدا) کا ادراک آنکھیں نہیں کر سکتیں) بعض صوفیاء اور عرفاء کے مکاشفات اور اقوال میں دیدارِ الٰہی کی نعمت کے حصول کا تذکرہ ملتا ہے۔ خدا کا براہِ راست دیدار نبی اکرمؐ کے سوا کسی انسان کو حاصل نہیں ہوا۔ "ھُوَ الظَّاھِرُ ھُوَ الْبَاطِنُ" کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ براہِ راست ہمیں اپنا دیدار عطا کر رہا ہے بلکہ وہ حُسنِ کائنات کے ذریعے اپنی صفتِ جمال کو ظاہر کر رہا ہے۔ مومنوں کو ذاتِ خداوندی کا دیدار جنّت میں عطا کرنے کا قرآن نے ضرور وعدہ کیا ہے لیکن اس مادی دنیا میں ہمارے لئے ایسا ممکن نہیں۔

علاّمہ اقبالؒ کے عارفانہ کلام کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ وہ "خدامست" انسان تھے۔ اپنی طرح وہ دوسروں کو بھی بندۂ خدا بننے کا ہمیشہ مشورہ دیتے رہے نہ صرف یہ بلکہ وہ خدائی عظمت کے منکرین کو بھی مقامِ کبریا سے آشنا کرنے کا شدید جذبہ رکھتے تھے۔ وہ خدا تعالیٰ کی صحیح بندگی کو انسانیت کا ارفع مقام اور نیابتِ الٰہی کو کائنات کی سرداری کے مترادف خیال کرتے تھے۔ زمانے کا غلام بننے کی بجائے وہ ہمیں بندۂ خدا کی صفات پیدا کر کے زمان و مکان کی تسخیر کے قابل بنانے کے درپے تھے۔ ان کا جذبۂ خدا پرستی ملاحظہ ہو۔ وہ کہتے ہیں۔

یہ بندگی، خدائی، وہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ

(بالِ جبریل، ص۔ 54)

وہ مغرب کے مشہور مفکر نطشے کی غلط مذہبی واردات کے بارے میں کہتے ہیں۔۔۔ "جرمنی کا مشہور مجذوب نیٹشا جو اپنی قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا اور اس لئے اس کے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط رستہ پر ڈال دیا"۔ وہ اپنے مندرجہ ذیل شعر میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

(بالِ جبریل، ص۔ 56)

(۷) شریعت و طریقت (علمِ ظاہر اور علمِ باطن)

اربابِ علم و نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ رسول کریمؐ کو خدا تعالیٰ نے قرآن حکیم جیسی عظیم الشان الہامی کتابِ ہدایت عطا کی ہے جو اہلِ عالم کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے لئے بالخصوص رحمت، شفا، نورِ مبین اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی اہم اور معینہ گوشہ ایسا نہیں جس کے لئے اس عدیم النظیر اور "کتابِ زندہ" میں رہنمائی موجود نہ ہو۔ انسانی زندگی اور کائنات کے اصولِ ثبات و تغیّر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس میں اَبدی اور اَٹل قوانین بھی ہیں اور گوناگوں تغیر پذیر مسائل کے حل کے لئے عام ضوابط بھی ہیں۔ اسلام اور قرآن کے ان قوانین و ضوابط کو شریعت کا نام دیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں شریعتِ اسلامیہ، قانونِ خداوندی اور دینِ محمدیؐ پر مبنی ہے۔ اس قانونِ الٰہی اور اتباعِ مصطفیٰؐ کی رُو سے فرد، جماعت، دین و دنیا، سیاست و مذہب اور جسم و مادہ کے تمام جائز تقاضوں کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ شرعِ محمدیؐ اور نظامِ مصطفیٰؐ ہی وہ سانچہ ہے جس میں فوق البشر ڈھلتے ہیں۔ یہ مثالی نظامِ حیات ہماری جسمانی اور روحانی پاکیزگی اور ترقی کا ضامن ہے۔ صحابہ کرامؓ اور دیگر ممتاز شخصیات نے اسی شریعت کی پابندی کر کے دینی اور دنیوی عظمت و شہرت حاصل کی تھی۔ جب بعد میں مسلمان عیش و عشرت کا شکار ہو گئے تو بعض نیک طینت مسلمانوں نے علمائے سُو اور نفس پرست حکمرانوں کی دین فروشی اور دنیاداری سے بیزار ہو کر تصوّف و طریقت کی طرف رجوع کیا۔ ابتداء میں تصوّف اسلامی تعلیمات کے ساتھ ہم آہنگ تھا لیکن بعد ازاں سیاسی، غیر مذہبی، عجمی اثرات اور مصلحتوں کی بنا پر طریقت و تصوّف میں غیر قرآنی عقائد داخل کر دیئے گئے۔ ان حضرات نے شریعت اور طریقت کو دو جُداگانہ نظام قرار دیئے۔ نہ صرف یہ بلکہ بعض اہلِ طریقت نے تو شریعت کو ظاہر اور طریقت کو باطن کہہ کر شریعتِ اسلامیہ پر ترجیح دینی شروع کر دی۔ انتہا پسند صوفیوں اور طریقت کے حامیوں نے شریعت کے احکام کی پابندی کو در خورِ اعتنا خیال نہ کیا۔ ان کی اس غیر اسلامی روش اور خلافِ شرع اطوار نے عوامُ النّاس کو بھی بُری طرح متاثر کر دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ بعض صوفیاء اور علمائے شریعت کے درمیان محاذ آرائی اور باہمی طعن و تشنیع کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ بعض صوفیاء، اہلِ طریقت اور پیر آج بھی شریعت و طریقت کی جدائی کے حامی ہیں۔

علامّہ اقبالؒ اسلامی تعلیمات پر گہری نظر رکھتے تھے وہ ہر حال میں قرآنی احکام اور اسوۂ رسولؐ کی مکمل اور غیر مشروط اطاعت و تقلید کے مبلغ و حامی تھے۔ ان کی رائے میں شریعت و طریقت کا تصادم کسی طرح بھی مستحسن اور مفید نہیں ہو سکتا۔ شریعت و طریقت کے بارے میں ان کے اہم تصوّرات کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔ وہ تقلید و اطاعت کو عشقِ اسلام اور جذبۂ حبِ رسولؐ کی بنیاد قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق ہست ہم تقلید از اسمائے عشق
کاملِ بسطام در تقلیدِ فرد اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد
عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار تا کمندِ تو شود یزداں شکار

اندکے اندر حرائے دل نشین ترکِ خود کُن سوئے حق ہجرت گزین
محکم از حق شو' سوئے خود گام زن لات و عُزّائے ہوس را سر شکن
تا خدائے کعبہ بنوازد تُرا شرح انّی جاعلٌ سازد تُرا

(عشق کی شراب سے کئی کیفیات پیدا ہوتی ہیں' پیروی بھی عشق کے ناموں میں سے ایک ہے۔
بسطام کے رہنے والے کامل انسان نے ایک فرد (رسول کریمؐ) کی تقلید میں خربوزہ کھانے سے پرہیز کیا تھا۔
اگر تو عاشق ہے تو پھر اپنے محبوبؐ کی اطاعت سے محکم ہو جا تاکہ تیری کمند خدا کو شکار کر سکے۔
تھوڑی دیر تک تُو دل کے حرا میں بیٹھ' اپنی نفسانی خواہشات کو چھوڑ کر خدا کا پرستار بن جا۔
خدا کی اطاعت سے مضبوط ہو کر اپنی خودی کی جانب قدم اٹھا' تُو ہوس کے بتوں (لات و عزیٰ) کا سر پھوڑ دے
تاکہ خدائے کعبہ تجھے نعمتوں سے نوازے اور تجھے نیابت کے منصب پر فائز کر دے)

(اسرارِ خودی' ص۔ 22۔ 21)

مندرجہ بالا اشعار میں ایک شعر بایزید بسطامیؒ کے بارے میں ہے۔ علاّمہ اقبالؒ خود اس کی یوں وضاحت کرتے ہیں...... "حضرت بایزید بسطامیؒ نے خربوزہ کھانے سے محض اس بنا پر اجتناب کیا تھا کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ نبی کریمؐ نے یہ پھل کس طرح کھایا ہے۔ اسی کامل تقلید کا نام عشق ہے"۔ حضرت بایزیدؒ عراق کے ایک علاقہ بسطام کے رہنے والے مشہور صوفی اور عاشقِ رسولؐ تھے۔

ملت اسلامیہ کے نامور اور مایۂ ناز مفکّر اور ترجمانِ اسلام علاّمہ اقبالؒ مسلمانوں کو یہ بار بار تلقین کرتے ہیں کہ وہ نبی اکرمؐ کے پیش کردہ نظامِ زندگی اور آئین کی پوری پوری اطاعت کریں۔ وہ ہمیں مصطفیٰؐ کی متعین حدودِ شریعت کے اندر رہ کر انفرادی اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار! می شود از جبر پیدا اختیار
سبزہ بر دینِ نمُو روئیدہ است پائمال از ترکِ آں گردیدہ است
باطنِ ہر شئے ز آئینے قوی تُو چرا غافل ازیں ساماں روی؟
شکوہ سنجِ سختیٔ آئیں مشو از حدودِ مصطفیٰؐ بیروں مرو

(اے لاپرواہ! تو اطاعت کرنے کی کوشش کر کیونکہ جبر سے اختیار پیدا ہوتا ہے۔
نشوونما کے اصول پر سبزہ اُگا ہوا ہے' اس قانون فطرت کو چھوڑ کر وہ پائمال ہو گیا ہے
ہر چیز کا باطن کسی آئین کی وجہ سے مضبوط ہوتا ہے' تو اس سامان سے غافل کیوں ہے؟۔
تو خدائی قانون کی سختی کی شکایت مت کر اور مصطفیٰؐ کی حدود سے باہر نہ جا)۔

(اسرارِ خودی ص۔ 41)

وہ مندرجہ بالا پہلے شعر کی تشریح کرتے ہوئے خود کہتے ہیں .... ”اس شعر میں الہٰیات اسلامیہ کے مشہور مسئلۂ جبر و اختیار کی طرف اشارہ ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ اور سچی حریت اطاعت یعنی پابندیٔ فرائض سے پیدا ہوتی ہے“۔ علامہ اقبالؒ اس طرح ہم پر یہ امر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ قرآنی تعلیمات اور اسوۂ رسولؐ کے مطابق عمل کرنے سے انسان کو کسی وقت دقّت کا احساس ہوتا ہے۔ اسے اسلامی احکام پر عمل پیرا ہونے کے لئے اپنے نفسِ امارہ سے خاصا جہاد کرنا پڑتا ہے۔ ممکن ہے وہ بعض اوقات ان احکام کی پابندی کو اپنے اوپر جبر خیال کرے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ روزانہ نماز پنجگانہ، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد کے فرائض کی پابندی ہر مسلمان نہیں کرتا کیونکہ اسے اس مقصد کے لئے وقت، آرام، نیند، بھوک پیاس، مال، نفسانی خواہشات اور جان کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔ صحیح مسلمان ان خدائی احکام کی پابندی اور اتباعِ رسولؐ بدل و جان کرتا ہے۔ جذبۂ عشق کے بغیر کسی کی اطاعت ممکن نہیں ہُوا کرتی یہی وجہ ہے علاّمہ اقبالؒ ہمارے دل و دماغ میں پہلے خدا اور اس کے بعد رسولِ مقبولؐ کی محبّت کا شدید جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جب خدا کی ہر وقت مکمل اطاعت کی جائے گی تو لازماً خدا کو اپنے عاشقِ صادق سے محبّت ہو جائے گی اور وہ اس کے اندر بھی اختیار کی صفت پیدا کر دے گا۔ علاوہ ازیں جو شخص خدائے واحد میں یقین رکھے اور اس کی عبادت کرے وہ لاتعداد چھوٹے اور جھوٹے خداؤں کی جبری اطاعت سے نجات پالے گا۔ علاّمہ اقبالؒ ہمیں اس بات سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ کائنات کی تمام اشیاء خدا کے مقرر کردہ قوانین کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ قوانینِ فطرت کی ہمہ گیری سے تمام چیزیں نہایت خوبی کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ مفکرِ اسلام علاّمہ اقبالؒ مسلمانوں کو بھی خدا کے مقرر کردہ آئین کی برضا و رغبت پابندی کا درس دیتے ہیں کہ وہ مصطفیٰؐ کے آئین کی حدود کے اندر رہیں۔ جن باتوں کا وہ حکم دیتے ہیں انہیں کیا جائے اور جن امور سے انہوں نے منع کیا ہے ہم ان سے رُک جائیں۔ اوامر اور نواہی کی ان حدود ہی کو شریعت کا نام دیا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم خدا اور رسولؐ کی اطاعت کا بار بار حکم دیتا ہے مثلاً .... ”اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْل“ (تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو)۔ ایک اور جگہ یوں ارشاد خداوندی ہے...... ”مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا“ (جو کچھ تمہیں رسولؐ نے دیا ہے اسے پکڑو اور جس سے انہوں نے تمہیں منع کیا ہے پس تم ان باتوں سے رُک جاؤ)۔ خداوند تعالیٰ نے اطاعتِ رسولؐ کو اپنی اطاعت کے مترادف قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے .. ”مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ“ (جس نے رسولؐ کی اطاعت کی پس اس نے اللہ کی اطاعت کی)۔ قرآنِ حکیم کی ان واضح آیات کے مطابق وجۂ تخلیقِ کائنات اور منبعِ فیوض و برکات حضرت محمدؐ کی مکمل پیروی ہی خدا کی اطاعت و خوشنودی کا سبب ہو سکتی ہے۔ رسولِ خدا کے بتائے ہوئے راستے کو چھوڑ کر کوئی غلط طریق اختیار کرنا گمراہی اور ناکامی کی دلیل ہے۔

آئین کسی ملک اور قوم کے طرزِ فکر اور طریقِ عمل کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔ قومی تنظیم اور ملکی سالمیّت آئین کی تشکیل اور قانون کی پابندی کے بغیر ناممکن ہوتی ہیں۔ آئین افرادِ ملّت میں وحدتِ فکر و عمل پیدا کر کے انہیں ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن کیا کرتا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے ملّتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی، فکری اتحاد، عملی وحدت اور استحکام کے لئے ہمیں اَبدی ضابطۂ حیات عطا کیا ہے جو ہماری فلاح و نجات کا ضامن ہے۔ اس بارے میں وہ فرماتے ہیں۔

ملتے را رفت چوں آئیں ز دست — مثلِ خاک اجزائے اُو از ہم شکست
ہستیٔ مُسلم ز آئین است و بس — باطنِ دینِ نبیؐ این است و بس
تُو ہمی دانی کہ آئینِ تُو چیست؟ — زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تُو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ اُو لایزال است و قدیم

(جب مسلمان قوم نے اپنے آئین کو چھوڑ دیا تو خاک کی طرح اس کے افراد منتشر ہو گئے
مسلمان کی زندگی صرف آئین کی وجہ سے ہے، نبی کریمؐ کے دین کی روح صرف یہی ہے
کیا تو جانتا ہے کہ تیرا آئین کیا ہے اور آسمان تلے تیری شان و شوکت کا راز کیا ہے؟
تیرا آئین زندہ کتاب یعنی قرآنِ حکیم ہے جس کے حکیمانہ قوانین لازوال اور قدیم ہیں)۔

(رموزِ بے خودی، ص۔ 121)

علامہ اقبالؒ کو اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ بعض صوفیاء اور واعظین قرآن کی تعلیم و حکمت کی بجائے محض قوالی اور داستان گوئی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ قرآنی آیات کو وردِ زبان بنانے کی بجائے وہ بعض تصوّف پسند شُعراء کی شاعری اور خانقاہ نشینی کے عادی ہو چکے ہیں۔ وہ قرآن سے اپنی محبّت اور بعض صوفیاء کی قرآن میں عدمِ دلچسپی پر یوُں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

گر تُو مے خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جُز بہ قرآں زیستن
صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست — از شرابِ نغمۂ قوّال مست
آتش از شعرِ عراقی در دِلش — در نمی سازد بہ قرآں محفلش
واعظِ دستاں زنِ افسانہ بند — معنیٔ اُو پست و حرفِ اُو بلند

(اگر تو مسلمان کے طور پر زندگی بسر کرنے کا خواہشمند ہے تو پھر قرآن کے بغیر ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔
پشمینہ پہننے والا اور حال میں مست صوفی قوال کے گیتوں کی شراب میں مدہوش ہے۔
صوفی کے دل میں عراقی شاعر کی شاعری کی آگ تو موجود ہے لیکن اس کی محفل قرآن کے موافق نہیں۔
افسانہ سنانے اور باتیں بنانے والے واعظ کی بات تو بڑی لمبی چوڑی ہوتی ہے لیکن اس کا مطلب بڑا گھٹیا ہوتا ہے)۔

اس سے قبل یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ اسلام و قرآن کا ظاہر اور باطن مختلف نہیں اس لئے شریعت اور طریقت کو ایک دوسرے کا دشمن اور مخالف قرار دینا ہرگز درست نہیں۔ اسلام و قرآن کا ظاہر اور باطن دونوں رحمت و ہدایت کے حامل ہیں۔ قرآنی احکام اور آئین اسلام میں باطنی معانی تلاش کرنا اور ان کو شریعت اسلامیہ سے مختلف خیال کرنا دراصل قرآنی تعلیمات کو غلط طور پر پیش کرنے کے مترادف ہے۔ قرآن سراسر روشنی، ہدایت، حقیقت، شفا، رحمت اور کامرانی کا سرچشمہ ہے۔ اس کا ظاہر بھی رشد و ہدایت کا سبب ہے اور اس کا باطن بھی۔ علامہ اقبالؒ اس موضوع پر اپنے گراں قدر خیالات کا ان الفاظ میں اظہار کرتے ہیں۔

در شریعت معنیٔ دیگر مجو
غیرِ ضَو در باطنِ گوہر مجو

ایں گہر را خود خدا گوہر گر است
ظاہرش گوہر بطونش گوہر است

علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست
اصلِ سنّت جزُ محبّت ہیچ نیست

ملّت از آئینِ حق گیرد نظام
از نظامِ محکمے خیزد دوام

قدرت اندر علمِ اُو پیدا ستے
ہم عصا و ہم یدِ بیضا ستے

با تو گویم سرِّ اسلام است شرع
شرع آغاز است و انجام است شرع

خستہ باشی استوارت می کند
پختہ مثلِ کوہسارت می کند

ہست دینِ مصطفیٰؐ دینِ حیات
شرعِ اُو تفسیرِ آئینِ حیات

(شریعت میں دوسرا مطلب تلاش مت کر، موتی کے باطن میں روشنی کے سوا کچھ اور مت ڈھونڈ
اس موتی (شریعت) کو خود خدا بنانے والا ہے، وہ ظاہر میں موتی ہے اور باطن میں بھی موتی ہی ہے
حقیقت کا علم (طریقت) شریعت کا مخالف نہیں، سنّتِ رسولؐ کی بنیاد محبّت کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔
مسلمان قوم خدائی آئین سے منظّم ہوتی ہے، محکم نظامِ حیات ہی کو دوام حاصل ہوتا ہے۔

شریعت کے علم میں طاقت موجود ہے، شرعی علم ہمارے لئے "عصا" بھی ہے اور "یدِ بیضا" بھی۔
میں تجھ سے کہتا ہوں کہ شریعت اسلام کا راز ہے، اسلام کا آغاز شریعت ہے اور انجام بھی شریعت ہے۔
اگر تو کمزور ہے تو شریعتِ اسلامیہ تجھے مضبوط بنا دے گی، پہاڑ کی مانند یہ تجھے پختہ کرے گی۔
دینِ محمدیؐ زندگی کا دستور العمل ہے، شریعتِ نبویؐ زندگی کے اصول کی تفسیر ہے)

(رموزِ بے خودی، ص۔ 128-126)

تاریخِ اسلام کے عمیق مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ظہورِ اسلام کے ابتدائی دَور میں قرآنی حقائق اور سیرتِ رسولؐ کے واقعات میں غیر اسلامی عقائد اور عجمی افکار کی آمیزش نہیں تھی لیکن جُوں جُوں زمانہ گذرتا گیا اور عرب مسلمان مکّہ معظّمہ اور مدینہ منوّرہ سے آگے بڑھے تو دیگر اقوام کے میل ملاپ اور اغیار کی سازشوں کی وجہ سے اسلام کی صاف ستھری تعلیمات اور حیات بخش تصوّرات کی شکل تبدیل ہونے لگی۔ عجمی تصوّرات اسلام کی تعلیمات کے تار و پود میں اس طرح شامل کئے گئے کہ اسلامی نظریات اور غیر اسلامی تصوّرات میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ مسلم تصوّف اپنے ابتدائی مراحل میں قرآن اور سنّتِ رسولؐ کے تابع تھا مگر بعد ازاں اس میں بھی عجمی عقائد اور رسومات کو جزوِ اسلام بنا کر پیش کر دیا گیا۔ علاّمہ اقبالؒ کے افکار کا سرچشمہ قرآن اور اسوۂ رسولؐ ہے وہ اسی نقطۂ نظر سے ہر ایک مکتبِ خیال کا جائزہ لیتے ہیں جس بات کو وہ قرآنی تعلیمات اور سیرتِ نبویؐ کے خلاف پاتے ہیں وہ بلاخوف اس پر تنقید کرنا اپنا ایمانی اصول سمجھتے ہیں۔ تصوّف اور طریقت کو بھی وہ اسی قرآنی معیار پر پرکھتے ہیں۔ ان کی رائے میں جب تک اسلام جزیرۃ العرب میں تھا اس میں حرارت اور حرکت کا عنصر شامل تھا لیکن جب یہ دیگر ممالک تک پھیلا تو اس میں عجمی خیالات شامل ہو گئے اور نتیجتاً "حقیقت خرافات میں کھو گئی" اور "یہ اُمّت روایات میں کھو گئی"۔ اس ضمن میں ان کے خیالات یہ ہیں۔

تا شعارِ مصطفیٰؐ از دست رفت
قوم را رمزِ بقا از دست رفت

پائے اُو تا وادیٔ بطحا گرفت
تربیت از گرمیٔ صحرا گرفت

آں چناں کاہید از بادِ عجم
ہمچو نےٓ گردید از بادِ عجم

آنکہ از تکبیرِ اُو سنگ آب گشت
از صفیرِ بُلبلے بیتاب گشت

شیخ احمدؒ سیّدِ گردوں جناب
کاسبِ نوُر از ضمیرش آفتاب

بامریدے گفت اے جانِ پدر
از خیالاتِ عجم باید حذر

(جب مسلمان قوم کے ہاتھ سے رسول کریمؐ کا اسوۂ جاتا رہا تو وہ بقا کا راز بھی کھو بیٹھی۔
جب تک مسلم قوم مکّہ کی وادی میں ثابت قدم رہی وہ صحرا کی گرمی سے تربیت پاتی رہی۔
وہ عجم کی آب وہوا سے اس قدر لاغر ہوگئی کہ وہ بانسری کی مانند بن گئی۔
جس قوم کی تکبیر سے پتھر بھی پانی ہو جاتا تھا وہ عجم میں پہنچ کر بلبل کی آواز سے بھی بیتاب ہوگئی۔
شیخ احمدؒ (رفاعی) ایک عظیم المرتبہ بزرگ تھے' سورج ان کے ضمیر سے کسبِ نور کرتا ہے۔
انہوں نے اپنے ایک مرید سے کہا "اے بیٹا! تجھے عجمی خیالات سے پرہیز کرنا چاہئے")۔

عجمی اور غیر اسلامی عقائد و نظریات کے اثرات صرف تصوّف و شریعت تک محدود نہیں بلکہ وہ ہر شعبۂ حیات میں دکھائی دیتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ ان کے ہمہ گیر اثرات کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

تمدّن' تصوّف' شریعت' کلام
بُتانِ عجم کے پُجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

لُبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذّتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سُلجھا ہُوا
لغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہُوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبّت میں یکتا' حمیّت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں' راکھ کا ڈھیر ہے

(بالِ جبریل' ص-124)

طریقت اور شریعت کے حامی خواہ مخواہ علمِ ظاہر اور علمِ باطن کے جھگڑے میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ اہلِ طریقت یا اہلِ تصوّف شریعت کے علم کو ظاہری علم اور تصوّف و طریقت کے علم کو باطنی قرار دیتے ہیں۔ ان

کی نگاہ میں علمِ باطن، علمِ ظاہر سے زیادہ اہم ہے۔ علاّمہ اقبالؒ نبیٔ اکرمؐ کے مکمل پیغام کو قرآن میں محفوظ خیال کرتے ہیں۔ وہ علمِ مخفی یا علمِ باطن کے عقیدے کو ختمِ نبوّت اور قرآنی ہدایت کی تکمیل کے منافی سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ خدا کے اس آخری نبیؐ نے خدا کا پورا پیغام مسلمانوں تک پہنچا دیا تھا اس لئے وہ کسی مخفی علم کو حضورؐ سے منسوب کرنا قرآنی اعلان کے خلاف تصوّر کرتے ہیں۔ وہ طریقت اور شریعت کو ایک ہی حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ ان کے روحانی مُرشد مولانا رومؒ کے یہ الفاظ شریعت اور طریقت کے باہمی تعلق پر بڑے اچھے انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں...... "شریعت ہمچو شمع است کہ راہ می نماید، چوں در راہ آمدی ایں رفتنِ تو طریقت است و چوں بہ مقصود رسیدی ایں رسیدنِ تو حقیقت است"۔ (مثنوی، دفترِ پنجم) (شریعت راستہ دکھانے والی شمع کی مانند ہے جب تو اس راہ میں آیا تیرا یہ چلنا طریقت ہے اور جب تو منزلِ مقصود تک پہنچ گیا تو تیرا یہ وہاں پہنچنا حقیقت ہے)۔

مولانا رومؒ کے اس قول کے مطابق خدا اور حقیقت ہماری زندگی کی منزلِ مقصود ہیں اس منزل تک جانے کے لئے ہمیں صحیح راستے اور راستے پر چلنے کے لئے روشنی کی اشد ضرورت ہے۔ صحیح راستے کے بغیر روشنی اور روشنی کے بغیر راستہ چنداں مفید نہیں ہو سکتے۔ منزلِ مقصود تک جانے کے لئے ان دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لئے مفید، مددگار اور لازمی ہے۔ دونوں کا حقیقت کے ساتھ گہرا اور باہمی ربط ہونا چاہئے۔ اس لحاظ سے شریعت اور اسلامی تصوّف یا طریقت ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہو سکتے۔

(۸) صحبتِ مُرشد یا مردِ کامل کی اطاعت

قرآنِ حکیم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے لئے مسلمانوں کو بار بار رسولِ خداؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے...... "لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ" (تمہارے لئے رسول اللہ بہترین اسوہ ہیں)۔ خاتمِ انبیاءؐ اور حبیبِ کبریاؐ کی اطاعت و تقلید ہی کو خدا کی اطاعت کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً "مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ" (جس نے رسولؐ کی اطاعت کی پس اس نے اللہ کی اطاعت کی)۔ اس لحاظ سے ہادیٔ اکبرؐ اور فخرِ جن و بشرؐ سب مسلمانوں کے لئے مُرشدِ اعظم اور راہنمائے کامل ہیں۔ رسول کریمؐ کا عہدِ ہمایوں اب ہماری نگاہوں سے اُوجھل ہو چکا ہے اور وہ بزرگ ہستیاں بھی موجود نہیں جنہوں نے نبیٔ اکرمؐ کی مبارک اور حیات بخش صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔ اپنوں کی لاپروائی اور غیروں کی دسیسہ کاریوں کے سبب موجودہ دَور کے مسلمانوں کا قرآن سے گہرا تعلق بھی نہیں رہا۔ ان حالات میں اگر اللہ کا کوئی نیک، مخلص، بے غرض، قرآنی تعلیمات سے آشنا اور عمل پرست بندہ ہمارا ٹوٹا ہوا رشتہ دوبارہ خدا، اس کے رسولؐ، قرآن اور اسلام سے صحیح انداز میں جوڑ دے تو ہمیں اس کی صحبت اور خدا پرستانہ باتوں سے فیض حاصل کرنا چاہئے۔ اس مردِ خدا کو ہم خدا اور

اسلام سے واصل کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ پائیں گے۔ جب تک ہم خود قرآن اور سیرت النبیؐ کا صحیح ادراک نہیں کرتے کم از کم اس وقت تک ہمیں اس سے درست فیض حاصل کرنے سے نہیں ہچکچانا چاہئے۔ اگر کوئی شخص علم اور زُہد و عبادت کے باوجود خود قرآنی تعلیمات اور حضورؐ کے مثالی کردار پر عمل نہیں کرتا تو اس کی صحبت اور پیروی ہمارے لیے ہرگز مفید اور ہدایت کا ذریعہ ثابت نہیں ہو سکتیں۔ قرآنی تعلیمات اور سنّتِ رسولؐ سے ہمیشہ گریزاں رہ کر دوسروں پر مدام تکیہ کرنا بھی قرآن و سنّت کے منشاء کے خلاف ہے کیونکہ قرآن و سنّت میں حصولِ علم پر بہت زور دیا گیا ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی دو احادیث یہاں بیان کی جاتی ہیں۔ طلبِ علم کی فرضیت مردوں اور عورتوں پر یکساں لاگو ہوتی ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے۔ "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَةٍ" (علم کا حاصل کرنا ہر ایک مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے"۔ دوسرا قولِ رسولؐ ملاحظہ ہو...... "اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ" (پنگوڑے سے لے کر قبر تک علم حاصل کرو)۔ اگر ہم اپنے دعوٰئ اسلام میں سچے ہیں تو پھر ہمیں اپنے ہادئ اعظمؐ کے ارشادات کے مطابق سب سے پہلے قرآن و سیرتِ نبویؐ کا علم حاصل کرنا چاہئے تاکہ ہمیں کوئی اسلام کے نام پر غلط راہ پر نہ چلا سکے۔ اسلام پر صحیح عمل کرنے کے لئے پہلے صحیح قسم کا علم ضرور ہونا چاہئے۔ علامہ اقبالؒ نے موجودہ مسلمانوں کے مذہبی حالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے خدا کے نیک بندوں اور اسلام پرست بزرگوں کا فیض حاصل کرنے کی تاکید کی ہے تاکہ ہمارے دلوں میں اطاعتِ خدا، اطاعتِ رسولؐ اور عشقِ مصطفیٰؐ کی شمع دوبارہ فروزاں ہو سکے۔ اس بارے میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

> "محبت کا دوسرا نام تقلید ہے لیکن یہاں عشق اور تقلید کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عاشق اپنے آپ کو معشوق کی ذات میں یا مقلد اپنے آپ کو مُرشد کی ذات میں کھو دے یا اس سے روحانی قوت مستعار لے کر مصنوعی تقویّت حاصل کر لے بلکہ یہ ہیں کہ وہ اس برتر شخصیت سے تکمیلِ خودی کا راز سیکھے اور خود اپنی قوتوں کو نشوونما دے کر اپنی شخصیّت یا خودی کو اُستوار کرے"

(ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر، از اقبال)
(ترجمہ از مولانا ظفر علی خان، ص۔ 17)

علامہ اقبالؒ اپنی ایک اور کتاب "اسرارِ خودی" میں مردِ خدا کے فیضِ صحبت اور اپنے رُوحانی مُرشد مولانا رومؒ کی زندگی کے ایک حیرت انگیز واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

کیمیا پیدا کُن از مُشتِ گِلے
بُوسہ زن بر آستانِ کاملے

شمع خود را ہمچو رومی برفروز
روم را در آتش تبریز سوز

(ص۔ 19-18)

(تُو خاک کی مٹھی (جسم) سے کیمیا پیدا کر اور کسی مردِ کامل کے آستانہ پر بوسہ دے۔
تُو رومیؒ کی طرح اپنی شمع کو روشن کر اور روم کو تبریز کی آگ میں جلا دے)۔

مولانا رومؒ تصوف و شریعت کے اَسرار و رمُوز سے واقف صوفی شاعر تھے جن کی مشہور کتاب "مثنوی" کو فارسی زبان میں قرآن تصور کیا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی اس شہرہ آفاق تصنیف میں قرآنی حقائق اور اسلامی عقائد کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ اپنے کتابی علم پر بڑا ناز کیا کرتے تھے جب ان کی ملاقات ایک خدا رسیدہ صوفی شمس تبریزی سے ہوئی تو مولانا رومؒ کی زندگی میں بہت بڑا روحانی اور ذہنی انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اب قال (گفتگو) کی منزل سے نکل کر حال (جذب و کیف) کی منزل تک جا پہنچے۔ چنانچہ مندرجہ بالا شعر میں علامہ اقبالؒ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ محض عقلی اور علمی طور پر لا الہ الا اللہ کہنا کافی نہیں بلکہ دل اور نگاہ کا مسلمان ہونا بھی ضروری ہے بقول اقبالؒ ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل؟
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مفکرِ اسلام اور ترجمانِ قرآن علامہ اقبال مرحوم و مغفور سرورِ کائناتؐ اور فخرِ موجوداتؐ کو کامل ترین ہستی، اعلیٰ فوق البشر عام عبد کی بجائے عبدہٗ (خدا کا بندۂ خاص)، رہبرِ اعظم اور عظیم ترین قافلہ سالارِ حیات خیال کرتے ہیں۔ وہ ان کو اطاعت و تقلید کا حقیقی مرجع اور عشق و محبت کا اصلی مرکز تصوّر کیے ہوئے ہیں ان کی تعلیمات اور اُسوۂ حَسنہ پر بر ضا و رغبت عمل کرنے کی بار بار تلقین کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار اس حقیقت کے شاہد ہیں۔

ہست معشوقے نہاں اندر دِلت چشم اگر داری بیا، بنمائمت
عاشقانِ اُو ز خوباں خوب تر خوشترو زیبا تر و محبوب تر
دل ز عشقِ اُو توانا می شود خاک ہمدوشِ ثریّا می شود
دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است

(اے مسلمان! تیرے دل میں ایک معشوق چھپا ہوا ہے۔ اگر تیرے پاس آنکھیں ہیں تو آ میں تجھے وہ معشوق دکھاؤں
اس کے عشاق دوسرے حسینوں سے زیادہ خوب، زیادہ خوبصورت اور زیادہ دلکش و محبوب ہیں۔

آپؐ کے عشق سے دل توانا ہوتا ہے اور خاک ثریا کی ہم پلہ ہو جاتی ہے۔
مصطفیٰؐ کا مقام مسلمان کے دل میں ہے۔ مصطفیٰؐ کے نام ہی سے ہماری عزت قائم ہے)۔
(اسرارِ خودی، ص۔ 18)

علامہ اقبالؒ کی رائے میں عشقِ محمدؐ سے کئی کیفیات پیدا ہوتی ہیں ان کا ہر ایک عاشق اپنی فکر اور اپنی استعداد کے مطابق اپنے جذبۂ عشق و محبت کا اظہار کرتا ہے۔ کوئی ان کی شانِ جمالی کا آئینہ دار ہے اور کوئی ان کی سطوت جلالی کا مظہر ہے۔ کسی میں عشقِ رسولؐ انفعال کی کیفیت کو جنم دیتا ہے اور کسی میں فعال کیفیت موجزن کر دیتا ہے۔ مفکرِ اسلام اور شاعرِ انسانیت حضرت علامہ اقبالؒ تقلید و اطاعت کو جذبۂ عشق کے لئے لازمی تصور کرتے ہوئے حضرت بایزید بسطامیؒ کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق ۔۔۔ ہست ہم تقلید از اسمائے عشق
کاملِ بسطام در تقلیدِ فرد ۔۔۔ اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد
عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار ۔۔۔ تا کمندِ تو شود یزداں شکار

(عشق کی شراب سے متعدد کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں، تقلید بھی اظہارِ عشق کا ایک نام ہے۔
بسطام کے ایک کامل (بایزیدؒ) نے ایک انسان (رسول کریمؐ) کی پیروی میں خربوزہ کھانے سے پرہیز کیا۔
کیا تو عاشقِ رسولؐ ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر اپنے محبوبؐ کی پیروی میں پختہ ہو جا تاکہ تُو خدا کو اپنی کمان کا شکار کر سکے)۔

(اسرارِ خودی، ص۔ 21)

حضرت بایزید بسطامیؒ دوسری صدی ہجری کے ایک مشہور صوفی اور عاشقِ رسولؐ تھے۔ وہ اپنے ہر کام میں نبی اکرمؐ کی پیروی کا خاص خیال رکھا کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے صرف اس وجہ سے خربوزہ کھانے سے پرہیز کیا تھا کہ انہیں معلوم نہیں کہ رسول کریمؐ نے خربوزہ کیسے کھایا تھا۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسی کامل پیروی کا نام عشق ہے۔

اقبالؒ کے کلام میں بزرگانِ دین سے محبّت و عقیدت کا ذکرِ جمیل بکثرت دکھائی دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے والدین خصوصاً ان کے والد کی دین داری اور صوفی منشی کا ان کی ابتدائی زندگی پر گہرا اثر پڑا تھا۔ یہ تو والدین کا غیر شعوری اور روایتی اثر قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اقبالؒ بعد ازاں بھی اسی روش پر گامزن رہے۔ یورپ میں آنے سے قبل اور وہاں سے واپسی پر یہ جذبہ شدید تر ہو گیا تھا۔ یہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا اس دور میں ان کا یہ عقیدہ شعوری رنگ اختیار کر گیا تھا یہ شعوری عقیدہ محض تقلیدی یا آبائی نہیں

تھا بلکہ اس میں ان کا وسیع مطالعہ و مشاہدہ داخل ہو چکا تھا۔ یورپ کی مادہ پرستی اور عقل پرستی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد انہیں اسلامی تعلیمات و عقائد سے مزید عشق ہو گیا مندرجہ ذیل شعر اس حقیقت کی یوں غمازی کرتا ہے۔

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

(یورپ کے حکماء کے درس نے میری عقل میں اضافہ کیا مگر اہلِ بصیرت کی صحبت نے میرے سینے کو روشنی عطا کی)

(پیامِ مشرق' ص۔ 145)

وہ ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

(بالِ جبریل)

خدا کے ان برگزیدہ' نیک طینت خلوص و محبت کے پیکر' عمل و حرکت کے پیامبر' انسانوں اور اہلِ بصیرت کی گوناگوں صفات اور خدا پرستی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اقبال نے بہت کچھ کہا ہے۔ ذیل میں چند اشعار بطور مشتے نمونہ از خروارے درج کئے جاتے ہیں تاکہ قارئین کرام خود اس موضوع کی اہمیت و افادیت کا جائزہ لے سکیں۔

چھپایا حُسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے
وہی ناز آفرین ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں؟

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی' ارادت ہو تو دیکھ انکو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

(بانگِ درا' ص۔ 104)

الٰہی! سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیا!
کہ اِک نظر سے جوانوں کو رام کرتے ہیں

(بانگِ درا، ص۔ 139)

غلامِ زندہ دِلانم کہ عاشق سرہ اند
نہ خانقاہ نشیناں کہ دل بہ کس ندہند
بروں ز انجمنے درمیانِ انجمنے
بہ خلوت اند ولے آنچناں کہ باہمہ اند

(میں زندہ دل انسانوں یعنی سچے عاشقوں کا غلام ہوں نہ کہ بے عشق خانقاہ نشینوں کا۔
یہ عاشقانِ صادق محفل سے باہر رہ کر بھی محفل میں ہوتے ہیں، اگرچہ وہ خلوت گزیں ہیں تاہم وہ سب کے ساتھ ہیں)

(زبورِ عجم، ص۔ 69)

دیں نگردد پختہ بے آدابِ عشق
دیں بگیر از صحبتِ اربابِ عشق

(عشق کے آداب کے بغیر دین پختہ نہیں ہوتا، تو دین کو اربابِ عشق کی صحبت سے اختیار کر)

(جاوید نامہ، ص۔ 112)

صد کتاب آموزی از اہلِ ہنر
خوشتر آں درسے کہ گیری از نظر
ہر کسے زاں مے کہ ریزد از نظر
مست مے گردد باندازِ دگر
شیوۂ اخلاص را محکم بگیر
پاک شو از خوفِ سلطان و امیر

(تو اہل ہنر سے سینکڑوں کتابیں سیکھتا ہے لیکن ان سے وہ سبق زیادہ اچھا ہے جسے تو نظر سے حاصل کرے
نظر سے چھلکنے والی شراب پی کر ہر شخص اپنے انداز کے مطابق مست ہو جاتا ہے۔
تو اخلاص کے شیوہ کو مضبوطی سے پکڑ اور بادشاہ اور امیر کے ڈر سے دُور رہ)

(جاوید نامہ، ص۔ 203)

حدیثِ دل کسی درویشِ بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ
اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی' نہ محبت' نہ معرفت' نہ نگاہ
(بالِ جبریل 'ص۔ 46)

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لاالٰہ میں ہے
(بالِ جبریل 'ص۔ 68)

علامہ اقبالؒ اس پیرو مرشد کی اطاعت و صحبت کو پسند نہیں کرتے جو انقلاب آفریں اور ہنگامہ خیز شخصیت کا مالک نہ ہو۔ اسلام کی تعلیمات تو دراصل دل و دماغ میں زبردست انقلاب پیدا کر کے باطل نظریات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے پر زور دیتی ہیں اس لئے صحیح روحانی رہنما بھی انقلاب پرور جذبات و خیالات کی تخلیق و ترویج کا باعث ہو گا۔ علامہ اقبالؒ کی زبانی یہ پیغام سنئے۔

حذَر زبیعتِ پیرے کہ مردِ غوغا نیست (پیامِ مشرق 'ص۔ 159)

(اس پیرو مرشد کی بیعت و اطاعت سے پرہیز کرو جو انقلاب آفرین نہ ہو)

اقبالیات سے گہرا لگاؤ رکھنے والے اس امر سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ علامہ اقبالؒ مولانا رومؒ کی پُرکشش شخصیت اور ان کے قرآنی نظریات سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ وہ اپنے آپ کو "مریدِ ہندی" اور مولانا رومؒ کو پیرِ رومیؒ کہتے ہیں۔ رومیؒ سے ان کی گہری محبت و عقیدت کا اصل سبب یہ ہے کہ مولانا رومؒ نے قرآنی تعلیمات 'اسلامی نظریات اور جذبۂ عشقِ رسولﷺ کو بڑے مؤثر' مدلّل اور دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ رومیؒ کو اپنا مرشد و رہنما اس لئے قرار دیتے ہیں کہ رومیؒ انہیں خدا پرستی 'عشقِ رسولﷺ اور اسلام کے حقائق سے آشنا کرتا ہے۔ جن مختلف زاویوں سے وہ مولانا رومؒ کو دیکھتے ہیں 'ان کی چند جھلکیاں درجِ ذیل ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

شعلۂ در گیر زد برخس و خاشاکِ من
مرشدِ رومیؒ کہ گفت "منزلِ ما کبریا است"

(مرشد رومیؒ نے کہا تھا "ہماری منزلِ مقصود خدا ہے" ان کے اس قول نے میری خس و خاشاک کو شعلہ زن کر دیا ہے)

(پیامِ مشرق 'ص۔ 171)

پیرِ رومیؒ آں امامِ راستاں
آشنائے ہر مقامِ راستاں
(پیرِ رومیؒ راستباز انسانوں کے امام اور حقیقت پسند لوگوں کے مقام سے آشنا ہیں)
(جاوید نامہ، ص۔ 141)

علاج آتشِ رومیؒ کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں
(بالِ جبریل، ص۔ 28)

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہُوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بہ جیب ہوں ایک کلیم سربکف
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف
(بالِ جبریل، ص۔ 40-39)

پیرِ رومیؒ مرشدِ روشن ضمیر
نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش
کاروانِ عشق و مستی را امیر
جامِ جمؔ شرمندہ از آئینہ اش
(پیرِ رومیؒ روشن ضمیر مرشد ہیں، وہ عشق و مستی کے قافلہ سالار ہیں۔
ان کے سینے میں قرآن کا نور موجود ہے، جمشید کا پیالہ ان کے آئینۂ دل سے شرمندہ ہے)

(۹) خودی

خودی ایک ایسا اہم موضوع ہے جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے بہت کچھ کہا ہے۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے اپنی نثر میں بھی اس کے گوناگوں پہلوؤں پر بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ وہ خود کو ہر چیز اور نظریۂ حیات کی کسوٹی قرار دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں فلسفہ، اخلاق، مذہب، دین، سیاست اور علم و

فن کی قدر و قیمت کا صحیح معیار خودی ہی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں۔

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی رگرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
(ضربِ کلیم، ص۔ 100)

"خودی" سے وہ خود بینی اور تکبر مراد نہیں لیتے ہیں بلکہ وہ اس لفظ کو "نقطۂ نورے" کہتے ہیں جس کی اصل مادی نہیں بلکہ روحانی ہے۔ عام طور پر وہ اس کو خودنگری، شعورِ ذات اور معرفتِ نفس کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ خدا کی ذات کو وہ "انائے مطلق" اور انسانی ذات کو وہ "انائے محدود" کہتے ہیں۔ وہ اس تصوّف و معرفت کو قابلِ تحسین اور اہم خیال کرتے ہیں جو ہماری ذات اور خودی کے استحکام اور بقاء کیلئے مفید اور مدد گار ثابت ہو سکیں۔ وہ انسانی ذات یا انسانی خودی کو مٹانے یا اسے خدا کی ذات میں مکمل طور پر فنا کر دینے کی بجائے اسے برقرار رکھنے اور خدائی صفات کے رنگ میں رنگنے کے زبر دست حامی ہیں۔ علامہ اقبالؒ اسی لئے انسانیت کش رہبانیت، زندگی سے گریز سکھانے والے فلسفہ و ادب اور خودی کو ہلاک کرنے والے تصوّف کو قرآنی تعلیمات کے منافی خیال کرتے ہوئے انہیں ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔ وہ اسلامی تصوّف کو خودی کی تعمیر و تشکیل کے لئے اہم اور مفید اور عجمی تصوّف کو انسانی ذات کی ہلاکت کا موجب سمجھتے ہوئے کہتے ہیں۔

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سجود
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
(ضربِ کلیم، ص۔ 34)

علامہ اقبالؒ نے تصوّف و معرفت کے حوالے سے خودی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کے چند اہم پہلو نیچے درج کئے جاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

پیکرِ ہستی ز اسرارِ خودی است
ہر چہ مے بینی ز اسرارِ خودی است
وا نمودن خویش را خوئے خودی است
خفتہ در ہر ذرّہ نیروئے خودی است

چوں حیاتِ عالَم از زورِ خودی است
پس بقدرِ استواری زندگی است
(اسرارِ خودی، ص۔ 12)

(زندگی کا پیکر خودی کے رازوں میں سے ایک راز ہے، تو جو کچھ دیکھتا ہے وہ خودی ہی کا راز ہے۔
اپنی ذات کا اظہار کرنا خودی کی عادت ہے، ہر ایک ذرّہ میں خودی کی طاقت پوشیدہ ہے۔
چونکہ دنیا کی زندگی خودی کے زور سے ہے اس لئے مضبوطی کے مطابق ہی زندگی ہے)۔

کیا یہ امر مسلّمہ نہیں کہ انائے مطلق یا انائے لامحدود (خدا) نے اپنی صفات کے اظہار کے لئے دنیا و مافیہا کو تخلیق کر کے اپنے حسُن و جمال کو بے نقاب کر دیا ہے؟۔ خودی جس قدر زیادہ مضبوط ہو گی اسی قدر زندگی میں حسُن پیدا ہو گا۔ علاّمہ اقبال مرحوم و مغفور تصوّف، طریقت اور معرفت کو بھی اسی پیمانے سے ناپتے ہیں۔ خودی، زندگی اور استحکام کے خلاف جو صوفیانہ تصوّر ہو وہ اس کی پُرزور الفاظ میں مذمت کرتے ہیں۔

خودی کو استحکام عشق و محبت سے ملا کرتا ہے۔ کسی معمولی چیز یا ہستی کی محبّت معمولی قسم کی خودی کی قوت کا باعث ہوتی ہے لیکن اس کے برعکس کسی اعلیٰ نصب العین اور عظیم ہستی کی محبّت خودی کا درجہ بھی عظیم بنا دیا کرتی ہے۔ اس حقیقت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے مفکرِ اسلام اور شاعرِ انسانیت علاّمہ اقبالؒ ہمارے دل و دماغ میں خدا، اس کے رسولؐ، قرآن، اسلام اور دیگر بلند مقاصد کی محبّت کو جاگزیں بنانے کے خواہاں ہیں تاکہ ہم اپنی خودی کو مضبوط بنا کر فطرت کی طاقتوں کو مسخر کر سکیں۔ مظاہرِ قدرت کی اس تسخیر کا مدعا عالمی تباہ کاریوں کی بجائے بنی نوعِ انسان کی خدمت ہے۔ جب انسانی خودی (انائے محدود) اطاعتِ الٰہی، عشقِ رسولؐ اور ضبطِ نفس کے مراحل سے گذر کر نیابتِ خداوندی کی منزل تک پہنچ جاتی ہے تو پھر اس میں معجزہ نما قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جب انسانی خودی اپنے اندر خدائی صفات کا رنگ پیدا کر کے اس قدر بلند ہو جاتی ہے تو پھر خدا خوش ہو کر اس کی رضا کا طالب ہو جاتا ہے۔ علاّمہ اقبالؒ خودی کی اس عظمت و منزلت کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

از محبّت چوں خودی محکم شود
قوّتش فرماں دہِ عالَم شود
پنجۂ اُو، پنجۂ حق مے شود
ماہ از انگشتِ اُو شق مے شود

(خودی جب محبت سے مضبوط ہو جاتی ہے تو پھر دنیا اس کی قوت کے سامنے مطیع ہو جاتی ہے۔
اس کا پنجہ خدا کا پنجہ ہو جاتا ہے اور چاند اس کی انگلی سے شق ہو جاتا ہے) (اسرارِ خودی ص ۲۵)

مندرجہ بالا آخری شعر میں نبی اکرمؐ کے معجزۂ شق القمر کی طرف اشارہ ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ یہ ہیں "تلمیح ہے معجزۂ شق القمر کی طرف"۔ ایک حدیثِ قدسی ہے کہ جب اللہ کا کوئی بندہ خدا کی اطاعت میں کامل ہو جاتا ہے تو پھر اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ اور اس کی زبان اللہ کی زبان بن جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے عاشقِ صادق اور مطیع انسان کا کوئی بھی فعل اپنا فعل نہیں ہوتا بلکہ اس کا ہر کام خدا کی مرضی اور حکم کے مطابق ہوتا ہے۔ علاّمہ اقبالؒ اس بات کو یوں شعر کا جامہ پہناتے ہوئے کہتے ہیں ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

تصوّف کے بعض مکاتبِ فکر انسانی خودی یا انسانی ذات کو غیر حقیقی اور غیر اہم خیال کرتے ہوئے اسے مٹانے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کا مطمعِ نظر اپنی ذات کو خدا کی ذات میں گم کر دینا اور اس سے واصل ہو جانا ہے۔ علاّمہ اقبالؒ کو اس تصوّر سے کلّی اتفاق نہیں کیونکہ وہ انسانی وجود کو غیر حقیقی اور غیر اہم نہیں سمجھتے۔ قرآنی تعلیمات کی رو سے یہ کائنات "بالحق" تخلیق کی گئی ہے۔ یہ کوئی سراب، فریبِ نظر یا واہمہ نہیں بلکہ اس کی حقیقت اور اہمیت کو قرآن تسلیم کرتا ہے اس میں کوئی شک نہیں خدا کے مقابلے میں اس کی حقیقت ثانوی ہے۔ اس کا وجود خالقِ کائنات کی صفتِ تخلیق کا مرہونِ منت ہے۔

بدھ مت، ہندومت، عیسائیت اور بعض یونانی مفکّرین کے نظریات کی رو سے یہ دنیا اور انسان کا وجود خدا کی راہ میں عظیم رکاوٹ ہیں اس لئے انہیں مٹانا اور انسانی خواہشات کو کچل ڈالنا سب سے بڑا نیک کام ہے۔ اقبالؒ خودی کو مکمل طور پر مٹانے کی بجائے اسے خدائی صفات کے رنگ میں رنگنے، خدا کا مطیع ہونے اور اسے برقرار رکھنے کی بار بار تلقین کرتے ہیں۔ ان کی یہ تلقین قرآنی تعلیمات کی عکّاس اور ارشاداتِ نبویؐ کی مظہر ہے۔ اس بارے میں ان کے تصوّرات ملاحظہ ہوں۔ وہ فرماتے ہیں ؎

اے کہ مثلِ گُل ز گِل بالیدۂ
تُو ہم از بطنِ خودی زائیدۂ

از خودی مگذر، بقا انجام باش
قطرۂ می باش و بحر آشام باش

تُو کہ از نورِ خودی تابندۂ
گر خودی محکم کنی، پائندۂ

(اے مخاطب! تو پھول کی مانند مٹی سے نشوونما پا کر بڑھا ہے تو بھی خودی کے شکم سے پیدا ہوا ہے۔
تو اپنی خودی کو ترک مت کر اور بقا حاصل کر، تو قطرہ رہ کر سمندر کو پینے والا بن جا۔

تو خودی کے نور سے روشن ہے' اگر تو خودی کو مضبوط کر لے تو پھر تو پائندہ ہو جائے گا)۔
(اسرارِ خودی' ص۔ 65)

انسان کی حیثیت   ایک قطرۂ ناچیز کی سی ہے لیکن اس کا وجود تو مسلّمہ ہے اگر وہ اپنی ہستی کو مٹا ڈالے تو پھر وہ قطرہ نہیں رہتا۔ اگر وہ قطرہ رہ کر سمندر سے گہرا تعلق رکھے تو پھر وہ سمندر سے بھی فیض یاب ہو سکے گا۔ انسان قطرہ ہے اور خدا محیطِ بیکراں۔ سمندر سے مربوط رہ کر اس میں بھی وسعت اور عظمت کی شان جلوہ گر ہو سکتی ہے۔ علاّمہ اقبالؒ انسان (قطرۂ آبجو یعنی محدود خودی) اور خدا (محیطِ بیکراں یعنی غیر محدود خودی) کے باہمی ربط کا بڑے ہی دلنشین' فلسفیانہ اور صوفیانہ انداز میں ذکر کرتے ہیں' وہ خدا سے کہتے ہیں۔

تُو ہے محیطِ بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

عالمِ اسلام کی یہ نابغہ شخصیت صوفیاء اور عرفاء کو نورِ خودی سے خدا کو دیکھنے کا مخلصانہ مشورہ دیتے ہوئے یوں مخاطب ہوتی ہے۔

زمن گو صوفیانِ با صفا را
خدا جویانِ معنی آشنا را
غلامِ ہمتِ آں خود پرستم
کہ با نورِ خودی بیند خدا را (پیامِ مشرق ص ۷۰)

(میری جانب سے صاف دل صوفیوں اور حقیقت شناس طالبانِ خدا کو کہہ دے کہ
میں اس خودی پرست انسان کی ہمت کا غلام ہوں جو اپنی خودی کے نُور سے خدا کو دیکھتا ہے)

خودی کے استحکام اور بلندی کا معیار یہ ہے کہ وہ انسان کو مقامِ پادشاہی' نیابتِ الٰہی' رضائے ایزدی' تسخیرِ کائنات' بقائے دوام اور عروج و کمال کا حامل بنا دے۔ اگر خودی ہمیں یہ صفات عطا نہیں کرتی تو پھر وہ خودی پختہ اور کامل نہیں کہلا سکتی۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے "اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْن" (اگر تم مومنین ہو تو پھر تم ہی غالب و اعلیٰ رہو گے) اگر ہمارا ایمان پختہ نہیں تو پھر زبانی دعوئ ایمان کے باوجود ہم دنیا و دین کی سرفرازی حاصل نہیں کر سکتے۔ خدا کا یہ وعدۂ برحق صرف ان ایمان والوں کے لئے ہے جو "اقرارٌ باللسان" (زبانی اقرار) کے ساتھ "تصدیقٌ بالقلب" (دِلی تصدیق) اور عملِ صالح کے بھی مالک ہوں گے۔ اسلام کا پیغام ہر قسم کے باطل نظریات کے لئے پیغامِ موت ہے۔ اس کے ماننے والوں میں بھی یہی انقلابی جذبہ موجود ہونا چاہئے۔ اسلام و ایمان کا دعویٰ اور دنیا میں ذلت و خواری یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ اب علاّمہ اقبالؒ کی زبان سے خودی کی عظمت و افادیت کا راز سنئے۔ وہ فرماتے ہیں۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صُبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو رُوسیاہی
(بالِ جبریل ص۔ 45)

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کُھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

عشقِ رسولؐ

اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے کہ عشقِ مصطفےٰؐ کا جذبہ نہ صرف علامہ اقبالؒ کی ذات کا لازمی جزو بن چکا تھا بلکہ انہوں نے اپنی تصانیف اور تقاریر میں کئی جگہ اس کا بڑے والہانہ اور خیال افروز انداز میں ذکر کیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں بار بار اطاعتِ رسولؐ کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کی اطاعت کو در حقیقت خدا کی اطاعت کا نام دیا گیا ہے کیونکہ خدا کے احکام اور مشیت کا علم ہمیں ان کی معرفت ہی نصیب ہوا ہے۔ اگر آنحضرتؐ کا وجود نہ ہوتا تو ملّتِ اسلامیہ بھی معرضِ وجود میں نہ آتی۔ کیا یہ مسلّمہ امر نہیں ہے کہ اطاعت کرنے کے لئے مطیع کے دل میں اطاعت کروانے والے کی محبت پہلے لازمی ہوا کرتی ہے؟۔ ہم اسی کی پیروی بہ دل و جان کیا کرتے ہیں جس کی شخصیت، عادات و اطوار اور محاسن سے ہم متاثر ہوں اور اس سے ہمیں محبت بھی ہو۔ ہم اپنے دشمنوں اور غیر جاذب شخصیات کی کبھی بھی برضا و رغبت پیروی کرنے پر مائل نہیں ہوتے۔ انسانی فطرت کے اس تسلیم شدہ امر کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ہماری فطرت کے خالق نے سب سے پہلے ہمیں اپنے محبوب نبیؐ کی ذات والا صفات کے اسوۂ حسنہ، مقامِ رفیع اور محاسن سے آگاہ کیا ہے تاکہ ہم ان کی شخصیت اور اعلیٰ کردار سے متاثر ہو کر ان کی محبت و تقلید پر خود بخود مائل ہو جائیں۔ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ خدا کی محبت کا راز ہادیٔ اعظمؐ اور محسنِ انسانیتؐ کی مکمل پیروی میں پنہاں ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ" (اے محبوبؐ فرما دیجئے! اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اس طرح اللہ تم کو اپنا محبوب بنا لے گا)۔ نبیؐ آخر الزمانؐ اور رسولِ انس و جانؐ کی اطاعت اس لئے اللہ کی اطاعت کے مترادف ہے کہ ان کا قول خدا کے قول کا ترجمان ہوتا ہے۔ کلام اللہ کے مطابق ان کا پیغام دراصل پیغامِ خدا ہے۔ قرآنی ارشاد ملاحظہ ہو۔ "وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی" (رسولؐ اپنی مرضی سے بات نہیں کرتے۔ ان کی بات دراصل وحیٔ الٰہی ہوتی ہے)۔ غالب نے اس حقیقت کو بڑے ہی دلنشین طریق پر یوں کہا ہے۔ ؎

حق جلوہ گر زطرزِ بیانِ محمدؐ است   آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است

(حق حضرت محمدؐ کے طرزِ بیان سے جلوہ گر ہے ۔ یہ درست ہے کہ زبانِ محمدؐ پر حق کی گفتگو ہوتی ہے)

کائنات کی آفرینش کا مقصد بھی آپؐ کی ذاتِ ستودہ صفات ہے۔ علاوہ ازیں آپؐ کا اسوۂ حسنہ ہمارے لئے بہترین نمونۂ عمل قرار دیا گیا ہے جیسا کہ خدا نے خود فرمایا ہے۔ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" ۔ (بیشک رسولؐ اللہ میں تمہارے لئے بہترین طرزِ عمل ہے) ۔ علامہ اقبالؒ نے عشقِ رسولؐ اور اتباعِ رسولؐ کے مختلف گوشوں پر اپنے مخصوص فلسفیانہ، شاعرانہ اور مومنانہ انداز میں کافی روشنی ڈالی ہے۔ عشقِ رسولؐ ان کے فلسفۂ خودی کے مبادیات میں سے بھی ہے۔ علامہ اقبالؒ عشقِ رسولؐ اور تقلیدِ رسولؐ کو ہر مسلمان کی زندگی اور ایمان کا مرکز و محور خیال کرتے ہیں۔

(بالِ جبریل، ص۔ 56)

انہوں نے اپنی شاعری اور نثر پاروں میں اس موضوع کو بڑے ولولہ انگیز، پُرسوز اور خیال آفریں انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کی نثر و نظم سے مندرجہ ذیل مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ وہ اپنی ایک ابتدائی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

خام کاروں کو عشق خود فراموشی اور از خود رفتگی سکھاتا ہے؟ مگر پختہ کاروں کو خود شناسی اور خودداری کا سبق دیتا ہے۔

تُرا از خود ربود و چشمِ تر داد
مرا با خویشتن نزدیک تر کرد"

(عشق نے تجھے بے خود بنا دیا اور تجھے چشم نمناک دی لیکن اس نے مجھے اپنی ذات سے زیادہ قریب کر دیا)۔

(ملتِ بیضا پر ایک نظر، اقبالؒ، ترجمہ از مولانا ظفر علی خان، ص۔ 17)

علامہ اقبالؒ جذبۂ عشق و اطاعت کے ذریعے مسلمانوں کے اندر معرفتِ نفس اور خودنگری کی صفت پیدا کرنے کے زبردست خواہشمند تھے تاکہ وہ بھی نبیؐ اکرمؐ کی پیروی کرتے ہوئے نہ صرف اپنی موجودہ بدحالی کو دُور کریں بلکہ وہ دوسرے انسانوں کی زندگیوں میں بھی انقلاب پیدا کر سکیں۔ دوسرے انسانوں کے اہم معاملات اور معاشرتی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو کر محض بے خود رہنا قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اسلام تو ایک ہمہ گیر اور حیات پرور انقلاب کا نام ہے جو زندگی کی تمام سماجی، اقتصادی، اخلاقی، سیاسی اور ذہنی تاریکیوں کو روشنی میں بدل دیا کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ عشقِ رسولؐ اور اتباعِ رسولؐ کو اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرنے کے حامی ہیں۔ ان کی نظر میں مسلمانوں کے عظیم ترین اور مثالی قافلہ سالار صرف رسولِ کریمؐ کی ذات بابرکات ہے۔ وہ مسلمانوں کو ان کی عظمت و اہمیت سے روشناس کراتے ہوئے کہتے ہیں:

ہست معشوقے نہاں اندر دِلت
چشم اگر داری بیا بنمائمت
دل ز عشقِ اُو توانا می شود
خاک ہمدوشِ ثریّا می شود
خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

(اسرارِ خودی ص 19)

(تیرے دل کے اندر ایک معشوق نہاں ہے، اگر تیرے پاس آنکھیں ہیں تو آ میں تجھے دکھاؤں۔
اس کے عشق سے دل توانائی پاتا ہے اور خاک ثریّا کی ہم مرتبہ بن جاتی ہے۔
مدینہ منوّرہ کی سرزمین دو جہانوں سے زیادہ محبوب ہے، وہ شہر مبارک ہے جہاں اپنا دلبرؐ ہے)۔

جذبۂ عشقِ رسولؐ اور اتباعِ نبویؐ کی ملی اہمیّت و افادیّت کے علاوہ وہ انہیں اپنی ذات کی تکمیل و تعمیر کا ضروری جزو گردانتے ہیں۔ علّامہ اقبالؒ کی ذاتی زندگی کے لاتعداد واقعات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ رسالت مآبؐ کا نامِ نامی اور اسمِ گرامی سنتے ہی ان کی حالت عجیب ہو جاتی تھی۔ ان کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں اور ان پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ انہوں نے عشقِ رسولؐ کے ذاتی جذبات و کیفیّات کو بڑے ہی پُرسوز، رِقّت انگیز اور خیال پرور طریقے سے بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کہا اور لکھا ہے اس کو قرآنِ حکیم کی روشنی میں خوب پرکھا ہے۔ وہ قرآنی تعلیمات ہی کو خیر و شر اور قومی عروج و زوال کا معیار سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے جذبۂ عشقِ رسولؐ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

گر دِلم آئینۂ بے جوہر است
ور بہ حرفم غیرِ قرآں مضمر است
تنگ کُن رختِ حیات اندر بَرَم
اہلِ ملّت را نگہدار از شرم
روزِ محشر خوار و رسوا کُن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کُن مرا

(اگر میرے دل کا آئینہ بے جوہر ہے اور اگر میری بات میں قرآن کے علاوہ کچھ اور پوشیدہ ہے تو میرا جامۂ زندگی میرے جسم میں تنگ کر دیجیے اور ملّتِ اسلامیہ کے افراد کو میرے شر سے محفوظ کر لیجیے اے رسولِ ہاشمیؐ! آپ قیامت کے دن مجھے ذلیل کر دیجیے اور سزا کے طور پر مجھے اپنے پاؤں کے بوسہ سے بھی محروم کر دیجیے)

(رموزِ بے خودی، ص۔ 168)

وہ شخص جو اپنی زندگی کا حاصل اور اپنے ایمان و فکر کی اساس جذبۂ رسولؐ کو خیال کرے اور جس کی آنکھیں نامِ مصطفیٰؐ سنتے ہی اشکبار ہو جائیں اس کے لئے مندرجہ بالا اشعار کی بددُعا اور بدنصیبی کا بُرا انجام بآسانی تصوّر کیا جاسکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے اس واضح اعلان اور برملا اظہارِ عقیدہ کے باوجود اگر چند مخالفین اور ناقدین انہیں مغربی افکار و نظریات کا کامل خوشہ چین کہتے ہیں تو ان کی جہالت، بدنیتی، تعصّب، مغرب نوازی اور لادینیت کا راز فاش ہو جاتا ہے۔ علاّمہ مرحوم آنحضرتؐ کے بلند ترین مقام اور ان کی پُرکشش شخصیت کے بارے میں فرماتے ہیں۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں، بُت کدۂ تصوّرات

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق.
معرکۂ وجود میں بدر و حُنین بھی ہے عشق
(بالِ جبریل، ص۔ 112)

لَوح بھی تُو، قلم بھی تُو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب

شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ، تیرا جمالِ بے نقاب

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب
(بالِ جبریل، ص۔ 113)

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اُوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بُولہبی است

(تو اپنے آپ کو بارگاہِ مصطفویؐ میں پہنچادے کیونکہ وہ سراپا دین ہیں اگر تو ان تک نہ پہنچا تو تیرا سب کچھ بولہبی ہے)۔

قرآنِ حکیم کی تعلیمات اور احادیثِ نبویؐ کے مطابق حضرت محمدؐ ہماری اطاعت و محبّت کا مرکز ہیں۔ ان کی اطاعت درحقیقت اطاعتِ خدا ہو گی اور جو شخص رسولِ خدا اور خدا کے احکام کی برضا و رغبت

پیروی کرے گا وہ ان کا محبوب بن جائے گا۔ کیا یہ مسلّمہ حقیقت نہیں کہ ہر عاشقِ صادق اپنے محبوب کی جائز خواہش کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا؟ جب ایک بندۂ مومن اپنی زندگی، موت، نماز اور ہر قسم کی قربانی کو خدا کے لئے وقف کر دے گا اور مکمل اطاعت کی بنا پر اس کی مرضی خدا کی مرضی ہو جائے گی تو پھر کائنات بھی اس بندۂ مومن کی مطیع و خادم بن جائے گی۔ خدا کے آخری اور سچے نبیؐ کی اطاعت شدید جذبۂ محبت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ علاّمہ اقبالؒ مسلمانوں کے دل و دماغ میں اطاعتِ رسولؐ سے پہلے عشقِ رسول کی شدید لگن پیدا کرنے کی بے حد کوشش کرتے ہیں۔ یہی وہ سچا اور شدید جذبہ ہے جو مومن کو خدا کے خوف کے علاوہ ہر چیز کے خوف اور لالچ سے بے نیاز کر کے اس کے اندر جرأتِ رندانہ، شوقِ شہادت، عمل پرستی، ایمانِ محکم، غیر متزلزل یقین اور تسخیرِ کائنات کی اعلیٰ صفات پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے عزمِ راسخ، یقینِ محکم اور بے مثال بہادری کے سبب اسے دنیا و دین کی سرفرازیاں اور شاد کامیاں نصیب ہو جاتی ہیں۔ علاّمہ اقبالؒ کی زبانی یہ رجائیت آمیز اور انقلاب خیز پیغام سنئے۔ وہ کہتے ہیں۔

ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ سامانِ اُوست
بحر و برَ در گوشۂ دامانِ اُوست

(جس کسی نے عشقِ محمدؐ کو اپنا سامان بنالیا تو پھر اس کے دامن کے گوشے میں بحر و بر آجاتے ہیں)۔
(پیامِ مشرق، ص۔ 20)

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لَوح و قلم تیرے ہیں
(بانگِ درا)

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیَر
بہ حق دل بند و راہِ مصطفیٰؐ رَو

(اگر تو اس دَیر میں اپنا مقام چاہتا ہے تو پھر تو اپنے دل کو خدا سے آباد کر اور رسول کریمؐ کے راستے پر چل)
(ارمغانِ حجاز، ص۔ 65)

اقبالؒ اور مشہور صوفیاء کا تذکرہ

علامہ اقبالؒ کو خدا تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہوا تھا۔ وہ نہ صرف اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے مالک تھے بلکہ ان کی ذات میں متعدد قلبی اور روحانی کمالات بھی جمع ہو گئے تھے۔ وہ نہ صرف مغربی اور مشرقی علومِ ظاہری سے آشنا تھے بلکہ وہ علمِ باطن کے اسرار و حقائق کے بھی معترف اور مدّاح تھے۔ اگر ایک طرف وہ شریعت کے غوامض پر گہری نظر رکھتے تھے تو دوسری طرف وہ تصوّف و معرفت کے بھی قدر دان تھے۔ ان کی ذہنی اور قلبی کیفیاّت و واردات کا یہ حسین امتزاج اور اعتدال اہلِ خرد کے لئے بھی باعثِ کشش تھا اور اربابِ طریقت کے لئے بھی چونکہ وہ عقل و عشق اور شریعت و طریقت کے درمیان گہرے ربط اور باہمی تعاون کے حامی تھے اس لئے وہ کسی افراط و تفریط کا شکار نہ ہو سکے۔ ان کی شاعری میں اگر شعراءُ، فلاسفہ، مفکّرین، سیاستدانوں اور سائنس دانوں کا ذکر ملتا ہے تو اس کے ساتھ ہی ان کی محفلِ شعر و سخن میں ہمیں جیّد اور شہرت یافتہ صوفیاء، عرفاء اور مصلحین بھی بڑی شان و تمکنت سے جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں نہ صرف اقبالؒ کی شعری تصانیف بلکہ ان کی نثری تخلیقات میں بھی کئی بزرگانِ دین، محسنینِ انسانیت اور بلند مرتبہ عارفین کی پاکیزہ زندگی کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ کی صحیح بزرگانِ دین اور انقلاب پرور صوفیاء سے گہری محبت اور عقیدت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ انسانیت ساز کارناموں کی عظمت و اہمیت کے زبردست حامی تھے۔ اس بات میں کوئی شائبہ نہیں کہ وہ عمل پرست، اسلام دوست اور انقلاب آفریں صوفیاء کو بے عمل زاہدوں، حقیقت ناشناس گوشہ نشینوں، دین فروش عالموں، خیال

پرست فلسفیوں اور مُردہ ضمیر شاعروں پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کسی فلسفی یا مفکر کا پیرو کار قرار نہیں دیتے لیکن وہ علی الاعلان رومیؒ کو اپنا پیرو مرشد تسلیم کرنے پر فخر کرتے ہیں۔ رومیؒ سے ان کی شیفتگی محض اسلام دوستی اور جذبۂ عشقِ رسولؐ کی بنا پر ہے۔ اس امر سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اسلام، قرآن، اطاعتِ خدا اور اتباعِ رسولؐ کے حامیوں اور مبلغوں کی کس قدر اپنے دل میں محبت رکھتے تھے۔ وہ عقل و خرد کی گتھیاں سُلجھا چکنے کے بعد عقل کے کوچہ میں ہمیشہ رہنے کی بجائے صاحبِ جنوں ہونے کی یوں دعا کرتے ہیں۔

عطا اسلاف کا سوزِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لا یحزنوں کر

خرد کی گتھیاں سُلجھا چکا ہوں
مرے مولا! مجھے صاحب جنوں کر

علامہ اقبالؒ کی شاعری میں جن ممتاز، مشہور صوفیاء اور خدا مست بزرگوں کا حسین تذکرہ ملتا ہے ان کا بڑے اختصار سے یہاں جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ شاعرِ اسلام علامہ اقبالؒ تصوّف و طریقت کے مختلف پہلوؤں کو کیوں اس قدر اہم اور قابلِ ذکر خیال کرتے ہیں ویسے تو ان کے کلام میں متعدد بزرگ ہستیوں کے نام ملتے ہیں لیکن یہاں چند معروف ترین شخصیات کا اجمالی خاکہ پیش کرتے پر اکتفا کی جائے گی۔

ابوُسعید ابوُالخیرؒ

ابوُسعید ابوالخیرؒ مشہور صوفی شاعر تھے۔ ان کا عارفانہ کلام ہمیشہ ہی تصوّف و معرفت کے دلدادگان کے لئے باعثِ کشش رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ ان کے روحانی مقام کے معترف اور مدّاح تھے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی ایک مشہور فارسی کتاب "جاوید نامہ" میں اپنے روحانی مُرشد مولانا رومؒ (پیر رومیؒ) کی معیت میں عالمِ خواب میں روحانی سفر طے کیا جس کے دوران مختلف مقامات پر ان کی مشہور شخصیات سے فرضی ملاقات ہوئی۔ وہ ایک جگہ پر پہنچتے ہیں جسے رومیؒ "مقامِ اولیاء" کہتے ہیں۔ مولانا رومؒ اقبالؒ کو اس بلند مقام کے بارے میں یوں آگاہ کرتے ہیں۔

زائرانِ ایں مقامِ ارجمند
پاک مرداں از مقاماتِ بلند

پاک مرداں چوں فضیلؒ و بوسعیدؒ
عارفاں مثلِ جنیدؒ و بایزیدؒ

(اس ارجمند جگہ کی زیارت کرنے والے عظیم الشان مرتبہ رکھنے والے پاک انسان ہیں۔

فضیلؒ اور ابو سعیدؒ جیسے پاکیزہ انسان اور جنیدؒ اور بایزیدؒ جیسے عارف یہاں ہوتے ہیں۔

(جاوید نامہ، ص۔ 648)

ان دو اشعار سے بخوبی پتہ چل سکتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کی نگاہ میں ان صوفیائے کبار اور اولیائے عُظّام کی کیا قدر و منزلت ہے۔

امام ابو حامد غزالیؒ (۴۵۰ھ تا ۵۰۵ھ)

امام غزالیؒ بلاشبہ وحیدِ زمانہ اور یکتائے روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ خدا تعالیٰ نے انہیں بہت سی ظاہری اور باطنی خوبیوں کا مجموعہ بنا دیا تھا۔ وہ منطق، فلسفہ اور علمِ کلام میں مہارت رکھتے تھے اور تصوّف و طریقت کے راہ شناس بھی تھے۔ وہ طوس میں پیدا ہوئے اور زیادہ تر تعلیم نیشاپور میں حاصل کی بعد ازاں وہ بغداد کی مشہور ترین علمی درسگاہ "مدرسۂ نظامیہ" میں اُستاد مقرر ہوئے جہاں ان کے درس سے بے شمار لوگ علم و حکمت کے جواہر اکٹھے کرتے۔ جب وہ منطق و فلسفہ کی خامیوں سے اُکتا کر تصوّف و طریقت کی حسین وادی میں آئے تو انہیں سکونِ قلب کی دولت ہاتھ آئی۔ انہوں نے تصوّف اور شریعت کو ہم آہنگ کرنے کی سعیٔ بلیغ کی۔ ان کی مشہور تصانیف میں احیاء العلوم، تہافتہ الفلاسفہ اور مقاصد الفلاسفہ شامل ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی اکثر تصانیف میں دنیائے اسلام کی اس نابغہ اور یگانۂ روزگار شخصیت کا بڑے ادب و احترام سے ذکر کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار بطور مثالیں پیش کئے جاتے ہیں۔ وہ اپنی ایک معرکہ آرأ اور مشہور ترین نظم "جوابِ شکوہ" میں موجودہ دَور کے مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برقِ طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالیؒ نہ رہی

(بانگِ درا، ص۔ 203)

جو حضرات امام غزالیؒ کے سوانحِ حیات سے کسی قدر واقف ہیں انہیں معلوم ہے کہ امام غزالیؒ کس طرح فلسفہ، منطق اور علمِ کلام کی ذہنی ورزش اور خیال آرائیوں سے تنگ آ کر تصوّف و طریقت کے میدان میں داخل ہوئے۔ فلسفہ انہیں کسی طرح بھی ذہنی اطمینان اور سکونِ قلب کی دولت سے مالا مال نہ کر سکا۔ یہ راحت خیز دولت انہیں صرف تزکیۂ نفس اور صفائے باطن کے ذریعے نصیب ہوئی جو احکامِ الٰہی کے مطابق زندگی گذارنے، نفسِ انسانی پر قابو پانے اور طبیعت میں جذبۂ عمل کو اُبھارنے کے لئے بے حد

مؤثر اور مفید ثابت ہوتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اس بات پر یہاں زور دینا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں فلسفیانہ ذوق تو رہ گیا ہے لیکن وہ امام غزالیؒ کی اس تلقین کو فراموش کر چکے ہیں کہ محض محدود، ناقص اور نارسا عقل کی بدولت زندگی اور مذہب کے حقائق و اسرار کی گرہ کشائی ممکن نہیں۔ عقل کے علاوہ جذبۂ عشق و اطاعت بھی لازمی ہوا کرتا ہے۔ عقل تو محض ہمیں نامکمل معلومات بہم پہنچاتی ہے لیکن وہ عمل کے لئے مہمیز کا کام نہیں دے سکتی۔

سحر خیزی علامہ اقبالؒ کی نگاہ میں بہت سی برکات و فوائد کی حامل ہے۔ صبح سویرے اٹھنا عاشقانِ صادق اور بندگانِ خدا کی قدیم عادت ہے۔ علامہ موصوف کی زندگی کا ایک معمول شب بیداری اور سحر خیزی بھی تھا۔ وہ جب اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے یورپ تشریف لائے اس وقت بھی وہاں کی شدید سردی انہیں سحر خیزی سے نہ روک سکی چنانچہ وہ اس کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

وہ بے شمار بزرگانِ دین کی سعیٔ پیہم، طبعی ذکاوت، وحدتِ فکر و عمل، روحانی پاکیزگی، صفائے دل، خدا سے مضبوط رابطہ اور عشقِ الٰہی کے اظہار کا راز سحر خیزی میں پوشیدہ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

عطارؒ ہو، رومیؒ ہو، رازیؒ ہو، غزالیؒ ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

(بالِ جبریل، ص۔ 348)

امام غزالیؒ بھی ان زعمائے ملّتِ اسلامیہ میں سے ہیں جنہوں نے نالۂ نیم شبی اور سحر خیزی کی بدولت بارگاہِ ایزدی سے بقائے دوام کی نعمتِ عظمیٰ حاصل کی۔

علامہ اقبالؒ علماء، صوفیاء، صلحاء، حکماء اور عرفاء کے تبحرِ علمی اور کمالاتِ باطنی کے بہت زیادہ مدّاح تھے۔ وہ علم و عمل، عقل و عشق، ظاہر و باطن اور حکمت و معرفت کے حسین امتزاج اور ہم آہنگی کو نہ صرف انفرادی ترقی بلکہ مسلمانوں کی اجتماعی کامیابی کے لئے بھی بے حد اہم تصور کرتے تھے۔ جب وہ دورِ حاضر میں ایسے رفیع الشان اور وسیع النظر علماء اور صوفیاء نہیں پاتے تو وہ افسوسناک انداز میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

دگر بمدرسہ ہائے حرم نمی بینم
دلِ جنیدؒ و نگاہِ غزالیؒ و رازیؒ

(میں موجودہ اسلامی مدارس اور تعلیم گاہوں میں جنیدؒ کا دل اور غزالیؒ و رازیؒ کی بلند نگاہی نہیں دیکھتا ہوں)

(ارمغانِ حجاز، ص۔ 685)

مندرجہ بالا شعر میں امام غزالیؒ کی وسعتِ نگاہ، علمی تبحر اور دقّتِ نظر کو شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ علاّمہ اقبال کو امام غزالی رحمتہ علیہ کی بلند شخصیت، علمی عظمت اور قلبی پاکیزگی کا بہت زیادہ احترام تھا۔

بایزید بسطامیؒ (وفات 261ھ)

حضرت بایزید بسطامیؒ عراق کے مشہور صوفی تھے۔ معروف صوفیاء اور شیخانِ طریقت میں سے تھے۔ وہ تیسری صدی ہجری کے آخر میں عراق کے ایک مقام بسطام میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنی پرہیز گاری، حبِ الٰہی، اتباعِ رسولؐ اور نظریۂ سکر (نشہ اور مستی) کے لئے خاص شہرت رکھتے تھے۔ وہ اتباعِ رسولؐ کے عاشق خیال کئے جاتے تھے۔ ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ وہ ہر فعل میں ہادیٔ اکبر حضرت محمدؐ کی پوری پوری پیروی کریں۔ علاّمہ اقبالؒ نے ان کے اسی جذبۂ عشقِ رسولؐ کی بے حد تعریف کی ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں ان کا کئی مقامات پر ذکر کیا ہے۔

برِ صغیر پاک و ہند کے شہرۂ آفاق مفکر اور شاعر شریعت کے اَسرار کے علاوہ تصوّف و طریقت کے رمُوز سے بھی کافی حد تک آگاہ تھے۔ ان کی اس گہری واقفیت نے انہیں اسلامی حقائق کے ترجمان صوفیاء اور عرفاء کی عظمت و افادیت کا قائل کر دیا تھا۔ وہ ان صوفیائے کبار اور علمائے شریعت سے بڑی عقیدت و محبّت رکھتے تھے جنہوں نے کسی نہ کسی طرح اسلام، قرآنی تعلیمات اور سنّتِ نبویؐ کی پیروی کو اپنی زندگی کا شعار بنالیا تھا۔ وہ بایزید بسطامیؒ کی پیرویٔ رسولؐ کے بڑے مدّاح تھے۔ رسول کریمؐ کے اسوۂ حسنہ کی مکمل اور مخلصانہ پیروی بایزید بسطامیؒ کی ذات و صفات کا طرۂ امتیاز تھی چنانچہ انہوں نے ان کو یُوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں
شکوہِ سنجر و فقرِ جنیدؒ و بسطامیؒ
(بالِ جبریل، ص۔ 365)

علاّمہ اقبالؒ مسلمانوں کے ایک پُرشکوہ بادشاہ سنجر کی سلطنت اور جنیدؒ و بسطامیؒ کے فقر کو اسلام کے دو امتیازی پہلوؤں یعنی جلال و جمال کے ترجمان کی حیثیت سے بیان کرتے ہیں۔ دینِ اسلام چونکہ زندگی کے تمام اہم شعبہ جات میں انسانوں کی ضروریات کو پورا کرتا ہے اس لئے اس میں اخلاقیات کے ساتھ ساتھ سیاستِ مدن کے لئے بھی محکم اصول موجود ہیں۔ حکومت سیاسی غلبہ اور فقر روحانی غلبہ کی دو واضح ترین مثالیں ہیں۔ اسلام دینِ غالب کے طور سے ہمیں دنیاوی اور روحانی غلبہ عطا کرتا ہے۔ علاّمہ اقبالؒ رسول کریمؐ کی ولادت و بعثت کی آفاقی شان کو بیان کرتے ہوئے مندرجہ بالا امر کی مزید صراحت یوں کرتے ہیں۔

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب
(بالِ جبریل، ص۔ 405)

بایزید بسطامیؒ کی مکمل اطاعتِ رسولؐ کے بارے میں علاّمہ اقبالؒ ہمیں ان کی زندگی کا ایک بڑا ہی سبق آموز واقعہ بتاتے ہیں:۔

"حضرت بایزید بسطامیؒ نے خربوزہ کھانے سے محض اس بنا پر اجتناب کیا تھا کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ نبی کریمؐ نے یہ پھل کس طرح کھایا ہے۔ اسی کامل تقلید کا نام عشق ہے"۔

انہوں نے اس واقعہ کو اپنی مشہور فارسی تصنیف "اسرارِ خودی" میں اس انداز میں لکھا ہے۔

کاملِ بسطام در تقلیدِ فرد
اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد

(بسطام کے مردِ کامل نے ایک فرد (رسول کریمؐ) کی پیروی میں خربوزہ کھانے سے پرہیز کیا تھا)۔
(اسرارِ خودی، ص۔ 22)

علاّمہ اقبالؒ کے مُرشدِ معنوی مولانا رومؒ نے بھی حضرت بایزید بسطامیؒ کی اسلام پرستی، استقامتِ دین اور اطاعتِ رسولؐ کے بارے میں مندرجہ ذیل واقعہ لکھا ہے جسے علاّمہ اقبالؒ نے ان کے اپنے ہی الفاظ میں یوں بیان کیا ہے۔ مولانا رومؒ کے وہ اشعار یہ ہیں۔

"بود گبرے در زمانِ بایزیدؒ
گفت اُو را یک مسلمانِ سعید

خوشتر آں باشد کہ ایماں آوری
تا بدست آید نجات و سروری

گفت ایں ایماں اگر ہست اے مرید!
آں کہ دارد شیخِ عالَم بایزید

من ندارم طاقتِ آں، تابِ آں
کاں فزوں آمد ز کوششہائے جاں"
(مولانا رومؒ)

(بایزیدؒ کے زمانے میں ایک مجوسی تھا، اس سے ایک باسعادت مسلمان نے کہا۔
اے آتش پرست! بہتر ہو گا کہ تو ایمان لے آئے تاکہ تجھے نجات اور سروری حاصل ہو۔
اس نے جواب دیا...... اے مرید بایزیدؒ! اگر ایمان سے تیرا مطلب وہ ایمان ہے جس پر حضرت بایزیدؒ عامل ہیں۔

تومیں اس ایمان کی ہرگز طاقت نہیں رکھتا کیونکہ وہ میری کوششوں سے باہر ہے)۔

(جاوید نامہ ؛ ص۔ 710-709)

علامہ اقبالؒ نے حضرت بایزید بسطامیؒ کے کردار کی ایک اور نمایاں خوبی (اخلاصِ عمل) کو بھی بہت سراہا ہے۔ وہ گجرات کے ایک بادشاہ محمود بیگڑہ کے بیٹے سلطان مظفر کے اخلاصِ عمل کو حضرت بایزید بسطامیؒ کے اخلاصِ عمل سے مشابہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

رترے از اسرارِ دیں بر گویمت
داستانے از مظفر گویمت
اندر اخلاصِ عمل فردِ فرید
پادشاہے با مقامِ بایزیدؒ

(جاوید نامہ ؛ ص۔ 792)

(میں تجھے دین کے رازوں میں سے ایک راز بتاتا ہوں ؛ اس بارے میں تجھے مظفر بادشاہ کی داستان سناتا ہوں۔

سلطان مظفر اخلاصِ عمل میں بے مثال شخص تھا ؛ وہ پادشاہ حضرت بایزیدؒ جیسا مقام رکھتا تھا)۔

اس سے پیشتر بیان کیا جاچکا ہے کہ علامہ اقبالؒ عقل و عشق اور حکومت و فقر کو اسلام کے دو اہم اور ہم آہنگ پہلو قرار دیتے ہیں۔ وہ سیاسی قوت کو جلال اور روحانی طاقت کو جمال کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان دونوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسی طرح وہ ذکر اور فکر کو بھی دینِ اسلام کے دو نمایاں ترین گوشے خیال کرتے ہیں۔ ذکر عشق کی علامت ہے اور فکر عقل کی ترجمان ہے۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے تلوار اور نگاہ دونوں نے مؤثر کام کیا ہے۔ صحیح مسلمان سلاطین نے تیغ کو دینِ اسلام کی حفاظت کی خاطر استعمال کیا اور اسی طرح صوفیائے عظام نے اپنے اعلیٰ کردار سے غیر مسلموں کو اسلام کی طرف راغب کیا تھا۔ اس لحاظ سے تیغ ایوبی کے ساتھ نگاہِ بایزیدؒ بھی دینِ اسلام کی محافظ رہی ہے۔ علامہ اقبالؒ کی زبان سے یہ الفاظ سنئے۔

تیغ ایوبیؒ نگاہِ بایزیدؒ
گنج ہائے ہر دو عالم را کلید
عقل و دل را مستی از یک جامِ مے
اختلاطِ ذکر و فکرِ روم و رے

(صلاح الدین ایوبی کی تلوار اور بایزید بسطامیؒ کی نگاہ دونوں جہانوں کے خزانوں کی کنجی ہیں۔
عقل اور دل کی مستی ایک ہی جام مے سے ہے۔ مولانا رومؒ کا ذکر (عشق) اور امام فخرالدین رازیؒ کی

فکر (عقل) کا اختلاط ایک ہیں)

(پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق ' ص۔ 836)

بو علی شاہ قلندرؒ پانی پتی

بو علی شاہ قلندرؒ کا اصل نام شیخ شرف الدین اور لقب بو علی قلندر تھا۔ وہ 685ھ میں پانی پت میں متولد ہوئے۔ جب وہ اپنے کتابی علم کو چھوڑ کر کوچۂ عشق و مستی میں داخل ہوئے تو قلندر بن گئے۔ وہ زیادہ تر وقت خدا کی محبت میں مستغرق رہتے اور ان پر جذب و کیف کا عالم طاری رہتا۔ اس استغراق کے باوجود وہ اسلامی تعلیمات کی تبلیغ بھی کرتے رہے۔ پانی پت کے کافی لوگ ان کی مساعی کی بدولت حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔ ان کی جلالی کیفیت سے بڑے بڑے لوگ بھی مرعوب رہتے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے ان کی شانِ بے نیازی' جلال اور خودداری کو اپنے چند اشعار میں بیان کیا ہے۔ بو علی شاہ قلندر کا 724ھ میں انتقال ہوا تھا۔

خودی کو محکم بنانے کے لئے خدا کی اطاعت اور جذبۂ عشقِ رسولؐ بے حد لازمی ہوا کرتے ہیں۔ جب خودی عشق و محبت سے مضبوط ہو جاتی ہے تو پھر وہ دنیا کو اپنا مطیع اور غلام بنا لیتی ہے۔ خدا کے عاشقِ صادق کا پنجہ خدا کا پنجہ بن جاتا ہے۔ اس ضمن میں علامہ اقبالؒ نبیٔ اکرمؐ کے معجزۂ شق القمر کو بطور دلیل پیش کرنے کے بعد برِ صغیر پاک و ہند کے ایک باجبروت صوفی حضرت بو علی شاہ قلندرؒ پانی پتی کا بھی حیرت انگیز واقعہ بیان کرتے ہیں۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ایک روز بو علی قلندرؒ کا ایک مرید بازار میں سے گذر رہا تھا۔ وہاں سے اس شہر کے حاکم کی سواری بھی گذرنے لگی حاکم شہر کا چوبدار لوگوں کو راستے سے ہٹا رہا تھا۔ یہ مرید اپنے خیالات میں گم ہو کر گذر رہا تھا اور اس نے چوبدار کی بات نہ سُنی۔ چوبدار نے غصّے میں آ کر بو علی شاہ قلندرؒ کے اس بے گناہ مرید کے سر پر لکڑی دے ماری۔ وہ روتا ہوا حضرت قلندرؒ کی بارگاہ میں آیا اور انہیں سارا ماجرا سنایا۔ یہ ماجرا سنتے ہی حضرت بو علی شاہ قلندرؒ جلال میں آ گئے اور انہوں نے اس وقت کے بادشاہ علاؤالدین خلجی کے نام شکایت نامہ لکھا اور اسے حکم ایزدی سے معزول کروانے کی اطلاع دی۔ جب یہ خط سلطان علاؤالدین خلجی کو ملا تو وہ بے حد پریشان اور مغموم ہو گیا۔ اس نے فوراً حاکم شہر کو سزا دی اور بو علی شاہ قلندرؒ کی خدمت میں معافی نامہ ارسال کروایا۔ یہ معافی نامہ پہنچانے کے لئے اس عہد کے مشہور شاعر اور نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہیؒ کے مریدِ خاص امیر خسروؒ سے درخواست کی۔ امیر خسروؒ یہ معافی نامہ لے کر بو علی شاہ قلندرؒ کی بارگاہ میں پہنچے اور وہاں انہوں نے سب سے پہلے ایک غزل پڑھی جسے سن کر بو علی قلندرؒ بہت خوش ہوئے۔ جب ان کا جلال ختم ہوا تو امیر خسروؒ نے وہ معافی نامہ بھی پیش کر دیا جسے انہوں نے قبول کیا اور بادشاہ کو دوبارہ ایسی حرکت کروانے سے منع کیا۔ اب اس بارے میں علامہ اقبالؒ کے چند متعلقہ اشعار ہدیۂ قارئین کئے جاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

باز گیر ایں عاملِ بد گوہرے
ورنہ بخشم مُلکِ تُو با دیگرے
نامۂ آں بندۂ حق دستگاہ
لرزہا انداخت در اندامِ شاہ
بہرِ عامل حلقۂ زنجیر جُست
از قلندر عفوِ ایں تقصیر جُست
نیشتر بر قلبِ درویشاں مَزن
خویش را در آتشِ سوزاں مَزن.

(اس بد فطرت گورنر (حاکم) کو سزا دے ورنہ میں تیرا ملک کسی اور کے حوالے کر دوں گا۔
خدا کے اس بندے کے خط نے بادشاہ کے جسم پر کپکپی طاری کر دی۔
اس نے گورنر کو پابہ زنجیر کر دیا اور بو علی شاہ قلندرؒ سے اس تقصیر کی معافی مانگی
تُو درویشوں کے دل کو مجروح نہ کر اور اس طرح اپنے آپ کو آتشِ سوزاں کا شکار نہ بنا)۔

(اسرارِ خودی، ص۔ 26،27)

علامہ اقبالؒ اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق دلانا چاہتے ہیں کہ ؏ "

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں"

خدا کے سچے عاشق دنیاوی بادشاہوں کی شان و شوکت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے دربار پر جبین سائی کرتے ہیں۔ اس کے برعکس انہیں خدا کی ذات پر مکمل بھروسہ ہوتا ہے اور ان کا فعل خدائی فعل بن جاتا ہے۔ ایک طرف دنیا کا باجبروت بادشاہ ہے اور دوسری طرف درویش خدامست ہے جو بادشاہ کی حکومت کو ڈانواں ڈول کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ بادشاہ کو بھی خدا کے بے نیاز بندوں کی معجزہ نمائی کا پختہ یقین تھا ورنہ وہ گھبرا کر ایک درویش سے یوں معافی نہ مانگتا۔ علامہ اقبالؒ نے ایک اور جگہ قلندر کی شان کو یوں بیان کیا ہے ؏

بچتا ہوا نگاہِ قلندر سے گذر جا

(ضربِ کلیم ص۔ 503)

بو علی شاہ قلندرؒ کی شانِ بے نیازی، خودداری اور اسلامی فقر کی خوبی کو علامہ اقبالؒ نے اس قدر پسند کیا ہے کہ اسے اپنی ایک اور مایہ ناز فارسی کتاب "رموزِ بے خودی" کے عنوان "اللّٰہُ الصَّمَد" میں خاص جگہ دی ہے۔ خدا کی صفتِ بے نیازی جب اس کے سچے عاشقوں میں بھی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اپنی خودداری کے تحفظ کے لئے شاہی شان و شوکت کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیتے ہیں۔ علامہ موصوف نے حضرت بو علی شاہ قلندرؒ کا اپنا شعر بھی وہاں درج کر دیا ہے تاکہ قارئین کو شان قلندری کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ علامہ

اقبالؒ اللہُ الصَّمَدُ کی تشریح وتفسیر اور بو علی شاہ قلندرؒ کی خودداری کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

تا توانی کیمیا شو، رگل مشو
درجہاں منعم شو و سائل مشو
اے شناسائے مقام بو علیؒ!
جُرعۂ آرم ز جام بو علیؒ
"پُشتِ پا زن تختِ کیکاؤس را
سربدہ از کف مدہ ناموس را"
(بو علی شاہ قلندرؒ)

(جہاں تک ہوسکے تو کیمیا بن اور مٹی نہ بن، تو دنیا میں منعم بن اور سائل نہ ہو۔
تُو بو علی شاہ قلندرؒ کے مقام سے آگاہ ہے، میں بو علی شاہ قلندرؒ کے جام سے تجھے ایک گھونٹ پلاتا ہوں۔
وہ کہتے ہیں "تُو کیکاؤس بادشاہ کے تخت کو پاؤں سے ٹھکرادے، تو اپنا سر دے دے لیکن اپنی ناموس کو ہاتھ سے نہ دے")

(رموزِ بے خودی، ص۔ 159۔ 158)

جنید بغدادیؒ

ابو لقاسم جنید بغدادیؒ مشاہیر اولیاء میں سے ہیں۔ تصوّف وطریقت اور شریعت کے اَسرار و رمُوز سے ان کی واقفیت اور مہارت کو اکثر صوفیاء اور علماء نے سراہا ہے۔ وہ 215ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ چھوٹی عمر ہی سے ان کو تصوّف وطریقت سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ ان کے ماموں سری سقطیؒ تصوّف میں بلند مقام کے مالک تھے۔ ان کی صحبت نے کافی حد تک ان کے ذوقِ تصوّف و معرفت میں شدّت پیدا کر دی تھی۔ اَبُو یزید بسطامیؒ اور ذوالنون مصریؒ تصوّف میں سُکر (نشہ اور مستی) کے قائل تھے اس کے برعکس سید الطائفہ جنید بغدادیؒ صُحو (ہوشیاری) کے حامی تھے۔ علاّمہ اقبالؒ ان کے نظریۂ صُحو کے بہت زیادہ مداح تھے۔ انہوں نے اپنے کلام میں جنید بغدادیؒ کا اکثر ذکر بڑے احترام و محبت سے کیا ہے۔

شاعرِ مشرق اور مفکرِ اسلام علاّمہ اقبالؒ دین و سیاست میں کسی قسم کی جدائی کو گوارا نہیں کرتے کیونکہ ان کی نگاہ میں اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ جب یہ دستور العمل زندگی کے تمام ضروری اخلاقی، روحانی، جسمانی، سماجی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی امور میں ہماری صحیح طور پر رہنمائی کر سکتا ہے تو پھر دین اور سیاست میں تفریق کیوں گوارا کی جائے؟۔ علاوہ ازیں دینِ اسلام اپنے غلبہ واقتدار کے لئے خاص نظامِ سیاست کا حامل ہے۔ سیاسی غلبہ اسلام کے جلالی پہلو کا ترجمان ہے اس طرح اسلامی فقر بلند اخلاقی

اعلیٰ اصولوں اور روحانی ترفع کا مظہر ہے۔ علامہ اقبالؒ ان دونوں کے حسین اور پائیدار امتزاج کے زبردست حامی ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام میں اکثر و بیشتر جنید بغدادیؒ اور بایزید بسطامیؒ کے فقر کو اسلام کا جمالی مظہر اور شوکتِ سنجر و سلیم کو سیاسی اقتدار و غلبہ کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اسی حقیقت کے غماز ہیں۔ علامہ مرحوم و مغفور رقم طراز ہیں۔

عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں
شکوہِ سنجر و فقرِ جنیدؒ و بسطامیؒ
(بالِ جبریل، ص۔ 365)

لوح بھی تُو، قلم بھی تُو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب

(بالِ جبریل، ص۔ 405)

ان اشعار میں ہادیٔ برحقؐ اور راہبرِ کاملؐ کی ولادت باسعادت اور بعثتِ نبویؐ کو کائنات کے لئے باعثِ رحمت و برکت قرار دیتے ہوئے جنید بغدادیؒ اور بایزید بسطامیؒ کے فقر کو نبیٔ اکرمؐ کا "جمالِ بے نقاب" کہا گیا ہے۔ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علاّمہ اقبالؒ کی رائے میں حضرت جنید بغدادیؒ کے فقر کا کیا مقام ہے۔

دین و سیاست کا توازن نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام انسانیت کے لئے بھی امن و راحت کا سبب ہو سکتا ہے۔ عہدِ جدید میں دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے جُدا کر کے عام انسانوں کی معاشرتی زندگی کو گوناگوں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا مجموعہ بنا دیا گیا ہے۔ علاّمہ اقبالؒ نہ صرف مسلمانوں کی خیر کے طالب ہیں بلکہ وہ دینِ اسلام کو عالمگیر مذہب سمجھتے ہوئے بلا امتیاز مذہب و ملت سب انسانوں کی بہبود کے بھی خواہاں ہیں۔ وہ اردشیری (سیاست و حکومت) اور جنیدی (دین) کی وحدت کی حمایت میں یہ کہتے ہیں۔

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

(بالِ جبریل ص۔ 140)

اس بات سے انکار محال ہے کہ علامہ اقبالؒ تصوف و طریقت کو شریعتِ اسلامیہ کی منزل کی جانب جانے کا اہم راستہ اور طریقہ خیال کرتے تھے۔ منزلِ مقصود کی طرف بے شمار راستے جاسکتے ہیں عقل و دانش کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے سیدھا اور محفوظ راستہ اختیار کیا جائے تاکہ مسافر اور سالک اطمینانِ قلب اور یقینِ پختہ کے ساتھ وہاں پہنچ جائے۔ علاوہ ازیں سفر پر آمادہ کرنے کے لئے مصمم ارادہ، جفا طلبی کا جذبہ، مقصد کی لگن اور صحیح رہنما بھی اشد ضروری ہیں۔ محض عقل کی بدولت سفر منزل اختیار نہیں کیا جاسکتا اس کے لئے جذبۂ عشق اور قلبی رغبت بھی لازم ہیں۔ علامہ اقبالؒ موجودہ دَور کے مسلم مدارس اور روحانی تربیت گاہوں میں عقل و دل کے فقدان پر اظہار افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

دگر بہ مدرسہ ہائے حَرَم نمی بینم
دلِ جنیدؒ و نگاہِ غزالیؒ و رازیؒ

(میں دوبارہ حرم کے مدرسوں میں جنیدؒ کا دل اور غزالیؒ و رازیؒ کی نگاہ نہیں دیکھتا ہوں)

(ارمغانِ حجاز، ص۔ 685)

اس شعر میں علامہ اقبالؒ نے حضرت جنید بغدادیؒ کے دلی کمالات اور قلبی صفات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ نگاہ کی عفت کے ساتھ ساتھ دل کی پاکیزگی کے بھی حامی و موید ہیں۔ احکامِ شریعت پر عمل کرنے کے لئے نیک نیتی، اخلاصِ عمل اور قلبی طہارت کا پہلے ہونا لابدی امر ہے۔ یہ صفات صحیح قسم کے اسلامی تصوف و طریقت کی بدولت پیدا ہوتی ہیں اس لحاظ سے علامہ اقبالؒ مرحوم و مغفور تصوف و طریقت کو شریعت کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے مفید اور معاون پاتے ہیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ کے کردار کی ایک نمایاں خوبی احترامِ رسولؐ کا شدید جذبہ ہے۔ مسلم تصوف کے اوّلین دَور کے یہ دو بزرگ اسوۂ رسولؐ اور احترامِ نبیؐ کے لئے بھی خاص شہرت رکھتے تھے چنانچہ علامہ اقبالؒ نے اپنی ایک فارسی کتاب "ارمغانِ حجاز" (ص۔ 903) کے عنوان "حضور رسالتؐ" کی ابتدا میں عزّت بخاری کا مندرجہ ذیل شعر لکھتے ہوئے ان دونوں بزرگوں کی عقیدتِ رسولؐ پر یوں روشنی ڈالی ہے۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

بارگاہِ رسالتؐ آسمان کے نیچے عرش سے زیادہ نازک ادب گاہ ہے۔ یہاں جنیدؒ اور بایزیدؒ بھی دم بخود ہو کر آتے ہیں۔

مسلمانانِ عالم کی اکثریت کا یہ عقیدہ ہے کہ جس جگہ رسول کریمؐ آرام فرما ہیں وہ عرش و کرسی سے بھی زیادہ عزت و احترام ہے۔ علامہ اقبالؒ نے یہاں اس بات کی بخوبی ترجمانی کی ہے۔

حسین بن منصور حلاّج (۲۴۴ھ۔ تا ۳۰۹ھ)

حسین بن منصور حلاّج اربابِ تصوّف اور علمائے شریعت کے درمیان صدیوں سے وجہِ نزاع بنا ہُوا ہے۔ صوفیاء اور علماء کا ایک گروہ اسے کافر اور تصوّف کے پردہ میں شعبدہ باز خیال کرتا ہے لیکن دوسرا گروہ اسے حق پرست انسان اور ولی سمجھتا ہے۔ تیسرا گروہ اس کی شخصیت کے بارے میں کوئی قطعی رائے ظاہر کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اس کے بعض نظریات مثلاً اتحادِ ذاتِ الٰہی، حلول اور حج کی عدم ضرورت وغیرہ اس کے قتل کا باعث بنے۔ تصوّف اور شریعت کے ماہرین نے اس کے بعض نظریات کو اسلامی تعلیمات کے منافی قرار دیا جس کی بعد ازاں اس وقت کی عدالت نے بھی تصدیق کر دی تھی۔ علماء کے فتویٰ قتل کی بنا پر اس پر کئی ماہ تک مقدمہ چلتا رہا۔ عدالت نے اسے واجب القتل قرار دیا اور اس کی سزا یہ تجویز کی کہ پہلے اسے کوڑے مارے جائیں بعد ازاں اس کے اعضاء کاٹ کر کے اسے پھانسی دی جائے اور اس کی لاش کو جلا کر سپردِ دریا کیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس کا نعرہ "انا الحق" (میں خدا ہوں یا میں حق ہوں) ابھی تک مختلف تعبیرات کا حامل ہے۔ علاّمہ اقبالؒ اس سے مطلب یہ لیتے ہیں کہ انا (خودی) الحق (درست ہے) حلاّج کی کتاب "کتاب الطّواسین" کے چند افکار کو علاّمہ اقبالؒ نے موضوعِ بحث بنایا ہے۔

✶ منصور اگرچہ فارس کے شہر بیضا میں پیدا ہوا مگر اس نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ عراق میں گذارا تھا۔ اس نے جیّد صوفیاء مثلاً سہل بن عبداللہ تستریؒ، عمرو مکّی بصری اور جنید بغدادیؒ کے فیضِ صحبت سے اکتساب کیا۔ وہ بےباک اور حق گوئی کا قائل تھا۔ مصلحت اندیشی اس کا اصول نہ تھا اس کے قتل نے شریعت و طریقت میں جنگ کا آغاز کر دیا تھا۔

علاّمہ اقبالؒ نے اپنے فارسی کلام میں رومیؒ کے بعد منصور حلاّج کے افکار و نظریات کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ انہوں نے اپنی ایک بلند پایہ علمی کتاب "جاوید نامہ" میں منصور حلاّج سے کئی اہم مذہبی، فلسفیانہ اور صوفیانہ نوعیت کے سوالات کئے اور بعد ازاں حلاّج کے نقطۂ نگاہ سے ان کے جوابات بھی دیئے ہیں۔ جاوید نامہ کے علاوہ انہوں نے بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم میں بھی منصور حلاّج کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے اپنی ایک نظم "زُہد اور رِندی" میں اپنے ایک آشنا مولوی صاحب کی اپنے بارے میں رائے کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ مولوی صاحب اقبالؒ کے کردار کی مختلف دلچسپ، حیرت انگیز اور متضاد کیفیّات سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مجموعۂ اَضداد ہے، اقبال نہیں ہے
دل دفترِ حکمت ہے طبیعت خفقانی

رِندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوّف کی تو منصور کا ثانی

(بانگِ درا، ص۔ 60)

آخری شعر سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال ؒ منصور حلاج کے مقامِ تصوّف کو کس قدر بلند خیال کرتے ہیں۔ حقیقت ہے کہ حلاج کو تاریخِ تصوّف میں خاص مقام حاصل ہے۔ اس کے نظریات اور صوفیانہ مسلک نے بعد کے بیشتر صوفیاء اور عرفاء کو متاثر کیا ہے۔ اس کی شخصیت اور قتل ابھی تک متنازعہ بنی ہوئی ہیں اس بحث کے باوجود اس کے صوفیانہ نظریات سب کے لئے باعثِ کشش ہیں۔ منصور حلاج نے نعرۂ انا الحق بلند کر کے اپنے عہد کے بہت سے علمائے شریعت اور صوفیاء کو اپنا دشمن بنالیا تھا بعد ازاں یہی نعرہ اس کے لئے پیامِ موت ثابت ہوا چنانچہ علامہ اقبال ؒ اس امر کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں۔

منصور کو ہُوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
(بانگِ درا، ص۔ 102)

منصور حلاج کے صوفیانہ تصوّرات کی چند جھلکیاں یہاں ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں تاکہ ہمیں اقبال ؒ کی تصوّف و معرفت میں گہری دلچسپی اور اس کے چند اہم نظریات کا علم ہوسکے۔ علامہ اقبال ؒ نے مولانا رومی ؒ کی رہنمائی میں جو فرضی سیرِ افلاک کی تھی اس کے دوران اس کی ایک جگہ منصور حلاج سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ اس ملاقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقبال ؒ اس سے مندرجہ ذیل سوالات کرتا ہے اور منصور حلاج ان کا اپنے نقطۂ نظر سے جواب دیتا ہے۔ یہ اہم سوالات اور ان کے جوابات ملاحظہ ہوں۔ وہ اقبال ؒ کو جنّت کے بارے میں بتاتا ہے۔

جنّتِ مُلّا مئے و حور و غلام
جنّتِ آزادگان سیرِ دوام
جنّتِ مُلّا خور و خواب و سرود
جنّتِ عاشق تماشائے وجود
(جاوید نامہ۔ ص۔ 708)

(مُلّا کی جنّت شراب، حور اور غلمانوں پر مبنی ہے مگر خدا کے آزاد بندوں کی جنّت مسلسل سیر ہے۔ مُلّا کی جنّت خوراک، نیند اور موسیقی ہے لیکن خدا کے سچے عاشق کی جنّت خدا کا دیدار ہے)۔

علامہ اقبال ؒ یہاں مُلّا کے عام نظریۂ جنّت اور خدا کے عاشقانِ صادق کی جنّت کا فرق واضح کر کے ہم پر یہ امر منکشف کرنا چاہتے ہیں کہ جنّت کے حصول کے لئے عبادت کی بجائے ہمیں صرف خدا کی محبّت اور خوشنودی مدِ نظر رکھنی چاہیے۔

تقدیر کے بارے میں حلاج علامہ اقبال ؒ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے۔

جبر، دینِ مردِ صاحب ہمّت است
جبرِ مرداں از کمالِ قوّت است

پختہ مردے پختہ تر گردد ز جبر
جبر مردِ خام را آغوشِ قبر

جبرِ خالدؓ عالمے برہم زند
جبر ما بیخ و بُنِ ما برکند

کارِ مردان است تسلیم و رضا
بر ضعیفاں راست ناید ایں قبا
(جاوید نامہ، ص۔ 709)

(جبر بلند ہمت انسان کا دین ہے ' بلند ہمت مردوں کا جبر طاقت کے کمال کی وجہ سے ہے۔
جبر کی وجہ سے پختہ انسان زیادہ پختگی حاصل کر لیتا ہے لیکن کمزور انسان کے لئے یہ پیامِ موت بن جاتا ہے۔
خالد بن ولیدؓ کا جبر دنیا کو برہم کر دیتا ہے مگر ہمارا جبر ہماری جڑ کو اکھیڑ دیتا ہے۔
بہادر انسانوں کا کام تسلیم و رضا ہے لیکن کمزور انسانوں کے جسم پر یہ لباس راست نہیں آتا)۔

علاّمہ اقبالؒ جبر کی دو قسموں پر یہاں روشنی ڈالتے ہوئے ہمیں یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ خدا کی مرضی کو تسلیم کرنا اور عمل سے فارغ نہ ہونا اہلِ ایمان اور بلند ہمت لوگوں کا کام ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو مجبورِ محض سمجھ کر سعی نہ کرنا ہماری بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ خدا کی ذات پر مکمل بھروسہ کرنا اور اس کے احکام پر عمل کرتے رہنا ہماری شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے

منصور حلاّج علاّمہ اقبالؒ کو اپنے قتل کی اصل وجہ بتاتے ہوئے کہتا ہے۔

بُود اندر سینۂ من بانگِ صور
ملّتے دیدم کہ دارد قصدِ گور

مومناں باخُوئے، و بُوئے کافراں
لاالہ گویاں و ازخود منکراں

امر حق گفتند نقشِ باطل است
زانکہ اُو وابستۂ آب و گِلِ است

مَن بخود افروختم نارِ حیات
مُردہ را گفتم ز اَسرارِ حیات

از خودی طرحِ جہانے ریختند
دلبری با قاہری آمیختند

من ز نور و نارِ اُو دادم خبر
بندۂ محرم! گناہِ من نگر

آنچہ من کردم تُو ہم کردی، بترس
محشرے بر مُردہ آوردی، بترس
(جاوید نامہ، ص۔ 711)

(میرے سینے کے اندر صُورِ اسرافیل کی آواز تھی، میں نے اپنی ملّت کو قبر کی جانب رواں دیکھا۔
مسلمان کفّار جیسی عادات واطوار کے مالک بن چکے تھے۔ وہ لا الہ تو کہتے لیکن اپنی خودی کے منکر تھے
انہوں نے اَمرِ حق (روحِ انسانی) کو غلط نقش کہا کیونکہ ان کی نظر میں روح جسم کے ساتھ وابستہ ہے۔
میں نے اپنی ذات میں زندگی کی آگ جلائی اور مُردہ ملّتِ اسلامیہ کو زندگی کے بھید بتائے۔
انہوں نے بعد ازاں خودی کے سبب ایک دنیا کی بنیاد ڈالی اور دلبری (جمال) کو قاہری (جلال) کے ساتھ ملا دیا۔
میں نے ان کو خودی کے نور و نار (جمال اور جلال) کی خبر دی، اے واقفِ اسرار (اقبال) تو میرا یہ گناہ دیکھ۔
(اے اقبال!) میں نے جو کچھ کیا تو نے بھی ویسے ہی کیا، تو بھی ڈر کیونکہ تو نے مُردہ قوم کے اندر انقلاب پیدا کر دیا ہے)۔

مندرجہ بالا اشعار میں علاّمہ اقبالؒ ہمیں بتانا چاہتے ہیں کہ حسین بن منصور حلاّج نے انا الحق کا نعرۂ بیباکانہ بلند کیا تھا وہ دراصل اس دَور کے مسلمانوں کے دلوں میں خود شناسی، خودنگری اور معرفتِ نفس پیدا کر کے انہیں ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتا تھا۔ علاّمہ موصوف کی رائے میں عام طور پر انا الحق سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ "میں خدا ہوں" لیکن وہ اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ انا (خودی) الحق (حق ہے) گویا ان کے خیال میں منصور حلاّج نے خودی کے بر حق ہونے کا نعرہ بلند کیا تھا جسے اقبالؒ نے بھی اختیار کر کے عہدِ حاضر کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا ہے۔

قرآنِ حکیم نے نبی اکرمؐ کی ذات والا صفات کو "رحمۃ اللعالمین" کہا ہے۔ منصور حلاّج اس لقب کی اہمیت و نوعیت کے بارے میں اقبالؒ کے سوال کا جواب یوں دیتے ہیں۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

(جہاں کہیں تُو دنیائے رنگ و بو دیکھتا ہے، اس زمین سے آرزو پیدا ہوتی ہے۔
یا تو اس کی قدر و قیمت نورِ مصطفیٰؐ سے ہے یا وہ ابھی تک مصطفیٰ کی تلاش میں ہے)۔

(جاوید نامہ، ص۔ 716)

علامہ اقبالؒ منصور حلاج کی زبان سے ہمیں یہ پیغام دینے کے خواہشمند ہیں کہ رسول کریمؐ خاتم النبیین اور رحمۃ اللعالمین ہونے کی حیثیت سے تمام جہانوں کے لئے باعثِ رحمت و سرفرازی ہیں۔ ان کی رحمت کسی ایک دَور اور کسی ایک دنیا تک محدود نہیں۔ قرآنِ حکیم نے خداتعالیٰ کو رب العلمین یعنی تمام دنیاؤں کا مربّی قرار دیا ہے۔ خدا کی ربوبیت کی شان اب بھی ظاہر ہے اسی طرح رسولِ کریمؐ کی نبوّت اور رحمت کا چشمۂ فیض بھی اَبد تک جاری و ساری رہے گا۔ اس کائنات کو رسول کریمؐ کے نور سے قدر و منزلت حاصل ہے اور آئندہ عوالم بھی اسی کے پیش کردہ نظام سے فروغ گیر ہوتے رہیں گے۔

رسول کریمؐ کی ذاتِ ستودہ صفات کی حقیقت سے متعلق علامہ اقبالؒ نے منصور حلاج سے ایک انتہائی پیچیدہ اور بحث طلب سوال کیا کہ رسالت مآبؐ آدم ہیں یا جوہر؟ منصور حلاج اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے۔

پیشِ اُو گیتی جبیں فرسودہ است
خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است

عبدہٗ از فہمِ تُو بالاتر است
ز انکہ اُو ہم آدم و ہم جوہر است

جوہرِ اُو نے عرب نے انجم است
آدم است و ہم ز آدم اقدم است

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر
ما سراپا انتظار اُو منتظر

کس ز سرِّ عبدہٗ آگاہ نیست
عبدہٗ جُز سرِّ الا اللہ نیست

لا الہ تیغ و دمِ اُو عبدہٗ
فاش تر خواہی بگو ہُو عبدہٗ

عبدہٗ چند و چگونِ کائنات
عبدہٗ رازِ درونِ کائنات

مدّعا پیدا نگردد زیں دو بیت
تا نہ بینی از مقامِ مارمیت

(اس (رسول کریمؐ) کے سامنے کائنات جبین فرسا ہے، اس نے خود اپنے آپ کو خدا کا خاص بندہ کہا ہے۔

خدا کا بندۂ خاص تیری سمجھ سے بالاتر ہے کیونکہ وہ انسان بھی ہے اور جوہر بھی۔
اس کا جوہر (حقیقت) نہ عربی ہے اور نہ عجمی ' اگر چہ وہ بشر ہے لیکن آدم سے زیادہ قدیم ہے۔
(یاد رکھ) عام انسان اور بندۂ خاص ایک دوسرے سے مختلف ہیں ' ہم تو دیدارِ خدا کا انتظار کرتے ہیں لیکن خدا اس کا منتظر ہے۔
کوئی آدمی بھی خدا کے بندۂ خاص کے راز سے واقف نہیں ' یہ بندۂ خاص الا اللہ کے بھید کے سوا کچھ بھی نہیں۔
لا الہ تلوار ہے اور عبدہٗ (خدا کا بندۂ خاص) اس تلوار کی دھار ہے ' اگر تو واضح حقیقت چاہتا ہے تو پھر تو اسے "ہو" کہہ دے۔
ان دو شعروں سے مطلب واضح نہیں ہوتا جب تک تو مارمیت کے مقام سے واقف نہ ہو۔
خدا کا یہ بندۂ خاص کائنات کی اصل اور اس کا رازِ درون ہے)

(جاوید نامہ ' ص۔ 717-716)

مذکورہ بالا اشعار میں علامہ اقبالؒ نے حقیقت محمدیؐ کے موضوع پر اپنے ذاتی خیالات منصور حلاج کے نظریات کی روشنی میں بیان کئے ہیں۔ صوفیائے عظام میں سے منصور حلاج پہلا صوفی ہے جس نے اس اہم اور تنازع خیز عقیدے پر بڑی شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کی تھی۔ ان اشعار میں اس کے تصورات کے چند نہایت ضروری پہلوؤں کو مفکرِ اسلام علامہ اقبالؒ نے بڑی مہارتِ فن کے ساتھ یہاں پیش کیا ہے۔ ایک مکتبِ فکر نبی اکرمؐ کو صرف بشر کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے جبکہ دوسرا مکتبِ خیال انہیں بشریت کے لباس میں نور کہتا ہے۔ بشر اور نور کی یہ بحث اب بھی بڑے زور و شور کے ساتھ جاری دکھائی دیتی ہے۔ اہل سنت والجماعت ان کی نوری حقیقت کے قائل ہیں جبکہ دوسرے گروہ ان سے اختلافات رکھتے ہیں۔ منصور حلاج کا نظریۂ حقیقتِ محمدیؐ دراصل علامہ اقبالؒ کا اپنا مسلک دکھائی دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے ہادیٔ سبلؐ ، ختم الرسلؐ جناب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا ہے:۔ "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ " (اے محبوبؐ ! آپ فرمادیجئے کہ میں تمہاری طرح بشر ہوں اور مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے) ۔ اس قرآنی آیت کی رو سے نبی کریمؐ کی شان بشری کو بھی بیان کیا گیا ہے اور ان کے امتیازی مقام کو بھی۔ بشر ہونے کے لحاظ سے انہوں نے دنیا میں بے مثال بشری زندگی بسر کی اور زندگی کے تمام اہم شعبہ جات مین نمایاں اور قابلِ ستائش کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو جس طرح گذارا وہ رہتی دنیا تک سب انسانوں کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا اس لحاظ سے کوئی انسان ان کی مانند نہیں ہو سکتا علاوہ ازیں اس انسانِ کاملؐ اور عدیم النظیر بشرؐ پر ہر وقت خدا ' اس کے ملائک اور مومنین صلوٰۃ وسلام کا ہدیہ پیش کرتے رہتے ہیں۔ کیا دنیا کے کسی اور بشر کو بھی یہ بلند مرتبہ دیا گیا ہے؟ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کے ذکر کو بلند اور عام کرنے کا وعدہ کیا تھا کیا آج تمام روئے زمین پر اسلام کے

نام لیوا روزانہ کم از کم پانچ مرتبہ نماز میں آپؐ کا ذکرِ خیر نہیں کرتے؟ کیا کلمہ شریف "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ محمد رَسُولَ اللہ" میں آپؐ کی رسالت توحید کا جزو لاینفک نہیں؟ کیا کسی اور انسان کو آپؐ کے علاوہ یہ اعزاز حاصل ہے؟ قرآنِ حکیم کی ایک آیت ہے:۔ "وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ" (اے محبوب! ہم نے تمہارا ذکر بلند کر دیا ہے)۔ کیا خدا نے یہ وعدہ پورا نہیں کیا؟ کیا خدا نے کسی اور بشر کے ساتھ بھی ایسا ہی بے مثال اور قابلِ ذکر وعدہ کیا تھا؟ کیا آپؐ کے سوا کسی اور بشر کو بھی رحمۃ للعٰلمین کا لقب دیا گیا ہے؟ علامہ اقبالؒ بجا کہتے ہیں کہ خدا کے اس بندۂ خاص کی حقیقت ہماری محدود اور ناقص عقل سے بالاتر ہے۔ ایک طرف رسولِ کریمؐ بشریت کے مقامِ رفیع پر کھڑے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف وہ حُسنِ مطلق کا عکسِ جمیل بھی ہیں۔ وہ خدا اور اس کی مخلوقات کے درمیان ایک لاجواب رابطہ ہیں اگر ان کی نسبت خدا سے ہو تو وہ "نور" دکھائی دیتے ہیں اور جب ان کا تعلق انسانوں کی دنیا سے ہو تو وہ ہمیں بے مثال "بشر" نظر آتے ہیں ان کی ذات منبعٔ برکات و فیوضات ہے۔ الہام و وحی کے حامل ہونے کے طور پر وہ خدا اور بندوں کے درمیان ربط و وصل کا عظیم ترین ذریعہ ہیں۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی حقیقت کے بارے میں چند احادیث نبویؐ بھی موجود ہیں۔ ایک حدیثِ قدسی کے یہ الفاظ ہیں:۔ "لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ" (اے محبوبؐ! اگر تو نہ ہوتا تو میں افلاک کو تخلیق نہ کرتا۔ اس طرح ولادتِ مصطفویؐ اس کائنات کی تخلیق کا مقصد عظیم ہے۔ آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے: "اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ وَآدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ" (سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا کیا اور آدمؑ اس وقت پانی اور مٹی کے درمیان تھا)۔ ان دو احادیث کو پیشِ نگاہ رکھتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے سرورِ کائناتؐ اور فخرِ موجوداتؐ کو دنیا ومافیہا کی پیدائش کا سبب اور آدمؑ سے پہلے موجود ہونے کے تصور پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ آنحضرتؐ کے مقام خاص کی ایک وجہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ عام انسان تو خدا کے دیدار کے طالب رہتے ہیں لیکن خدا تعالیٰ نے اپنے محبوبؐ کو شبِ معراج بلا کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ خود اپنے محبوبؐ کے دیدارِ حقیقی کا منتظر تھا۔ مزید برآں علامہ مرحوم و مغفور نبی اکرمؐ کو خدائی صفات کا مظہر تسلیم کرتے ہوئے قرآن کی یہ آیت "مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی" (اے محبوبؐ! جب تو نے کنکریاں پھینکی تھیں تو نے انہیں نہیں پھینکا تھا بلکہ خدا نے وہ کنکریاں پھینکی تھیں) بطور دلیل پیش کرتے ہیں جب مومن کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، چلنا سونا، زندہ رہنا اور مرنا خدا کے احکام کے مطابق ہو جائے تو پھر اس کا ہر فعل خدا کا فعل بن جاتا ہے۔ اس کا وہ کام خدائی مشیت سے ہم آہنگ ہو کر خدائی کام کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے افعال میں خدائی صفات کا عکس نظر آنے لگتا ہے۔ کیا خدا کے بندۂ خاص یعنی رسولِ کریمؐ کے سوا کسی کو یہ بلند ترین منصب ملا ہے کہ خدا اس کے فعل کو اپنا فعل قرار دے؟ کیا آنحضرتؐ ان دلائل کی رو سے عام انسانوں سے مختلف اور ممتاز نہیں؟۔

منصور حلاّج رسولِ خداؐ کے دیدار کی خواہش کے بارے میں اقبالؒ کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے یوں گویا ہوتا ہے۔

معنیٔ دیدارِ آں آخر زماںؐ
حکمِ اُو بر خویشتن کردن رواں
درجہاں زی چوں رسولؐ اِنس و جاں
تا چوُ اُو باشی قبولِ اِنس و جاں
باز خود را بیں، ہمیں دیدارِ اُوست
سنّتِ اُو سرّے از اسرارِ اُوست

(جاوید نامہ، ص۔ 718)

(اس آخر الزماںؐ کے دیدار کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حکم کو اپنی ذات کے اوپر جاری کیا جائے۔ تُو دنیا میں انسانوں اور جنّوں کے رسولؐ کی طرح زندگی گذار، تا کہ تُو بھی اس کی مانند انسانوں اور جنّوں میں مقبول ہو جائے۔
رسولؐ کی مکمل اطاعت کے بعد تُو اپنے آپ پر نظر کر یہی اس کا دیدار ہے، اس کی سنّت اس کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے)۔

ان اشعار کے ذریعے منصور حلاّج کی زبان سے علامہ اقبالؒ ہمیں نبی اکرمؐ کے فرمان اور ان کی سنّت کے مطابق زندگی بسر کرنے کا درس دیتے ہیں تا کہ ہم بھی مقبولِ خلائق ہو سکیں۔ علاّمہ کی رائے میں سنّتِ رسولؐ کی مکمل اتباع ہمیں ان کے دیدار کا آئینہ دار بنا دے گی۔

علاّمہ اقبالؒ منصور حلاّج سے خدا کے دیدار کی نوعیت سے متعلق بھی ایک سوال کرتے ہیں جس کا جواب دیتے ہوئے وہ اقبالؒ سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

نقشِ حق اوّل بہ جاں انداختن
باز اُو را درجہاں انداختن
نقشِ جاں تا درجہاں گردد تمام
می شوَد دیدارِ حق دیدارِ عام
اے خنک مَردے کہ ازیک ہُوئے اُو
نُہ فلک وارد طوافِ کوئے اُو
وائے درویشے کہ ہُوئے آفرید
باز لب بربست و دم درخود کشید

حکمِ حق را درجہاں جاری نکرد
نانے از جوُ خورد و کراری نکرد
خانقاہے جُست و از خیبر رمید
راہبی ورزید و سلطانی ندید
عصرِ حاضر باتوُ می جوید ستیز
نقشِ حق بر لوحِ این کافر بریز

((خدا کا دیدار) حق کے نقش کو سب سے پہلے اپنی روح میں مرتسم کرنا اور بعد میں اسے دنیا پر ظاہر کرنا ہے۔
جب روحانی کمال دنیا میں چھا جاتا ہے تو پھر خدا کا دیدار عام دیدار بن جاتا ہے۔
وہ انسان کتنا خوش قسمت ہے جس کی ایک "ہو" سے نو آسمان اس کے کوچے کا طواف کرتے ہیں۔
اس درویش پر افسوس ہے جس نے ایک "ہو" تو پیدا کی لیکن پھر اس نے چپ سادھ لی۔
ایسے درویش نے خدائی احکام کو دنیا میں جاری نہ کیا' اس نے جو کی روٹی تو کھائی مگر وہ حیدر کرار ؓ کی صفت شجاعت سے محروم رہا۔
خیبر سے بھاگ کر اس نے خانقاہ کو ڈھونڈا' اس نے رہبانیت اختیار کی اور شاہی قوّت و شوکت کو نہ پاسکا۔
(اے اقبال!) موجودہ زمانہ تیرے ساتھ جنگ کرتا ہے تو اس کافر کی تختی پر خدائی نقوش ڈال دے)۔
(جاوید نامہ' ص۔ 718'719)

علاّمہ اقبال ؒ نے ان اشعار میں ہمیں دیدارِ خدا کی نوعیّت اور حقیقت سے آگاہ کیا ہے۔ انسانی آنکھیں اس مادی دنیا میں خدا کا جلوہ دیکھنے کی متحمل نہیں ہو سکتیں اس لئے اس کے حسنِ مطلق کے عکس یعنی مظاہرِ کائنات ہی میں اس کی جلوہ گری دیکھی جا سکتی ہے۔ ہماری کمزور آنکھیں تو اس کے پیدا کردہ سورج کی روشنی کو زیادہ دیر تک براہِ راست نہیں دیکھ سکتیں۔ ہم سورج کے عکس کا پانی میں تو نظارہ کر سکتے ہیں خدا کا براہِ راست دیدار اس دنیا میں تو اس کا ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ ؑ بھی برداشت نہ کر سکا۔ عالمِ آخرت میں مومنوں کے لئے دیدارِ خداوندی کی نعمت مختلف حالات و کیفیّات کی حامل ہوگی۔ یہ کائنات خدا تعالیٰ کی صفاتِ حَسنہ اور اسمائے مختلفہ کی جلوہ گری کی مظہر ہے۔ یہاں ذاتِ الٰہی کی بجائے صفاتِ ایزدی کا حسین پَرتو دکھائی دیتا ہے۔ مظاہرِ قدرت کی نیرنگیاں دراصل خالقِ کائنات کے حُسن' قدرت' ربوبیت' رحمتِ عامہ' جود و کرم' خلاّقی صفت' علم اور دیگر صفات کی مرہونِ منت ہیں۔ حسین بن منصور حلاّج اور علاّمہ اقبال ؒ کے نظریئے کے مطابق یہاں خدا کے دیدار کا مطلب خدا کے احکام کو نافذ اور غالب کرنا ہے۔ صحیح مومن چونکہ خدا کی صفات کے رنگ میں رنگا ہوتا ہے اس لئے وہ روحانی طاقت کی بدولت دنیا میں خدا کے آئین کو ہی نافذ کرنے اور عالمگیر بنانے کے لئے پوری سعی و عمل سے کام لیتا

ہے۔ اس کا فریضہ محض ذاتی نجات نہیں بلکہ وہ اہلِ عالم کی نجات اور سربلندی کے لئے بھی کوشاں ہوتا ہے۔ وہ خانقاہ میں گھسنے کی بجائے میدانِ عمل میں آکر اپنی خداپرستی اور خدائی اطاعت کا عملی ثبوت پیش کیا کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ موجودہ دور میں کافرانہ نظامِ زندگی سے بیزار ہو کر یہاں قرآنی انقلاب پیدا کرنے کی اہمیت پر بھی زور دیتے ہیں۔ وہ ایک اور جگہ مسلمان کی زندگی کو اسلامی نشرواشاعت کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

تا نخیزد بانگِ حق از عالمے
گر مسلمانی نیاسائی دمے

(جب تک دنیا میں اسلام کا بول بالا نہ ہو جائے تُو اگر مسلمان ہے تو اس وقت تک چین سے نہ بیٹھ)

منصور حلاج سے علامہ اقبالؒ نے یہ سوال بھی کیا تھا کہ خدا کے پیش کردہ نظامِ حیات کو دنیا میں مسلمانوں نے کس طرح نافذ و غالب کیا تھا۔ وہ ان کے اس اہم سوال کا جواب دیتے ہوئے یوں ہم کلام ہوتا ہے۔

یا بزورِ دلبری انداختند
یا بزورِ قاہری انداختند
زانکہ حق در دلبری پیدا تر است
دلبری از قاہری اولیٰ تر است

(انہوں نے خدائی نظام کو یا تو دلبری (جمال) سے قائم کیا یا انہوں نے قاہری (جلال) سے ایسا کیا۔ چونکہ اسلامی نظام زیادہ تر دلبری سے ظاہر ہے اس لئے دلبری (اخلاق) قاہری (حکومت) سے بہتر ہے)
(جاوید نامہ، ص۔ 719)

تاریخ اسلام کے مطالعہ سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ اس کا زیادہ تر فروغ اور غلبہ مسلمانوں کے مثالی کردار، قرآنی تعلیمات اور اسوۂ رسولؐ کی پیروی کی جاذبیت کی وجہ سے ہوا تھا۔ غیر مسلم ان کے اعلیٰ اطوار، پاکیزہ زندگی، قرآن کی دلنشین اور مؤثر تعلیم کو دیکھ کر حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے تھے نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ، ان کی قابلِ ستائش باتوں اور علمائے کبار کی دینداری، خداترسی، انسان دوستی، پاکیزگیٔ کردار اور خلوص و محبت سے زیادہ تر غیر مسلم متاثر ہو کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ یہ اخلاقی بلندی اسلام کی دلبری اور جمال کی واضح علامت تھی۔ اخلاقی اصولوں کے علاوہ جہاد کی بنا پر بھی مفتوح قومیں مسلمان ہو گئی تھیں۔ جہاد کے لئے خاص شرائط مقرر کی گئی ہیں لیکن قرآن و سنت کی تبلیغ و اشاعت ہر ایک مسلمان کا دینی فریضہ قرار دیا گیا ہے جیسا کہ ارشادِ نبویؐ ہے:- "بَلِّغُوا وَلَوْ آيَة" (ایک آیت ہی کیوں نہ ہو اسے دوسروں تک پہنچاؤ) مسلمانوں نے اپنے ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو ہمیشہ مدِ نظر رکھتے ہوئے جزیرۃ العرب سے باہر نکل کر اسلام کو پھیلایا۔ اگر وہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ہی میں

ہمیشہ رہتے تو آج اسلام دنیا کے دور دراز علاقوں تک نہ پھیلتا۔ قرآنِ حکیم میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کا ایک اصول یہ بھی بیان کیا گیا ہے:۔ "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ" (اپنے پروردگار کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ذریعے بلاؤ) محبت، اخلاق، نصیحت اور دلائل پر مبنی تبلیغ واشاعت کا نظام سمجھ دار اور حقیقت شناس لوگوں کے دل و دماغ کو فوراً متاثر کرتا ہے۔ غور و فکر اور محبّت کے نتیجے میں ان کے دلوں میں جو اسلام راسخ ہوتا ہے وہ اس اسلام سے زیادہ پائیدار اور مفید ثابت ہوتا ہے جو زبردستی یا تلوار کے ذریعے نافذ کیا جائے۔ ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں نے اتنے لوگوں کو برضا و رغبت مسلمان نہیں بنایا جتنے لوگوں کو عظیم المرتبت اور پاکیزہ کردار علماء، صلحاء، صوفیاء اور خدا پرست لوگوں نے اسلام کی طرف راغب کیا تھا۔ کیا یہ ان بزرگانِ دین کی سعیٔ مسلسل اور عملِ پیہم کا نتیجہ نہیں کہ زیادہ تر انسان اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے؟۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مرنے کے بعد بادشاہوں کو لوگوں کی نگاہ میں وہ مرتبہ اور عقیدت حاصل نہیں جو اللہ کے ان نیک بندوں کو ملا جنہوں نے اپنی دلبری یعنی اخلاق اور جمال کے ذریعے لوگوں کو مسلمان بنایا تھا۔ علّامہ اقبال ؒ جب منصور حلاّج سے زاہد اور عاشق کے درمیان فرق معلوم کرنا چاہتے ہیں تو وہ یہ مختصر جواب دیتا ہے۔

زاہد اندر عالمِ دنیا غریب
عاشق اندر عالمِ عقبیٰ غریب

(زاہد اس دنیا میں اجنبی ہے مگر عاشق عالمِ آخرت میں اجنبی ہوگا)

(جاویدنامہ، ص۔ 720)

اس جواب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عابد اور زاہد لوگ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر خدا کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں اس لئے عام لوگوں کے درمیان وہ اجنبی خیال کئے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس خدا کے سچّے عاشق اس دنیا میں خدا کے احکام پر عمل پیرا ہونے اور انہیں دوسروں پر نافذ کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اہلِ دنیا سے دور رہنے کی بجائے ان کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ ان کی یہ تمام تگ و دو محض خدا کی خوشنودی اور محبّت کی خاطر ہوتی ہے نہ کہ جنّت کے لالچ اور دوزخ کے خوف کی بنا پر۔ زاہد اور عابد لوگ تو جنّت کے لالچ اور دوزخ کے ڈر کی وجہ سے زُہد و عبادت کو اختیار کرتے ہیں مگر خدا کے حقیقی عشاق صرف خدا کی محبّت کو اپنے ہر قول اور فعل کی بنیاد بنایا کرتے ہیں۔ علّامہ اقبال ؒ بانگِ درا میں اس خیال کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر! جزا کی تمنّا بھی چھوڑ دے

(بانگِ درا، ص۔ 108)

منصور حلاج سے علامہ اقبالؒ نے یہ پوچھا تھا کہ تصوّف و معرفت کا مقصد نیستی اور فنا ہے یا نہیں اس نے ان کے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

سُکر یاراں از تہی پیمانگی است
نیستی از معرفت بیگانگی است
اے کہ جوئی در فنا مقصود را
در نمی یابد عدم موجود را
(جاوید نامہ، ص۔ 720)

(یار لوگوں کی بے خودی پیمانہ خالی ہونے کے سبب ہے 'نیستی (فنا) معرفت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اے مخاطب! تو فنا میں مقصد معرفت تلاش کر رہا ہے۔ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ عدم (غیر موجود) موجود کو نہیں پاتا)۔

علامہ اقبالؒ چونکہ خودی کو نقطۂ نورے اور سرّ از اسرارِ عشق' خیال کرتے ہوئے اس پر اپنے نظامِ فکر کی بنیاد اُستوار کرتے ہیں اس لئے وہ ہر اس فعل اور تصوّر کی مذمت کرتے ہیں جو خودی کی نفی کرے۔ وہ تصوّف جو انسان کو اپنی ہستی کی معرفت اور کائنات کی تسخیر کے فریضہ سے روک دے وہ اقبالؒ کی نگاہ میں مذموم ہے۔ اگر کوئی انسان اپنے آپ کو عدمِ محض خیال کرے تو پھر وہ خدا کی موجود ہستی کو کیسے پاسکتا ہے؟ جو خود نیست یا عدم ہو وہ موجود کو نہیں پاسکتا اس لئے منصور حلاّج کی زبان سے علامہ اقبالؒ تصوّف و معرفت کی غایت اثباتِ ذات self-assertion قرار دیتے ہیں نہ کہ نفئ ذات self negation یاد رہے کہ قرآنی تعلیمات نے نفسِ انسانی کی پاکیزگی 'اثبات' اہمیت وافادیت اور ارتقاء و ترقی پر بہت زیادہ زور دیا ہے اگر نفسِ انسانی ہیچ ہے تو پھر خدا کے احکام پر عمل کرنے کی تلقین اور انبیاء کی بعثت کی کیا ضرورت ہے؟۔

علاّمہ اقبالؒ حلاّج سے آخری یہ سوال کرتے ہیں کہ ابلیس نے اپنے آپ کو آدمؑ سے کیوں بہتر خیال کیا تھا۔ انسان تو فلک پیما ترقی کر رہا ہے اور ابلیس کس حال میں ہے؟ وہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے۔

زانکہ اُو در عشق و خدمت اقدم است
آدم از اسرارِ اُو نامحرم است
چاک کُن پیراہنِ تقلید را
تا بیاموزی ازُو توحید را

چونکہ وہ (ابلیس) اپنے مقصد کی لگن اور کام میں سب سے آگے ہے اس لئے آدم (انسان) اس کے بھیدوں سے واقف نہیں۔

(اے اقبال!) تو تقلید کا جامہ چاک کر دے تاکہ تو ابلیس سے توحید کا سبق سیکھ سکے)

(جاوید نامہ 'ص۔ 721)

ان اشعار میں مفکرِ اسلام' ترجمانِ قرآن اور شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے منصور حلاجؒ کی زبانی ابلیس کے کردار کی تین نمایاں ترین خصوصیات یعنی اپنے مقصد سے بے پناہ پیار (عشق) 'انسانوں کو مسلسل گمراہ کرنے کے کام (خدمت) اور خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہ کرنے کے عزمِ راسخ (توحید) کو بیان کیا ہے۔ عشق 'عملِ پیہم اور توحید پرستی علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ حیات کے اہم عناصر میں سے ہیں۔ وہ جب ابلیس کے اندر یہ تینوں صفات پاتے ہیں تو وہ اس دشمنِ ایمان اور بد ترین عدوئے انسان کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگر ابلیسِ لعین اپنے غلط مقاصد کے حصول کے لئے اتنی تندہی 'شیفتگی اور استقلال کے ساتھ کام کر سکتا ہے تو پھر اہلِ ایمان 'اسلام کے نام لیوا' خدا کی محبت کا دن رات دم بھرنے عشقِ رسولؐ کے بلند بانگ دعوے کرنے والے 'نظامِ مصطفٰیؐ کے علمبردار اور قرآنی تعلیمات کے مفسّرین اور ترجمان جوش و خروش اور ثابت قدمی سے اپنے نیک مقاصد کے لئے اتنی جدوجُہد سے کیوں گریزاں نظر آتے ہیں؟ کیا ہمیں اپنی موجودہ روشِ تقلید کو چھوڑ کر خدا کی توحید اور رسالتِ محمدیؐ کی نشرو اشاعت کے لئے جدوجُہد سے کام نہیں لینا چاہئے؟ علامہ اقبالؒ ابلیس کی یہ خوبیاں بیان کر کے ہمیں غیرت دلانا چاہتے ہیں تاکہ ہم بھی اپنے اعلیٰ و ارفع مقاصد کو حاصل کرنے اور خدا کے دین کی عظمت کے جھنڈے گاڑنے کے لئے پورے ذوق و شوق اور سعئ مسلسل کو اختیار کریں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا' عدالت کا' شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ (وفات ۶۳۲ھ)

خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ برِ صغیر پاک و ہند کے صوفیائے عظّام اور علمائے کرام میں سے تھے۔ انہوں نے اپنے علم 'اعلیٰ صفات' خدا پرستی اور خلوص سے کام لے کر سینکڑوں بندگانِ خدا کو اسلام کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ وہ سجستان (ترکستان) میں پیدا ہوئے تھے انہوں نے اپنے پیرو مرشد خواجہ عثمانی ہارونی (عراق) کی صحبت سے فیض اٹھایا اور ان کی معیّت میں حج بھی کیا تھا۔ قیامِ مدینہ کے دوران انہیں رسول کریمؐ نے ہندوستان میں تبلیغ اسلام کی بشارت دی اس لئے انہیں "سلطان الہند" کہا جاتا ہے۔ وہ 586ھ میں لاہور تشریف لائے اور سید علی ہجویریؒ المعروف داتا گنج بخش لاہور کے مزار پر کچھ وقت گزارا۔ جب وہ یہاں سے بھی فیض پا چکے تو داتا گنج بخشؒ کے بارے میں یہ شعر کہا۔

گنج بخشؒ فیضِ عالمؒ مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را راہنما

بعدازاں وہ ملتان اور دہلی سے ہوتے ہوئے اجمیر شریف چلے گئے۔ سفر کے دوران بھی انہوں نے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا اور بے شمار لوگوں کو حلقہ بگوشِ اسلام بنایا۔ اجمیر شریف کو انہوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنا کر ہدایت کی روشنی پھیلانی شروع کی۔ انہوں نے سلطان شمس الدین التمش کے عہد حکومت میں 632ھ میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔

تاریخِ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اسلام دنیا کے مختلف علاقوں میں نہ صرف تلوار کے زور سے پھیلا تھا بلکہ اس کی اشاعت میں صوفیائے کبار، علمائے عظام اور مسلمانوں کی عمدہ سیرت کی مساعی بھی شامل تھیں۔ خدا کے برگزیدہ انسان اور اسلام کے دیوانے بلاخوف و خطر کفر خیز علاقوں میں جا کر اپنی پاکیزہ زندگی اور علمی تبحر کے ذریعے غیر مسلموں کو حلقہ بگوشِ اسلام کرتے رہے۔ ان بلند ہمت صوفیاء اور علماء نے لوگوں کی زندگی میں اسلامی انقلاب پیدا کرنے سے قبل اپنی زندگی کو اسلامی تعلیم اور سیرتِ نبویؐ کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ دوسروں کی اصلاح کرنے سے پہلے انہوں نے اپنے باطن کی اصلاح کر لی تھی۔ اس باطنی اصلاح اور تزکیۂ نفس کے چند ضروری اصول ہیں جن میں سے ایک اصول مُرشد کی صحبت اختیار کرنا ہے۔ بعض حضرات کی رائے میں خدا کے برگزیدہ اولیاء کے مزارات پر جا کر وہاں ذِکرِ الٰہی میں مشغول ہونا بھی اصلاحِ باطن کا ایک طریقہ ہے جس طرح دنیا کے عظیم مفکرین اور مصنفین کی تصانیف ان کی موت کے بعد بے شمار انسانوں کے دل و دماغ کو متاثر کیا کرتی ہیں اسی طرح بزرگانِ دین کے زریں کارنامے، تبلیغی سرگرمیاں اور پاکیزہ اعمال و افکار بھی لاتعداد انسانوں کے اذہان و قلوب کو متاثر کر رہے ہیں۔ اصلاحِ باطن کی غرض سے جیّد صوفیاء اور خدا رسیدہ انسانوں کے مزارات پر حاضری بھی تاثیرِ صحبت سے خالی نہیں ہوتی چنانچہ "سلطان الہند" خواجہ معین الدین حسن چشتیؒ اجمیری نے جنہیں "پیرِ سنجر" بھی کہا جاتا ہے، سیّد علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ کے مرقد پر کچھ عرصہ گذارا تھا تاکہ وہ بعدازاں اپنے تبلیغی مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ علامہ اقبالؒ اس ضمن میں حضرت معین الدین چشتیؒ کی زندگی کے ایک اہم واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سیّدِ ہجویرؒ مخدومِ اُمم
مرقدِ اُو پیرِ سنجرؒ را حَرَم

(سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش) قوموں کے مخدوم ہیں، ان کا مزار پیرِ سنجرؒ (معین الدین چشتیؒ) کے لئے حرم) کا درجہ رکھتا ہے)

(اسرار خودی، ص۔ 51)

علامہ اقبالؒ نے پیرِ سنجرؒ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:۔ "خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ جو حضرت ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر تشریف لائے تھے" اس شعر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبالؒ اسلام کے سچے خادموں اور ان کی تبلیغی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کے مزارات پر حاضری کو ایمانی

تقویت اور باطنی تاثیر کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ وہ اپنی ایک مشہور نظم "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کی دینی خدمت کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
(بانگ درا، ص۔ 87)

خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے اپنی پُرکشش شخصیت، اعلیٰ کردار، خدا پرستی، انسان دوستی، خلوص اور محبت کی بنا پر ہندوستان کے ہزاروں غیر مسلموں کو اسلام کی دولت سے مالامال کر دیا تھا۔ علامہ اقبالؒ ان کی اسلامی خدمات کے بہت زیادہ معترف تھے وہ خواجہ غریب نواز اجمیریؒ کی ان خدماتِ جلیلہ کا ان وجد آور الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں۔

دلِ بیتاب جا پہنچا دیارِ پیرِ سنجرؒ میں
میسّر ہے جہاں درمانِ دردِ ناشکیبائی

یہ مرقد سے صدا آئی "حرم کے رہنے والوں کو
شکایت تجھ سے ہے اے تارکِ آئینِ آبائی"

ترا اے قیس! کیونکر ہو گیا سوزِ دروں ٹھنڈا
کہ لیلیٰ میں تو ہیں اب تک وہی اندازِ لیلائی

نہ تخمِ لاالہ تیری زمینِ شور سے پھوٹا
زمانے بھر میں رسوا ہے تری فطرت کی نازائی

تجھے معلوم ہے غافل کہ تیری زندگی کیا ہے؟
کنشتی ساز معمورِ نوا ہائے کلیسائی

(بانگِ درا، ص۔ 154)

ان اشعار کے ذریعے علامہ اقبالؒ برِّصغیر پاک و ہند کے ایک عظیم المرتبت ولی کی زبانِ مبارک سے موجودہ دَور کے مسلمانوں کو یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ اسلام کے اصولِ ترقی و کامرانی تو وہی ہیں لیکن مسلمان خود ہی انہیں چھوڑ کر زمانے میں ذلیل و خوار ہو گئے ہیں۔ لیلیٰ (اسلام) کے اندازِ لیلائی نہیں بدلے لیکن قیس (مسلمان) کا سوزِ دروں (عشق) خود ہی ٹھنڈا ہو چکا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی رائے میں اسلام کے اصول ہر دور میں ہماری ترقی اور رہنمائی کر سکتے ہیں اس لئے دورِ حاضر کے بعض مغرب زدہ مسلمانوں کا یہ تصوّر کہ اسلام ہمارے موجودہ مسائل کو حل نہیں کر سکتا بالکل غلط اور جہالت پر مبنی ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی لکھی ہوئی ایک مشہور فارسی رباعی کے ایک مصرع کو علامہ اقبالؒ نے ذراسی تبدیلی کے ساتھ اپنی فارسی کتاب "رموزِ بے خودی" کے ایک باب "در معنیٔ حریّتِ اسلامیہ و سرِّ حادثۂ کربلا" میں شامل کر کے اپنی عقیدت و محبّت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ حادثۂ کربلا اسلام کی تاریخ میں خاص اہمیّت کا حامل ہے۔ حضرت امام حسینؓ نے یزید کی ملوکیت کے خلاف سینہ سپر ہو کر جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ ان کی شہادت کے بارے میں خواجہ غریب نواز معین الدین چشتیؒ نے ایک فارسی رباعی کہی تھی جس کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ وہ رباعی یہ ہے۔

شاہ ہست حسینؓ، بادشاہ ہست حسینؓ
دیں ہست حسینؓ، دیں پناہ ہست حسینؓ
سرداد نہ داد دست در دستِ یزید
حقّا کہ بنائے لاالہ ہست حسینؓ
(معین الدّین چشتیؒ)

(حسینؓ بادشاہت کا حامل ہے، حسینؓ دین بھی ہے اور دین کی پناہ گاہ بھی۔
اس نے اپنا سر تو دے دیا لیکن یزید کی بیعت نہ کی، خدا کی قسم حسینؓ لاالہ کی بنیاد کا درجہ رکھتا ہے)

علامہ اقبالؒ بھی شہادت حسینؓ کا واقعہ اور فلسفہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لَا اِلٰہ گردیدہ است

(حسینؓ حق کی خاطر خاک اور خون میں غلطیدہ ہوئے اس طرح وہ لَا اِلٰہ کی بنیاد ہو گئے ہیں)
(رموزِ بے خودی، ص۔ 110)

سنائیؒ

حکیم مجدد سنائیؒ غزنی کے رہنے والے تھے وہ پانچویں صدی ہجری میں افغانستان کے مشہور شہر غزنی میں متولد ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی شاہی دربار سے وابستہ تھی لیکن بعد ازاں انہوں نے تصوّف و طریقت کا راستہ اختیار کر کے اپنے سابقہ طرزِ حیات کو تبدیل کر دیا تھا۔ ان کا شاعرانہ کلام تصوّف و معرفت کے اسرار و رموز کا گنجینہ نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے صوفیانہ خیالات کے اظہار کے لئے شاعری کو بڑی مہارت اور خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ ان کی بلند پایہ تصنیف "حدیقۃ الحقیقت" تصوّف و معرفت اور شاعری کے عمدہ محاسن کی آئینہ دار اور ان کے پاکیزہ احساسات کی ترجمان ہے۔ علامہ اقبالؒ ان کا بڑے ادب و احترام سے نام لیتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کو نہ صرف جلیل القدر صوفیاء سے محبت تھی بلکہ وہ ان شعراء سے بھی عقیدت رکھتے

تھے جنہوں نے اپنے کلام میں تصوّف و معرفت کے اسرار و رموز پر روشنی ڈالی تھی۔ حکیم سنائی غزنوی کو صوفیانہ ادب میں مخصوص مقام حاصل تھا۔ اقبالؒ کے روحانی مرشد مولانا رومؒ نے فریدالدین عطّارؒ اور حکیم سنائیؒ کے عظیم روحانی مرتبہ کو تسلیم کرتے ہوئے کہا تھا۔

عطّارؒ روح بُود و سنائیؒ دو چشمِ اُو
ما از پئے سنائیؒ و عطّارؒ آمدیم

(عطارؒ تصوّف و معرفت کے لئے بمنزلہ روح تھا اور حکیم سنائیؒ اس کی دو آنکھیں، ہم سنائیؒ اور عطّارؒ کے بعد آئے ہیں)

علّامہ اقبالؒ سر راس مسعود اور مولانا سیّد سلیمان ندویؒ کو افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ نے تعلیمی اصلاحات کے ضمن میں کابل آنے کی دعوت دی تھی چنانچہ علّامہ اقبالؒ نے 1933ء میں کابل کا سفر اختیار کیا۔ سفرِ کابل کے دوران انہوں نے وہاں کابل کے مشاہیر کے مزارات پر حاضری دی اور بعد ازاں اپنی شاعری اور نثر میں سفرِ افغانستان کے تاثرات بیان کئے۔ انہوں نے بالِ جبریل کی ایک طویل نظم میں حکیم سنائیؒ کے افکار کی روشنی میں اپنے شاعرانہ احساسات پر روشنی ڈالی تھی۔ اس نظم سے پہلے علّامہ اقبالؒ نے خود یہ الفاظ لکھے ہیں:۔

"اعلیٰ حضرت شہید امیر المومنین نادر شاہ غازی رحمتہ اللہ علیہ کے لطف و کرم سے نومبر 1933ء میں مصنّف کو حکیم سنائی غزنویؒ کے مزارِ مقدس کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ چند افکارِ پریشاں جن میں حکیم ہی کے ایک مشہور قصیدے کی پیروی کی گئی ہے، اس روزِ سعید کی یادگار میں سپردِ قلم کئے گئے۔

ما از پئے سنائی و عطّار آمدیم

(بالِ جبریل، ص۔ 314)

علّامہ اقبالؒ نے اپنی اس نظم کے دوسرے بند میں سنائیؒ کے ایک مصرع پر تضمین یوں لکھی ہے۔

ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے
گرفتہ چینیاں احرام و مکّی خفتہ در بطحا

(بالِ جبریل ص۔ 316)

اس شعر کا دوسرا مصرع حکیم سنائیؒ کا ہے جس میں مسلمانوں کی اسلام سے بے خبری، بے حسی، لاپروائی اور سیاسی غلامی کی طرف بڑے خوبصورت اور مؤثر انداز میں اشارہ کیا گیا ہے۔ علّامہ اقبالؒ کو افسوس ہے کہ وہ حکیم سنائی کے کلام کا مکمل طور پر مطالعہ نہیں کر سکے ورنہ وہ ان کے ادبِ گہربار سے مزید موتی نکال کر لاتے۔ وہ اس بات پر ان الفاظ میں اظہار تاسف کرتے ہیں۔

سنائی کے ادب سے میں نے غوّاصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لُولُوئے لالا
(بالِ جبریل ، ص۔ 318)

علامّہ اقبالؒ نے اپنے سفرِ افغانستان کے دوران افغانستان کے چند مشہور شہروں کو دیکھا تھا جن میں کابل و قندھار کے علاوہ غزنی بھی شامل تھا۔ غزنی میں انہوں نے حکیم سنائیؒ کے مزار کی زیارت کی اور عالمِ خیال میں حکیم سنائی سے چند اہم سوالات کئے جن کا زیادہ تر تعلق ملّتِ اسلامیہ کی موجودہ زبوں حالی سے تھا۔ وہ اپنی فارسی تصنیف "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق!" کے ایک عنوان "سفر و زیارتِ مزارِ حکیم سنائیؒ" میں حکیم سنائیؒ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

گفتم اے بینندۂ اسرارِ جاں!
بر تو روشن ایں جہان و آں جہاں

عصرِ ما وارفتۂ آب و گِل است
اہلِ حق را مشکل اندر مشکل است

مومن از افرنگیاں دید آنچہ دید
فتنہ ہا اندر حرم آمد پدید

تا نگاہِ اُو ادب از دل نخورد
چشمِ اُو را جلوۂ افرنگ بُرد

اے حکیمِ غیب، امامِ عارفاں
پختہ از فیضِ تو خامِ عارفاں

آنچہ اندر پردۂ غیب است گوے
بو کہ آبِ رفتہ باز آید بجُوے

(میں نے کہا اے رموزِ جاں کو دیکھنے والے! تجھ پر دونوں جہاں روشن ہیں۔
ہمارا زمانہ پانی اور مٹی (مادہ) کا شیدائی ہے اس لئے اہلِ حق مشکلات کا شکار ہیں۔
مومنوں نے اہلِ یورپ کے کرتوت دیکھ لئے ہیں ، اب تو ان کی وجہ سے حرم کے اندر فتنے جنم لے چکے ہیں۔
مسلمانوں کی نگاہ نے عشق کے آداب نہیں سیکھے اس لئے ان کی آنکھیں افرنگ کے جلووں سے خیرہ ہو گئی ہیں۔
اے غیب کو جاننے والے حکیم ، اے عارفوں کے امام! تیرے فیض سے خام عارف پختہ ہو جاتے ہیں۔
جو کچھ پردۂ غیب میں ہے تو بتا ، ہو سکتا ہے کہ اس طرح گذرا ہوا زمانہ لوٹ آئے)

(پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق ، ص۔ 863)

ان اشعار میں علامہ اقبالؒ نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ عہدِ حاضر کے مسلمان اسلامی تعلیمات اور جذبۂ عشقِ مصطفیٰ سے لاپرواہ ہو کر مادہ پرستی، فرقہ بندی اور مغربی تہذیب و تمدن کے پرستار بن چکے ہیں وہ حکیم سنائیؒ سے اس کے اسباب معلوم کرنا چاہتے ہیں جو علامہ اقبالؒ کے سوال کا مندرجہ ذیل جواب دیتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اپنی نظم بعنوان "روحِ حکیم سنائیؒ از بہشتِ بریں جواب می دہد" میں سنائیؒ کے جواب کو یوں منظوم کرتے ہیں۔

فکرِ جاں کُن چوں زناں بر تن مَتَن
ہمچو مرداں گوئے در میداں فگن

مومناں زیرِ سپہر لاجورد
زندہ از عشق اند و نے از خواب و خورد

می ندانی عشق و مستی از کجا ست؟
ایں شعاعِ آفتابِ مصطفیٰ ست

زندۂ تا سوزِ اُو درجانِ تُست
ایں نگہ دارندۂ ایمانِ تُست

باخبر شو از رموزِ آب و گل
پس بزن بر آب و گل اکسیرِ دل

دل زدیں سرچشمۂ ہر قوت است
دیں ہمہ از معجزاتِ صحبت است

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر!
علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

ہر زماں تدبیرہا دارد رقیب
تانگیری از بہارِ خود نصیب

"تو روح کی فکر کر اور عورتوں کی طرح جسم پر ناز نہ کر، تو مردوں کی طرح میدانِ عمل میں آ۔
اس نیلگوں آسمان کے نیچے مومن کھانے اور سونے سے نہیں بلکہ عشق کی بدولت زندہ ہیں۔
کیا تو نہیں جانتا کہ عشق و مستی کی بنیاد کیا ہے؟ یہ تو آفتابِ رسالتؐ کی ایک شعاع ہے۔
جب تک تیری روح میں عشقِ محمدؐ کا سوز ہے تو زندہ ہے، یہ عشقِ مصطفیٰ تیرے ایمان کا محافظ ہے۔
تو پانی اور مٹی (مادیت) کے بھیدوں سے باخبر ہو جا، اس کے بعد مادہ پرستی پر عشق کی اکسیر استعمال کر۔
دین کے سبب دل ہر طاقت کا سرچشمہ بن جاتا ہے، دیں سراپا (بزرگانِ دین کی) صحبت کے معجزات میں سے ہے۔

- اے بے خبر! تو دین کو کتابوں کے اندر مت تلاش کر، کتابیں علم و حکمت کا سبب ہیں لیکن دین نظر (محبت) سے پیدا ہوتا ہے۔
- اسلام کے دشمن ہر وقت اپنے منصوبوں میں لگے رہتے ہیں تاکہ تو گلستانِ اسلام کی بہار سے بہرہ ور نہ ہو سکے)۔

(پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، ص۔ 864-866)

علامہ اقبالؒ مندرجہ بالا اشعار کے ذریعے ملتِ اسلامیہ کے افراد کو یہ پیغام دینے کے خواہشمند ہیں کہ روح کو نظر انداز کر کے محض جسمانی تقاضوں کو پورا کرنا درست نہیں۔ جسم اور روح دونوں کے تقاضوں کی تکمیل ضروری ہے۔ وہ عالمِ مادی کی تسخیر کے بعد ہمیں عشقِ رسولؐ اور محبتِ اسلام کی اہمیت سے آگاہ کر کے کہتے ہیں کہ عشقِ مصطفیٰؐ ہمارے ایمان کا محافظ اور ہماری ملی زندگی کا باعث ہے۔ علاوہ ازیں وہ ہمیں بزرگانِ دین کی محبت کے فیض سے بھی آشنا کرتے ہیں۔ صرف کتابوں کے مطالعہ سے دین کی پوری حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ صالح انسانوں اور اسلام کے سچے خادموں کی صحبت کا اثر ہمارے دل و دماغ میں عجیب انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ حکیم سنائیؒ مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی قوموں کے ہتھکنڈوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ یورپی دشمن ہر وقت خلافِ اسلام سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں تاکہ ہم اسلام کے فروغ کے لئے مفید ثابت نہ ہو سکیں۔

حکیم سنائیؒ کے افکار و نظریات نے علامہ اقبالؒ کے روحانی پیر مولانا رومؒ کو بھی خاصا متاثر کیا تھا چنانچہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ میرے دل میں بھی وہی آتشِ عشق موجود ہے جو سنائیؒ نے رومیؒ کے دل میں پیدا کی تھی۔ رومیؒ کی عظمت تو اقبالؒ کے دل میں نقش ہے اس لئے وہ رومیؒ کے محسن کو بھی محبت و عقیدت سے یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مئے روشن ز تاکِ من فرو ریخت
خوشا مردے کہ در دامانم آویخت
نصیب از آتشے دارم کہ اوّل
سنائی از دلِ رومی برانگیخت

(میرے انگور کی بیل (شاعری) سے روشن شراب چھلکی اس لئے وہ انسان خوش بخت ہے جو میرے دامن سے وابستہ ہو گیا۔
میں اس آتشِ عشق کا حامل ہوں جسے سنائیؒ نے رومیؒ کے دل میں پہلے بھڑکایا تھا)

(ارمغانِ حجاز، ص۔ 960)

سیّد علی ہجویریؒ (وفات ۴۶۵ھ)

ابوالحسن علی ہجویریؒ المعروف داتا گنج بخش لاہوری پانچویں صدی ہجری کے نامور اور بلند پایہ عالم

دین اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ وہ افغانستان کے مشہور شہر غزنی کے قریب ایک گاؤں ہجویر میں متولد ہوئے تھے۔ علومِ ظاہری سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے ایک روشن ضمیر بزرگ ابوالفضل ختلیؒ کی بیعت سے کسبِ فیض کیا۔ وہ اپنے پیرومرشد حضرت ختلیؒ کے حکم کے مطابق لاہور آئے تاکہ یہاں اسلام کی تبلیغ واشاعت کا کام کیا جائے۔ انہوں نے کئی سالوں تک لاہور کو اپنی تبلیغی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز بنا کر ہزاروں انسانوں کو دینِ اسلام سے روشناس کرایا۔ ان کی مشہور ترین کتاب "کشف المحجوب" اسرارِ دین اور رموزِ طریقت کا بے مثال خزانہ تصوّر کی جاتی ہے۔ تصوّف و معرفت کی اس کتاب کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اس لئے اسے صوفیانہ ادب میں کافی نمایاں مقام دیا گیا ہے۔

علاّمہ اقبالؒ کو حضرت علی ہجویریؒ کی شخصیت اور دینی سرگرمیوں کا بہت زیادہ اعتراف تھا۔ وہ انہیں عظیمُ المرتبت ولی اللہ خیال کر کے بے حد عقیدت و محبت کے ساتھ یاد کرتے تھے۔ اسرارِ خودی میں ہمیں اس عقیدت و محبّت کا واضح ثبوت مل جاتا ہے۔

خودی کا نظریہ علاّمہ اقبالؒ کے تاروپود میں بکھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ نظریہ ان کے دیگر اہم تصوّرات کا مرکز و محور ہے اس موضوع کی حمایت میں علاّمہ اقبالؒ قرآن، احادیث، مطالعۂ کائنات، مشاہدۂ فطرت، فلسفہ، اخلاقیات اور تصوّف و معرفت سے مثالیں پیش کرتے ہیں۔ خودی کی اہمیّت، استحکام، دشمن کے وجود کی افادیّت، اثباتِ ذات اور بقاء کے ضمن میں انہوں نے برِّصغیر پاک وہند کے اس ممتاز عارف، عالم، صوفی اور ولی سیّد علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ کی زندگی کا ایک واقعہ منظوم کیا ہے۔ مَرو (ترکستان) کے علاقہ کا ایک نوجوان آکر سیّد علی ہجویریؒ سے کہتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے ہاتھوں تنگ ہے وہ ان سے پوچھتا ہے کہ میں دُشمنوں میں گھِر کر زندگی کیسے بسر کروں۔ وہ اس نوجوان کے شکوۂ جور و جفا اور گلۂ روزگار کو سن کر اسے یہ مشورہ دیتے ہیں۔

فارغ از اندیشۂ اغیار شو
قوّتِ خوابیدۂ بیدار شو

سنگ چوں بر خود گمانِ شیشہ کرد
شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد

ناتواں خود را اگر رہرو شمرد — ناتواں
نقدِ جانِ خویش با رہزن سپرد — نقد

تا کُجا خود را شماری ماء و طیں
از رگِلِ خود شعلۂ طوُر آفریں

داتا گنج بخشؒ کی رائے میں محض کھانا پینا وغیرہ انسانی زندگی کا مقصد نہیں بلکہ اس کی غرض وغایت حق

پرستی، خودی کی مضبوطی، بقا، خفیہ قوتوں کی بیداری، انقلاب آفرینی، ناساز گار حالات سے ستیزہ کاری اور جفاکشی ہے۔ یہ تمام مقاصد علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ حیات اور نظامِ خودی کے بنیادی اصول ہیں اس لئے انہوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "مثنوی اسرارِ خودی" میں سید علی ہجویریؒ کی اس داستان کو ذرا طوالت سے بیان کیا ہے۔

اس سے قبل یہ بات صریحاً بتائی جاچکی ہے کہ علامہ اقبالؒ کو ان علمائے عظام اور صوفیائے کبار سے بے حد محبت اور عقیدت تھی جنہوں نے اسلامی تعلیمات کے فروغ اور غلبۂ اسلام کے لئے قابلِ قدر خدمات سرانجام دی تھیں۔ وہ خون دینے والے مجنوں کے تو مدّاح تھے لیکن محض چُوری کھانے والے مجنوں کو وہ صحیح عاشقِ اسلام تسلیم نہیں کرتے تھے۔ سید علی ہجویریؒ وہ ممتاز ولی اور اسلام کے سچّے خادم ہیں جو تبلیغِ اسلام کے لئے ہندوستان آئے تھے۔ انہوں نے شہر لاہور کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنا کر ہزاروں انسانوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا تھا۔ ان کی قابلِ ستائش اسلامی خدمات کا اقبالؒ یوں تذکرہ کرتے ہیں۔

سیدِ ہجویر مخدومِ اُمَم
مرقدِ اُو پیرِ سنجرؒ را حَرَم

بند ہائے کہسار آساں گیسخت
در زمینِ ہند تخمِ سجدہ ریخت

عہدِ فاروقؓ از جمالش تازہ شُد
حق ز حرفِ اُو بلند آوازہ شُد

پاسبانِ عزّتِ اُمُّ الکتاب
از نگاہش خانۂ باطل خراب

خاکِ پنجاب از دَمِ اُو زندہ گشت
صبحِ ما از مہرِ اُو تابندہ گشت

(سید ہجویریؒ قوموں کے مخدوم ہیں ان کا مزار پیرِ سنجرؒ (معین الدین چشتیؒ) کے لئے مقدس مقام ہے۔
انہوں نے آسانی سے پہاڑ کے بندھنوں کو توڑا اور ہندوستان کی سرزمین میں سجدہ ریزی کا آغاز کیا۔
ان کے جمال (اخلاقی صفات) کی وجہ سے عہدِ فاروقیؓ کی یاد تازہ ہو گئی کیونکہ ان کی باتوں سے اسلام کو کافی شہرت ملی۔
وہ قرآنِ حکیم کی حُرمت کے پاسبان ہیں، ان کی نگاہ سے باطل کا خانہ خراب ہو گیا تھا۔
پنجاب کی سرزمین ان کے دم قدم سے زندہ ہوئی، اصل میں ہماری صبح ان کے آفتاب سے روشن بن گئی)
(اسرارِ خودی، ص۔ 52۔ 51)

سیّد علی ہمدانیؒ (پیدائش ۱۴ ۷ ھ)

سیّد علی ہمدانیؒ کشمیر کے مشہور ترین عالمِ دین، صاحبِ طریقت اور روشن ضمیر ولی تھے۔ علومِ ظاہری اور علومِ باطنی میں وہ خاص مہارت کے مالک تھے۔ خدا تعالیٰ نے انہیں بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ نہ صرف عالِم اور صوفی تھے بلکہ وہ بہت بڑے مناظر بھی تھے۔ انہوں نے سلطان شہاب الدین کے دَورِ حکومت میں کشمیر کو اپنی علمی اور دینی سرگرمیوں کا عظیم مرکز بنا کر لاتعداد لوگوں کو اسلامی تعلیمات کی حقانیّت کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ علاوہ ازیں انہوں نے ہندو پنڈتوں سے علمی مناظرے کر کے انہیں شکست دی اور حق کا بول بالا کیا۔ ان مذہبی اور علمی کارناموں کے علاوہ انہوں نے اپنے مولد و مسکن یعنی ایران سے کئی صناعوں، نقاشوں، قالین بافوں اور خطاطوں کو کشمیر میں آنے کی رغبت دلائی چنانچہ ان کی آمد سے اہلِ کشمیر ان فنون سے آشنا ہوئے۔ سیّد علی ہمدانیؒ کی مشہور ترین کتاب "ذخیرۃ الملوک" میں مسلمان حکمرانوں کو حکومت کے طور طریقوں سے آگاہ کیا گیا ہے تاکہ وہ صحیح معنوں میں خدمتِ خلق اور اطاعتِ خدا کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔

سیّد علی ہمدانیؒ کشمیر کے ایک عظیم المرتبت عالِم، مبلّغ، صوفی اور مناظر تھے۔ ان کی مخلصانہ اور مسلسل کوششوں کی وجہ سے کشمیر میں زیادہ تر اسلام پھیلا اور لاتعداد انسان مسلمان ہوئے۔ انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے کشمیر کی مذہبی، تمدّنی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی پر دُور رَس اثر ڈالا تھا۔ سیّد علی ہمدانیؒ کی ان اسلامی خدمات نے علاّمہ اقبالؒ کے دل میں ان کی عظمت اور اسلام پرستی کا گہرا نقش مرتسم کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنی ایک بلند پایہ فارسی کتاب "جاوید نامہ" کے باب "آنسوئے افلاک" میں سیّد علی ہمدانیؒ یا شاہ ہمدانؒ سے ابلیس، اہلِ کشمیر کی موجودہ زبوں حالی اور بادشاہت کی اصل کے بارے میں چند سوال کئے تھے۔ سب سے پہلے ابلیس کے بارے میں سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

بندۂ کز خویشتن دارد خبر
آفریند منفعت را از ضرر

بزمِ باديو است آدم را وبال
رزمِ باديو است آدم را جمال

خویش را بر اہرمن باید زدن
تُو ہمہ تیغ، آں ہمہ سنگِ فسن

تیز تر شو تا فتد ضربِ تُو سخت
ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت

(جوانسان اپنی ذات سے آگاہی (خودی) رکھتا ہے وہ نقصان سے نفع پیدا کیا کرتا ہے۔
دیو (شیطان) کے ساتھ مجلس رکھنا انسان کے لئے وبال ہے اور اس کے ساتھ جنگ آزمائی جمال ہے۔
اپنے آپ کو شیطان پر غالب کرنا چاہئے کیونکہ تو سراپا تلوار ہے اور وہ کلیتاً سان ہے۔
تو اپنے آپ کو زیادہ تیز کر لے تاکہ تیری ضرب سخت ہو ورنہ تو دو جہانوں میں بدبخت بن جائے گا)
(جاوید نامہ ' ص۔ 748)

ان اشعار میں شاہِ ہمدان" (سیّد علی ہمدانی") کی زبانی علاّمہ اقبال" ہمیں اس بات سے روشناس کرانا چاہتے ہیں کہ خودشناس یا اپنی خودی سے آشنا انسان شیطان کے وجود سے گھبرانے کی بجائے اسے زیر کرتا ہے اس طرح اس کی خودی مضبوط ہو جاتی ہے اور وہ بدی کو نیکی میں بدل دیتا ہے۔ شیطان کی دوستی انسان کے لئے نقصان دہ ہے لیکن اس کے ساتھ جنگ کرنے سے اسے کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ ہمیں یہ نکتہ بھی سمجھاتے ہیں کہ ہماری مثال تلوار کی ہے اور شیطان سان کی حیثیت رکھتا ہے جس طرح سان کے بغیر تلوار میں تیزی اور چمک پیدا نہیں ہوتی اسی طرح شیطان کے وجود کے بغیر ہماری شخصیت میں بھی نکھار پیدا نہیں ہوتا۔

علاّمہ اقبال" نے سیّد علی ہمدانی" سے دوسرا سوال یہ کیا تھا کہ خطۂ کشمیر اپنی بے بہا قدرتی خوبصورتی ' سرسبزی اور صناعی کے باوجود غلامی اور زبوں حالی کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ شاہ ہمدان" سے اس کی وجہ معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ جواب میں فرماتے ہیں۔

با تُو گویم رمزِ باریک اے پسر!
تن ہمہ خاک است و جاں والا گہر

جسم را از بہرِ جاں باید گداخت
پاک را از خاک می باید شناخت

گر نگہداری بمیرد در بدن
ور بیفشانی فروغِ انجمن

خویش را نایافتن نابودن است
یافتن خود را بخود بخشودن است

جلوہ بدمستے کہ بیند خویش را
خوشتر از نوشینہ داند نیش را

تا زجاں بگذشت ' جانش جانِ اُوست
ورنہ جانش یک دودم مہمانِ اُوست

(اے بیٹا! میں تجھے ایک گہری بات بتاتا ہوں کہ جسم سراپا مٹی ہے اور روح بیش قیمت موتی۔

جسم کو روح کے لئے پگھلانا چاہئے اور پاک چیز (روح) کو مٹی (جسم) سے جُدا پہچاننا چاہئے۔
اگر تو اسے بچا کر رکھے تو وہ جسم میں ختم ہو جائے گی اور اگر تو اسے نچھاور کر دے گا تو وہ ملّی فروغ کا باعث ہو گی۔
اپنے آپ کو نہ پانا موت کی علامت ہے اپنی ہستی سے آگاہ ہو جانا ہی زندگی ہے۔
جو شخص نورِ ایزدی کی وساطت سے خودی پالیتا ہے وہ شہد (آرام) کی نسبت ڈنگ (تکلیف) کو بہتر خیال کرتا ہے۔
جب وہ اپنی جان کو قربان کر بیٹھا تو اس کی جان اسی کی ہوتی ہے ورنہ اس کی جان ایک دو گھڑیوں کی مہمان ہوتی ہے)۔

(جاوید نامہ ،ص۔ 752-751)

آپ نے غور کیا کہ کس طرح موجودہ مفلوک الحال ، محکوم اور خودی ناشناس کشمیریوں کو درسِ شہادت دیا گیا ہے۔ سیّد علی ہمدانیؒ کے جواب میں یہ نکتہ پوشیدہ رکھا گیا ہے کہ جب تک کشمیری جان پر جسم کو ترجیح دیتے رہیں گے وہ غلامی اور ذلّت سے نجات نہیں پا سکیں گے۔ جسم سے جان زیادہ عزیز ہوتی ہے لیکن خوددار اور غیرت مند انسانوں کی نظر میں عزّت و آبرو جان سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی عزّت پر اپنی جان کو قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ فارسی میں ایک ضرب المثل ہے "مال نثارِ جاں ، جاں نثارِ آبرو" (دولت جان پر نثار کی جاتی ہے اور جان کو آبرو پر قربان کر دیا جاتا ہے)۔ جو لوگ خوددار ، خودی شناس ، خداپرست اور اعلیٰ مقاصد کے حامل ہوتے ہیں وہ آزادی اور دین کی خاطر اپنی جان کو فوراً نچھاور کر دیتے ہیں۔ موجودہ اہلِ کشمیر کے لئے شہادت ہی راہِ نجات ہے۔

علامہ اقبالؒ نے شاہ ہمدان (سیّد علی ہمدانیؒ) سے یہ سوال کیا تھا کہ ہمارے عوام غریب ہیں اس کے باوجود حکمران ہم سے خراج اور ٹیکس وغیرہ وصول کرتے رہتے ہیں خراج کی محتاج اس قیصری کی حقیقت کیا ہے؟۔

اصلِ شاہی چیست اندر شرق و غرب
یا رضائے اُمّتاں یا حرب و ضرب

فاش گویم با تُو اے والا مقام!
باج را جُزبا دوکَس دادن حرام

یا اُولیَ الاَمر مِنکُم شانِ اُوست
آیۂ حق حجتِ و برہانِ اوست

یا جواں مردے چو صرصر تُند خیز
شہرگیر و خویش باز اندر ستیز

روزِ کیں کشور کشا از قاہری
روزِ صلح از شیوہ ہائے دلبری

(مشرق اور مغرب میں حکومت کی اصلیّت کیا ہے؟ حکومت یا تو قوم کی مرضی سے ہوتی ہے یا جنگ وطاقت کی بنا پر۔
اے بلند مرتبہ مخاطب! میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ دو انسانوں کے علاوہ کسی اور کو خراج (ٹیکس) دینا حرام ہے۔
یا وہ مسلمان حکمران جسے قرآن نے اولی الامر منکم کہا ہے اور یہ قرآنی آیت اس کے لئے حجت ہے
یا وہ نوجوان مسلمان جو بادِ صرصر کی طرح طوفان خیز' فاتح اور لوگوں پر مہربان ہو۔
وہ جنگ کے روز اپنی طاقت سے کشور کشا ہو لیکن صلح کے روز وہ دلبرانہ اطوار سے حکومت کرے)۔
(جاوید نامہ' ص۔ 753-752)

سیّد علی ہمدانیؒ کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت عموماً دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ حاکم لوگوں کی مرضی سے ان پر حکومت کرے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان کی مرضی کے بغیر طاقت کے بل بوتے پر ان کا حکمران بن بیٹھے۔ اگر دوسرے طریقِ حکومت میں بہتر تبدیلیاں لائی جائیں اور لوگوں پر مہربانی کی جائے تو پھر یہ بھی مستحسن طریقہ ہو سکتا ہے۔ درحقیقت حکومت نہ تو غلط عوامی مرضی کی پابند ہے اور نہ محض ذاتی اقتدار کے لئے۔ اسلام کی رو سے حکومت خدائی احکام کو نافذ اور غالب کرنے کا ایک اہم اور مؤثر ذریعہ ہے۔ غیر مسلموں کی حکومت اور مسلمانوں کی غیر اسلامی حکومت دونوں ہی قرآنی نقطۂ نگاہ سے غلط ہیں۔ بہتر طریق تو وہ ہے جس میں خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرنے والے مسلمان گروہ کو سیاسی اقتدار دیا جائے تاکہ وہ قرآنی نظام اور شریعتِ محمدیؐ کے مطابق حکومت کر سکے جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے .... "اَطِیْعُو اللّٰہَ وَ اَطِیْعُو الرَّسُولَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" (تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی بھی جو تم میں سے صاحبانِ امر ہوں)۔ مسلمان حاکم کی اطاعت' اطاعتِ خدا اور رسولؐ کے ساتھ مشروط ہے یعنی اگر مسلمان حکومت خدائی نظام کے مطابق کام کرے تو اس کی فرمانبرداری کی جائے۔ حدیث شریف میں آیا ہے.... "لَاطَاعَۃُ الْمَخْلُوقَ فِی مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ" (خدا کی نافرمانی کر کے مخلوق کی اطاعت درست نہیں)۔ اس لحاظ سے کسی کی اطاعت بھی جائز نہیں اگر یہ خدا کی نافرمانی پر مبنی ہو۔ یہ ایک قاعدہ کلّیہ ہے اسے تمام حالات میں مدِّ نظر رکھنا چاہئے۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے.... "سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُہُمْ" (قوم کا سردار دراصل افرادِ قوم کا خادم ہوا کرتا ہے)۔ سرور کائناتؐ کے اس ارشاد کی رُو سے جو شخص لوگوں کی خدمت کرتا ہے وہی درحقیقت ان کا سردار ہے۔ حکومت کا دوسرا طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی مسلم ملک میں شعائرِ اسلام اور قرآنی احکام کی بجائے وہاں کوئی اور نظامِ حکومت رائج ہو اور وہاں کے باشندوں کی اکثریت اپنی جہالت یا دوسروں کے

غلط پروپیگنڈہ کی بنا پر غیر اسلامی حکومت پر قانع ہو یا وہ ایسے لوگوں کو منتخب کرنے کی خواہشمند ہو جو ان کی دولت پرستی کو تو تقویت پہنچا سکے لیکن قرآنی نظام سے گہری وابستگی نہ رکھتی ہو۔ ایسے حالات میں اگر کوئی اسلام پرست شخص یا گروہ ان کی مرضی کے بغیر اپنی طاقت کے بھروسے پر اسلام کے فروغ اور لوگوں کی بہبود کے لئے حکومت پر قبضہ کر لے تو وہ بھی لوگوں سے خراج وصول کر سکتا ہے اس طریق حکومت میں قاہری اور دلبری کے دونوں پہلو موجود ہونے چاہئیں۔

علّامہ اقبالؒ ان علماء، صوفیاء اور بزرگانِ دین و وطن سے بے پناہ عقیدت و محبت رکھتے تھے جنہوں نے اسلام کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں اس لحاظ سے ان کی محبت و عقیدت کا معیار صرف اسلام پرستی ہے۔ سیّد علی ہمدانیؒ نے اہلِ کشمیر کے لئے جو اسلامی خدمت کی تھی، علّامہ اقبالؒ اس کے پیشِ نظر ان کو یوں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

سیّد السادات، سالارِ عجم
دستِ اُو معمارِ تقدیرِ اُمم

تا غزالیؒ درسِ اللہ ھُو گرفت
ذکر و فکر از دودمانِ اُو گرفت

مُرشدِ آں کشورِ مینوُ نظیر
میر و درویش و سلاطین را مشیر

خطّہ را آں شاہِ دریا آستیں
داد علمُ و صنعت و تہذیب ودیں

آفرید آں مرد ایرانِ صغیر
با ہنر ہائے غریب و دلپذیر

((سیّد علی ہمدانیؒ) سادات کے سردار اور عجم کے قافلہ سالار تھے۔ ان کا ہاتھ قوموں کی تقدیر بنانے والا ہے

جب سے غزالیؒ نے اللہ ھُو کا درس لیا اس نے ان کے خاندان سے ذکر اور فکر کی تعلیم لی تھی۔
وہ کشمیر جنت نظیر کے مرشد تھے، وہ سردار اور درویش ہونے کے علاوہ بادشاہوں کے مشیر بھی تھے۔
اس سخی بادشاہ نے کشمیر کو علم، صنعت، تہذیب اور دین کی دولت سے مالامال کر دیا تھا
انہوں نے عجیب و غریب اور دلپذیر ہنر کشمیر میں لا کر اسے چھوٹا ایران بنا دیا تھا)۔

سیّد علی ہمدانیؒ اپنے ساتھ ایران سے کافی علماء، فضلاء، صوفیاء اور ہنر مند لائے تھے جنہوں نے اپنی اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت کشمیر کو مذہبی، صنعتی، تہذیبی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز بنا دیا تھا۔ ایسی بے مثال، خدا پرست، انسان دوست اور علم پرور شخصیّت کو خراجِ عقیدت پیش نہ کرنا اقبالؒ کے مسلکِ درویشی کے خلاف تھا۔

شیخ احمد رفاعیؒ (وفات ۵۷۰ھ)

حضرت شیخ احمد بن ابی الحسین الرفائی چھٹی صدی ہجری کے آغاز میں بصرہ میں پیدا ہوئے۔ وہ نہ صرف علومِ طریقت کے شناسا تھے بلکہ وہ علومِ شریعت کے بھی ماہر تھے۔ انہیں طریقۂ رفاعیہ کا بانی تصوّر کیا جاتا ہے۔ تصوّف و معرفت کو پروان چڑھانے کے لئے چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں کئی صوفیانہ مکاتبِ فکر مثلاً طریقۂ قادریہ، طریقۂ رفاعیہ، طریقۂ سہروردیہ، طریقۂ شاذلیہ اور طریقۂ مولویہ وغیرہ رائج تھے۔ شیخ احمد رفاعیؒ نے بھی اپنا مخصوص طریقہ "رفاعیہ" کی بنیاد ڈالی تھی وہ ہمیشہ تصوّف اور شریعت میں غیر اسلامی اور عجمی افکار و نظریات کی آمیزش کے سخت خلاف رہے ہے۔ ان کی رائے میں غیر اسلامی اور عجمی تصوّرات نے کافی حد تک اسلام کی صحیح صورت کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ علاّمہ اقبالؒ بھی اس نظریئے کے زبردست حامی تھے اس لئے انہوں نے شیخ احمد رفاعیؒ کے اس تصور کو یہاں خاص جگہ دی ہے۔

شیخ احمد رفاعیؒ سے علاّمہ اقبالؒ کی عقیدت اور ذکرِ جمیل کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے دوستوں اور مریدوں کو خالص عربی اسلام کی پیروی کی بار بار تلقین کرتے رہے تاکہ عجمی اسلام سے دُور رہیں۔ کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں کہ اسلام جب تک جزیرۃ العرب میں رہا اس وقت تک وہ کافی حد تک دوسرے مذاہب، غلط فلسفیانہ مکاتب، رہبانیت آمیز تصوّف اور زندگی کش غیر اسلامی رسومات اور عقائد کے تباہ کن اثرات سے محفوظ رہا۔ جب مسلمانوں کا دوسری قوموں اور تہذیبوں کے ساتھ تعلق قائم ہوا تو مسلمانوں میں کافی غیر اسلامی عناصر رواج پا گئے جنہیں علاّمہ اقبالؒ "عجم" کہتے ہیں۔ عجم سے ان کی مراد محض ایران نہیں بلکہ وہ تمام غیر اسلامی اور غیر قرآنی عناصر مراد ہیں جنہوں نے اسلام کے صاف و شفاف سرچشمۂ زندگی کو گدلا کر دیا تھا چنانچہ مفکرِ اسلام اور شاعرِ مشرق علاّمہ اقبالؒ حضرت شیخ احمد رفاعیؒ کی تنقیدِ عجم کا ایک واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

شیخ احمدؒ سیدِ گردوں جناب
کاسبِ نُور از ضمیرش آفتاب

بامریدے گفت اے جانِ پدر!
از خیالاتِ عجم باید حَذَر

زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گذشت
از حدِ دین نبیؐ بیروں گذشت

اے برادر! ایں نصیحت گوش کُن
پندِ آں آقائے ملّت گوش کُن

قلب را زیں حرفِ حق گرداں قوی
با عرب درساز تا مُسلم شوی

(شیخ احمد رفاعیؒ بلند پایہ سیّد ہیں سورج ان کے ضمیر سے نور کا اکتساب کرتا ہے
انہوں نے اپنے ایک مرید سے کہا "اے بیٹا! تجھے عجم کے خیالات (غیر اسلامی افکار) سے پرہیز کرنا چاہئے۔
اگرچہ عجم کے خیالات آسمان سے بھی آگے چلے گئے ہیں لیکن وہ دینِ مصطفویؐ کی حدود میں نہیں رہے
اے بھائی! تو اس نصیحت پر دھیان دے اور ملّتِ اسلامیہ کے آقا کی نصیحت کو مت بھول۔
تو اپنے دل کو اس سچّی بات سے مضبوط بنا اور صحیح مسلمان ہونے کے لئے عرب سے موافقت اختیار کر)۔
(رموزِ بے خودی، ص۔ 129)

علامہ اقبالؒ اس تصوّف اور صوفی کے خلاف ہیں جس کے نظریات اسلام پر مبنی نہیں۔ وہ ایک اور جگہ بجا فرماتے ہیں ع۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
(عجم ابھی تک دینِ اسلام کے بھیدوں سے واقف نہیں)

شبلیؒ (وفات ۳۳۴ھ)

ابو بکر شبلیؒ چوتھی صدی ہجری کے ممتاز صوفیاء اور شیخانِ طریقت میں سے تھے۔ وہ حسین بن منصور حلّاج کے قریب ترین ساتھیوں اور ہم مشرب اربابِ طریقت میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے سیّد الطائفہ جنید بغدادیؒ کی صحبت سے کافی فیض اٹھایا تھا اس لئے وہ اپنے علم، زہد اور صوفیانہ ذوق کی بنا پر کافی عزّت و احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ علّامہ اقبالؒ نے ان کے مقامِ تصوّف و معرفت کا اکثر اپنے کلام میں بڑی محبّت و عقیدت سے ذکر کیا ہے۔ وہ انہیں بلند مرتبہ صوفیاء اور عرفائے کے گروہ سے متعلق سمجھتے تھے۔

علامہ اقبالؒ فقر و شاہی، جمال و جلال اور دلبری و قاہری کو اسلام کی دو شاخیں خیال کرتے ہیں۔ ایک سوز ہے اور دوسری شانِ ساز ہے ایک سے شخصیّت میں نیاز کا رنگ پیدا ہوتا ہے تو دوسری سے نار کی صفت جنم لیتی ہے۔ وہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے لئے ممد و معاون اور غلبۂ اسلام کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ فقر، جمال، دلبری، سوز اور نیاز تصوّف و معرفت کے عکاس ہیں شاہی، جلال، قاہری، سوز اور ساز حکومت و طاقت کے ترجمان ہیں عموماً فقر میں طاقت و حکومت کی تمام صفات بھی شامل ہوتی ہیں اسی لئے وہ فقر کو شاہی پر ترجیح دینے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ علامہ موصوف مسلم حکومت کو بھی فقر کی خوبیوں کا حامل دیکھنے کے لئے بے چین دکھائی دیتے ہیں۔ بایزید بسطامیؒ اور ابو ذر غفاریؒ کے علاوہ وہ شبلیؒ کو بھی فقر اور لاہوتی صفات کا نمائندہ تصوّر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

فرد از توحید لاہوتی شود
ملّت از توحید جبروتی شود

بایزیدؒ و شبلیؒ و بوذرؓ ازوست
اُمتّان را طغرل و سنجر ازوست

ہر دو از توحید می گیرد کمال
زندگی ایں را جلال آں را جمال

ایں سلیمانی و آں سلمانی است
آں سراپا فقر و ایں سلطانی است

(فرد توحید سے لاہوتی (روحانی صفات کا حامل) ہو جاتا ہے اور قوم اس سے جبروتی (طاقت واقتدار کی حامل) بن جاتی ہے۔
توحید نے جیّد لاہوتی افراد مثلاً بایزیدؒ، شبلیؒ اور ابوذر غفاریؓ پیدا کئے ہیں اور طغرل و سنجر جیسے عظیم الشان مسلم حکمران بھی۔
یہ دونوں گروہ توحید سے کمال حاصل کرتے ہیں، لاہوتی افراد کی زندگی پُر جمال ہوتی ہے اور باجبروت مسلمان حکمرانوں کی زندگی میں جلال آجاتا ہے۔
ایک پہلو سلیمانی (حکومت) کا آئینہ دار ہے اور دوسرا سلمانی (فقر) کا ترجمان ہوتا ہے، ایک سراپا فقر ہے اور دوسرا سراپا سلطانی ہے)۔

(جاوید نامہ، ص۔ 780)

شیخ احمد سرہندی امام مجدّد الف ثانیؒ (پیدائش ۹۷۱ھ، فوت ۱۰۳۴ھ)

شیخ احمد سرہندی امام مجدّد الف ثانیؒ علومِ ظاہری اور علومِ باطنی میں کمال رکھتے تھے۔ علمی اور دینی کمالات کے علاوہ انہوں نے اپنے قلم اور زبان سے بھی ہمیشہ باطل نظریات اور غیر اسلامی حکومتی اقدامات کے خلاف جہاد کیا تھا۔ مغلیہ بادشاہ اکبر نے جب ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے "دینِ الٰہی" کا شوشہ چھوڑا اور جہانگیر نے اپنے درباریوں کے لئے سجدہ کرنے کی رسم جاری کی تو مجدّد الف ثانیؒ نے ڈٹ کر ان غیر اسلامی پالیسیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اکبر کے دربار میں بڑے ذہین وفطین مسلمان علماء اور فضلاً مثلاً ابو الفضل اور فیضی وغیرہ موجود تھے لیکن وہ اکبر کے فتنۂ ارتداد کو دیکھ کر کچھ نہ کر سکے۔ اربابِ علم تو دم بخود رہے لیکن ایک صاحبِ طریقت اور عاشقِ شریعتِ اسلامیہ یہ سب کچھ دیکھ کر خاموش نہ رہ سکا۔ ان کے لسانی اور قلمی جہاد نے ان دو فتنوں کی روک تھام کر دی۔ علاّمہ اقبالؒ مجدّد الف ثانیؒ کے بے حد معترف ومدّاح تھے۔ 1935ء میں وہ حضرت کے مزار کی زیارت کے لئے سرہند تشریف لے گئے اس سفر میں ان کا فرزندِ ارجمند جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال بھی ان کے ساتھ تھا۔
امام مجدّد الف ثانی سرہندیؒ کے افکار و نظریات سے علاّمہ اقبالؒ نے کافی اثر قبول کیا تھا۔ مجدّد الف ثانی نے شریعتِ اسلامیہ کی ترویج واشاعت اور تصوّف ومعرفت کی اصلاح کے لئے بعض خدمات اس

طرح سرانجام دی ہیں کہ انہیں اسلام کے مجددین میں نمایاں مقام دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ نامساعد حالات میں بھی کلمۂ حق بلند کرنے اور اسلامی تعلیمات کی حقانیت اور برتری کو ثابت کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ وہ بدل و جان دینِ اسلام کو غالب و نافذ دیکھنے کے لئے بے حد مضطرب رہتے تھے اس لئے علامہ اقبالؒ ہمیشہ ان کا بڑے احترام و ادب سے نام لیا کرتے تھے۔ نہ صرف وہ زبانی عقیدت کے قائل تھے بلکہ عملاً بھی انہوں نے ان کے بعض نظریات کو اپنی شاعری، فلسفۂ تصوف اور نثر میں موضوعِ خاص بنایا ہے۔ وہ اپنے عزیز لختِ جگر جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کو بچپن میں لے کر سرہند تشریف لے گئے اور مجددؒ الف ثانیؒ کے مزار پر کافی وقت گذار کر لاہور واپس آئے۔ اس واقعہ سے بھی ان کی محبت و عقیدت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مشہور جرمن فلسفی نطشے اپنے دَور کے تمدنی اور تہذیبی حالات، عیسائیت کی مروجہ اقدار اور مغربی تصورِ انسان سے سخت بیزار ہو کر ان کی اصلاح کرنے کا شدید انقلابی جذبہ رکھتا تھا۔ اس کی تقریباً تمام تصانیف میں عصری تنقید کی واضح جھلک موجود ہے۔ علامہ اقبالؒ کی رائے میں وہ موجودہ دَور کے انسانوں کے معیارِ اخلاق سے مطمئن نہیں تھا اس لئے وہ "سپرمین" (فوق البشر) کی آمد کا منتظر تھا۔ اس کا جذبہ تو درست تھا لیکن اسے کسی مردِ کامل، خدا رسیدہ انسان اور عارف کی صحبت میسر نہ آئی۔ یورپ کی سرد روحانیت، مادہ پرستانہ تہذیب، جلال سے عاری اخلاقیات اور عیسائی تعلیمات اس کے معیارِ عظمتِ انسان پر پوری نہ آتی تھیں۔ اہلِ مغرب نے اس کی شدید مذہبی اور اخلاقی تنقیدات کے مدِ نظر اسے دیوانہ خیال کیا حالانکہ وہ فرزانہ مجذوب تھا علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ اگر وہ امام مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے زمانے میں پیدا ہوتا اور اسے ان کی صحبت ملتی تو وہ نطشے کی قلبی واردات کے خلل کو دُور کر کے اسے صحیح منزلِ مقصود تک پہنچا دیتے۔ نطشے کی روحانی واردات کی اصلاح کے بارے میں وہ مجدد الف ثانیؒ کے عظیم مقام کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

آنچہ اُو جوید مقامِ کبریاست
ایں مقام از عقل و حکمت ماوراست

کاش بودے در زمانِ احمدے
تا رسیدے بر سرورِ سرمدے

(جاوید نامہ، ص۔ 741)

(جو کچھ وہ (نطشے) تلاش کرتا ہے وہ مقامِ کبریا ہے یہ مقام عقل و فلسفہ کی حد سے پرے ہے۔
کاش وہ (نطشے) احمدؒ (سرہندی) کے زمانے میں ہوتا تاکہ وہ سرورِ ازلی تک پہنچ جاتا)

ان دو اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبالؒ مقامِ کبریا تک پہنچنے کے لئے عقل و فلسفہ کو کافی خیال نہیں کرتے۔ خدا کا راستہ عقل کی سرحد سے دُور ہے وہاں صرف وجدان، الہام اور معرفتِ باطن کے

ذریعے پہنچا جا سکتا ہے۔ عقل کو منزل آشنا کرنے کے لئے معرفت وطریقت کو اختیار کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کی رائے میں نطشے محض عقل کی وساطت سے مقامِ کبریا کو تلاش کر رہا تھا اس لئے وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے دَور میں ہوتا تو وہ اسے مقامِ کبریا سے ضرور آشنا کر دیتے۔ علامہ اقبالؒ عقل کی نارسائی کو یوں بیان کرتے ہیں۔

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نُور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

اقبالؒ کے روحانی مرشد اور رہنمائے معرفت انسان کو کائنات سے اشرف تصوّر کرتے ہوئے منزلِ کبریا کو اس کی حقیقی منزلِ مقصود قرار دیتے ہیں وہ کیا خوب فرماتے ہیں۔

ما ز فلک برتریم
وز مَلک افزوں تریم
زیں دو چرا نگذریم ؟
منزلِ ما کبریاست

(رومی)

(ہم آسمان سے برتر ہیں اور ہم فرشتے سے بھی آگے ہیں
ہم ان دونوں سے کیوں نہ آگے جائیں کیونکہ ہماری منزل تو خدا ہے)

علامہ اقبالؒ کی رائے میں اگر یہ مغربی مجذوب فلسفی اس کے اپنے دَور میں ہوتا تو وہ نطشے کو مقامِ کبریا سے آگاہ کر دیتے۔ اقبالؒ کی یہ خود اعتمادی اور معرفت پسندی کا ذرا انداز تو دیکھئے۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

شیخ احمد سرہندیؒ اسلامی اصولوں خصوصاً حق گوئی اور بے باکی کے زبردست حامی تھے جب مغلیہ بادشاہ جہانگیر نے اپنے دربار میں آنے والوں کے لئے سر جھکا کر آنے کی پابندی لگادی تو خوشامدی علماء اور ضمیر فروش نام نہاد دانشور مصلحتِ وقت کے تحت خاموش رہے اور اسلامی غیرت کا ثبوت دینے کی بجائے بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس وقت حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اس غیر اسلامی درباری روش کے خلاف زبردست صدائے احتجاج بلند کی۔ درباری مولویوں اور ضمیر فروش مسلمانوں نے جہانگیر کو اس بندۂ خدا کے خلاف اکسایا اور اس کے احتجاج کو سلطنتِ مغلیہ کے خلاف سازش قرار دیا۔ جہانگیر نے مجدد الف ثانی کو جب حقیقت حال کے لئے بلایا تو انہوں نے دربار جہانگیر میں سر جھکانے کی بجائے سنّتِ نبویؐ کی پیروی کرتے ہوئے "السلام علیکم" کہا اور سر نہ جھکایا۔ جہانگیر نے اسے گستاخی اور بغاوت پر محمول کرتے ہوئے انہیں جیل میں ڈال دیا۔ پشاور کا گورنر مہابت خان حضرت مجدد الف ثانیؒ کا مرید تھا۔ اس نے

جرأت ایمانی اور اپنی سچی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے جہانگیر سے کہا کہ وہ حضرت مجدّد الف ثانیؒ کو رہا کر دے ورنہ وہ فوج لے کر مقابلہ کے لئے آجائے گا۔ مہابت خان واقعی فوج لے کر اٹک تک چلا آیا ان حالات کے تحت جہانگیر نے فوراً حضرت مجدّد الف ثانیؒ کو رہا کر دیا اور سجدہ کروانے کی پابندی ختم کر دی۔ نبی اکرمؐ کی حدیث ہے...... "اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ الْحَقِّ عِنْدَ سُلْطَانِ الْجَابِرِ" (ظالم بادشاہ کے سامنے سچی بات کہنا بہترین جہاد ہے) مجدّد الف ثانیؒ نے دربارِ جہانگیر میں اس لسانی جہاد کا بڑے مؤثر انداز میں ثبوت بہم پہنچایا تھا۔ ایسے عارف، صوفی اور عالمِ دین اسلام کے لئے باعثِ فروغ اور مسلمانوں کے لئے وجۂ صد افتخار ہوتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ ایسے ہی حق گو، بیباک اور خدا اندیش بزرگوں کی عظمت، محبّت، عقیدت اور تصوّف کے حامی تھے۔ وہ مجدّد الف ثانیؒ کے اس قابلِ ذکر واقعہ کو اس طرح منظوم کرتے ہیں۔ ان کی نظم کا عنوان ہے "پنجاب کے پیرزادوں سے" وہ کہتے ہیں۔

حاضر ہوا میں شیخِ مجدّدؒ کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
اس خاک کے ذرّوں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ کردار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
اُس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
(بالِ جبریل، ص۔ 450، 451)

اس نظم کے دیگر اشعار میں علامہ اقبالؒ نے حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی زبان سے غلط قسم کے فقر اور تصوّف کی مذمت کی ہے جو محض سرکاری عہدے یا انعامات حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا جائے۔ مجدّد الف ثانیؒ اقبالؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

عارف کا ٹھکانہ نہیں وہ خطّہ کہ جس میں
پیدا کُلہِ فقر سے ہو طُرّۂ دستار
باقی کُلہِ فقر سے تھا ولولۂ حق
طُرّوں نے چڑھایا نشۂ خدمتِ سرکار
(بالِ جبریل، ص۔ 159)

فریدالدین عطّارؒ (۵۴۳ھ تا ۶۲۷ھ)

خواجہ فریدالدین عطّارؒ نیشاپوری کو نہ صرف فارسی شاعری بلکہ تصوّف و معرفت کے میدان میں بھی

خاص مقام حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں اکثروبیشتر صوفیانہ مسائل اور عارفانہ موضوعات ملتے ہیں ان کی ایک نثری تصنیف "تذکرۃ الاولیاء" میں صوفیاء، عرفاء، شیخانِ طریقت اور اولیاء کے سوانحِ حیات اور ان کے افکار سے واقفیت ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ جن بلند مرتبہ صوفی شعراء سے متاثر ہیں ان میں خواجہ فرید الدین عطارؒ کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ مولانا جامیؒ، مولانا رومیؒ، سنائیؒ اور عطارؒ علامہ موصوف کے محبوب صوفی شعراؑ اور پیرانِ طریقت تھے۔ اقبالؒ نے بڑی فراخ دلی سے ان بزرگوں کے علمی کمالات، روحانی عظمت اور خدا ترسی کے جذبے کو سراہا ہے۔

اسلام چونکہ زندگی کا ایک مکمل دستور ہے اس لئے اس نے ہر شعبۂ حیات میں عظیم انقلاب پیدا کر کے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ سیاسیات، ادبیات، عمرانیات، روحانی علوم، ظاہری علوم و فنون، معاشیات اور حربیات کے میدان میں عظیم الشان شخصیات نے جنم لے کر کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ اگر اسلام ایک محدود نظریۂ حیات ہوتا تو پھر متنوع شخصیات کا وجود ممکن نہ ہوتا۔ علامہ اقبالؒ کی رائے میں اسلامی تعلیمات کی بوقلمونی اور ہمہ گیری نے فلاسفہ اور حکماء کے علاوہ ملت اسلامیہ میں جلیل القدر صوفیاء، عرفاء اور اولیاء بھی پیدا کئے ہیں۔ ان جلیل المرتبت صوفیاء میں وہ فریدالدین عطارؒ کو بھی شامل کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ملتے در باغ و راغ آوازہ اش
آتش دلہا سرودِ تازہ اش
ذرہ کشتِ و آفتاب انبار کرد
خرمن از صد رومیؒ و عطارؒ کرد

(ملت اسلامیہ کی شہرت باغ وراغ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے نغمۂ تازہ نے دلوں میں آگ لگادی ہے۔ اس نے ذرّوں کو آفتاب بنا دیا ہے ملّتِ اسلامیہ کی کشتِ سرسبز کے خرمن میں سینکڑوں رومیؒ اور عطارؒ موجود ہیں)

(اسرار خودی، ص۔ 11)

اسلام کے ان نامور فرزندوں نے نہ صرف اپنوں کو متاثر کیا ہے بلکہ اغیار نے بھی ان کے خرمنِ علم و حکمت سے خوشہ چینی کی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی ایک فارسی تصنیف "پیامِ مشرق" کے دیباچہ میں جرمنی کے ایک مایۂ ناز اور عالمی شہرت یافتہ شاعر اور حکیمِ حیات گوئٹے کی عظمتِ فکر و فن کی کافی تعریف کی ہے۔ ان کی یہ کتاب دراصل گوئٹے کی کتاب "مغربی دیوان" کی ذہنی تحریک کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے اپنے اس بلند پایہ علمی اور ادبی دیباچہ میں گوئٹے کے کافی اشعار اور افکار کو مشرقی شعراء خصوصاً ایرانی شعراء اور صوفیاء کے اثر اور تتبع کا لازمی ثمرہ قرار دیا ہے۔ گوئٹے جن ایرانی شعراء اور صوفیاء سے متاثر ہے ان میں فریدالدین عطارؒ کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے چنانچہ اس بارے میں وہ اپنے علمی اور تحقیقی نتائج

فکر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"خواجہ حافظ کے علاوہ گوئٹے اپنے تخیلّات میں شیخ عطّارؒ، سعدی،

فردوسی اور عام اسلامی لٹریچر کا بھی ممنونِ احسان ہے۔ ایک آدھ جگہ ردیف و قافیہ کی قید سے غزل بھی لکھی ہے۔ اپنی زبان میں فارسی استعارات بھی (مثلاً "گوہرِ اشعار"۔ "تیرِ مژگان"۔ "زلفِ گرہ گیر") بے تکلف استعمال کرتا ہے"۔

(دیباچہ پیامِ مشرق، ص۔ 179)

فریدالدین عطّارؒ کی صوفیانہ شاعری زیادہ تر تصوّف و معرفت کے اسرار کی کاشف اور زندگی کے مابعد الطبیعیاتی حقائق کی ترجمان معلوم ہوتی ہے۔ گُل و بلبل کی بجائے انہوں نے خدا، اس کے رسولِ مقبولؐ اور اسلام کی تعلیمات کے گوناگوں پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے تاکہ انسان تزکیۂ باطن کی تربیت پاکر خدائی احکام کی پیروی برضا و رغبت کر سکے۔ علاّمہ اقبالؒ کو فریدالدین عطارؒ کی صوفیانہ شاعری کا یہ مسلک بہت مرغوب تھا اسی لئے انہوں نے بھی اس نظریۂ شعر و ادب کو اپنا اصلی سرمایہ قرار دیا ہے۔ عطّارؒ کی طرح اقبالؒ بھی شاعری کو دین و انسانیت کی خدمت کا ایک مؤثر ذریعہ تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

کشودم از رُخِ معنی نقابے
بدستِ ذرّہ دادم آفتابے

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم
مثالِ شاعراں افسانہ بستم

بکوئے دلبراں کارے ندارم
دلِ زارے غمِ یارے ندارم

دمے در خویشتن خلوت گزیدم
جہانے لازوالے آفریدم

"مرا زیں شاعری خود عار ناید
کہ در صد قرن یک عطّار ناید"

(میں نے حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھایا ہے۔ میں نے ذرّے کے ہاتھ میں آفتاب دے دیا ہے۔ تُو یہ خیال نہ کر میں شرابِ عشق کے بغیر مست ہوں۔ یہ تصوّر نہ کر کہ میں نے شاعروں کی طرح افسانہ طرازی کی ہے۔

(دنیاوی) معشوقوں کے کوچہ میں مجھے کوئی کام نہیں اس لئے میں کسی عام محبوب کا غم اور ناتواں دل نہیں رکھتا

کچھ دیر کے لئے میں نے اپنے آپ میں خلوت اختیار کی اس طرح میں نے ایک لازوال دنیا پیدا کرلی۔
" مجھے اس قسم کی شاعری سے کچھ شرم نہیں آتی کیونکہ سینکڑوں صدیوں میں فرید الدین عطار پیدا نہیں ہوتا ") ۔

(زبورِ عجم، ص۔ 538)

ان اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کی شاعری حقیقت نگاری اور عشقِ خدا کی واضح تفسیر ہے وہ عام شاعروں کی طرح جھوٹے اور عارضی معشوقوں کی داستانِ عشق بیان کرنے اور خیالی پلاؤ پکانے کو اعلیٰ قسم کی شاعری کی توہین سمجھتے تھے۔ اس کی بجائے انہوں نے زندگی بخش حقائق اور انسانیت ساز اصولوں کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ یہ وہی مسلک ہے جو فرید الدین عطّارؒ اور دیگر عظیم شاعروں اور صوفیوں نے اختیار کیا تھا۔

شیخ فرید الدین عطّارؒ کی عظمت و عقیدت کا نہ صرف اقبالؒ معتقد تھا بلکہ متعدد حضرات نے ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے روحانی مرشد مولانا رومؒ بھی فرید الدین عطّارؒ کے مقامِ تصوّف، شعری مسلک اور پاکیزہ سیرت کے مدّاح تھے۔ وہ بھی اپنے آپ کو عطّارؒ اور حکیم سنائیؒ کا پیروکار سمجھتے ہوئے یہ اعلان کرتے ہیں۔

عطّارؒ روح بُود و سنائیؒ دو چشمِ اُو
ما از پۓ سنائیؒ و عطّارؒ آمدیم

(رومیؒ)

(عطّار بمنزلۂ روح تھا اور سنائیؒ اس کی دو آنکھیں، ہم سنائیؒ اور عطّارؒ کے بعد آئے ہیں) ۔

علامہ اقبالؒ اسلام پرستی اور قرآنی حقائق کی ترجمانی کی بنا پر رومیؒ کو اپنا پیرو مرشد مانتے ہوئے ان کی عقیدت واتباع کا کثرت سے ذکر کرتے ہیں۔ مولانا رومؒ اسی وجہ سے حکیم سنائیؒ اور شیخ فرید الدین عطارؒ کی پیروی کا دم بھرتے ہیں۔ منطقی طور پر علاّمہ اقبالؒ کے لئے لازم تھا کہ وہ بھی فرید الدین عطّارؒ کی عظمت و عقیدت کا تذکرہ کریں۔ ایک جگہ اسی عقیدت اور مسلک کی ہم آہنگی کے سبب علاّمہ اقبالؒ نے عطّارؒ کے ایک مشہور شعر کو لفظی تغیّر کے ساتھ یوں بیان کیا ہے۔

حمد بے حد مر رسولِؐ پاک را
آں کہ ایماں داد مشتِ خاک را

(خاص طور پر رسولؐ پاک کے لئے بہت زیادہ تعریف ہے کیونکہ انہوں نے ہی مٹھی بھر خاک (انسان) کو ایمان دیا)

(پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق ص۔ 836)

شیخ فرید الدین عطّارؒ کا اصلی شعر یوں ہے۔

حمدِ بے حد مر خدائے پاک را
آں کہ ایماں داد مشتِ خاک را
(عطّارؒ)

(خصوصاً خدائے پاک کے لئے بے حد تعریف ہے کیونکہ اس نے انسان کو ایمان عطا کیا)۔
علاّمہ اقبالؒ نے حضرت عطّارؒ کے شعر میں معمولی سی تبدیلی کرتے ہوئے خدا کی جگہ رسولؐ کا لفظ استعمال کیا ہے غالباً وہ یہ بات واضح کرنے کے خواہاں تھے کہ خدا کی تعریف تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ بھی کر رہا ہے لیکن آقائے کائنات کے بندۂ خاص اور حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف بھی کرنی چاہئے کیونکہ ان کی وساطت سے ہمیں خدا کا عرفان ملا اور دولتِ ایمان عطا ہوئی۔ نبیؐ اکرمؐ انسان اور خدا کے مابین ربطِ خاص رکھتے ہیں اگر خدا اور انسان کے درمیان آپؐ کا واسطہ نہ ہوتا تو پھر ہم کس طرح ایمان کی دولت سے مالا مال ہو سکتے تھے؟۔

فرید الدین عطّارؒ چونکہ تصوّف و شریعت کے اَسرار کے محرم تھے اس لئے سحر خیزی اور ذکرِ الٰہی کا معمول ان کی زندگی کا لازمی جزو بن گیا تھا۔ دیگر صوفیائے کرام کی طرح وہ بھی سحر خیزی اور ذکرِ خدا کو گونا گوں روحانی، ذہنی اور دنیاوی کامرانیوں، بلندیوں اور ترقیوں کا وسیلہ تصوّر کرتے تھے۔ علامہ اقبالؒ کو بھی دین و معرفت سے بے حد شغف تھا اس لئے وہ جن لوگوں کو شب بیداری اور ذکرِ ایزدی کے مسلک پر گامزن دیکھتے ہیں وہ بے اختیار ان کی ستائش کرنے لگتے ہیں۔ کیا کسی نیکی اور اعلیٰ کمال کی تعریف کرنا عظمتِ کردار اور شرافتِ نفس کی واضح دلیل نہیں؟ غلط کار لوگ اگر کسی بُرے اصولِ حیات کا پروپیگنڈہ کریں تو اسے ذہین و فطین اور وسیع النظر ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے تو کیا کسی نیک انسان کی اعلیٰ قدروں کی تحسین و آفرین ذہانت و وسعت قلبی کی علامت نہیں ہو سکتی؟ بہر حال علاّمہ اقبالؒ فرید الدین عطّارؒ کی شخصیّت کے ان دو حسین اور قابلِ ستائش پہلوؤں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

؎ عطّارؒ ہو رومیؒ ہو، رازیؒ ہو غزالیؒ ہو ـ کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی
(بالِ جبریل صفحہ 348)

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام ـ وہ جس کی شان میں آیا ہے عَلَّمَ الْاَسْمَا
مقامِ ذکر کمالاتِ رومیؒ و عطّارؒ ـ مقامِ فکر، مقالاتِ بو علی سینا
(ضربِ کلیم صفحہ 485)

محی الدین ابنِ عربیؒ (560ھ تا 638ھ)

ان کا نام محمد بن علی، کنیت ابو بکر اور لقب محی الدین عرف حاتمی، ابنِ عربی تھا۔ وہ اُندلس کے ایک مقام مرسیا میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اشبیلیہ میں علومِ ظاہری حاصل کئے اور بہت جلد ممتاز علماء

اور اصحابِ طریقت میں شمار ہونے لگے۔ انہیں سیر و سیاحت کرنے اور روحانی مجالس سے فیض اٹھانے کا بہت شوق تھا چنانچہ اس مقصد کیلئے اُنہوں نے ایشیائے کوچک، حجاز اور مصر وغیرہ کا سفر بھی کیا۔ بعد ازاں وہ ملک شام میں قیام پذیر ہو گئے اور دمشق میں وفات پائی۔

محی الدین ابن عربیؒ کی دو مشہور کتابیں "الفتوحات المکیّۃ" اور "فصوص الحکم" ہیں۔

"فصوص الحکم" میں انہوں نے زیادہ تر تصوّف، معرفت، طریقت اور فلسفہ و شریعت کے اہم مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب تصوّف و طریقت میں بے حد ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ وحدت الوجود کے قائل اسے بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں ابنِ عربیؒ کا نظریۂ وحدت الوجود نہ صرف اپنے معاصرین بلکہ متاخرین کیلئے بھی بحث و مناظرہ کا سبب بنا ہوا ہے۔ اس دور کے علمائے شریعت نے اس نظریئے کو قرآنی تعلیمات کے خلاف سمجھ کر کفر کے فتوے صادر کئے تھے ان کے زیادہ تر مخالفین امام ابنِ تیمیہؒ، علامہ ابنِ حجر عسقلانیؒ اور ابنِ خلدونؒ وغیرہ تھے۔ ان کے حامیوں میں جیّد علماء اور صوفیاء مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، امام فخر الدین رازیؒ، امام جلال الدین سیوطیؒ اور مولانا رومؒ تھے۔

محی الدین ابن عربیؒ کو الٰہیاتِ اسلامیہ خصوصاً تصوّف و معرفت میں جو مقام حاصل ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ انہوں نے اپنے صوفیانہ افکار اور عارفانہ نظریات کی وجہ سے مسلم تصوّف پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کی ایک بلند پایہ تصنیف "فتوحاتِ مکیّہ" میں شریعت، طریقت اور فلسفہ کے مسائل کو بڑے عالمانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کا نظریۂ وحدۃ الوجود بعد میں آنے والے بیشتر صوفیاء اور علماء کیلئے باعثِ کشش رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ کو بھی شریعت، طریقت، شعر و ادب اور فلسفہ کے اہم موضوعات سے گہری دلچسپی رہی ہے اس لئے وہ محی الدین ابنِ عربیؒ کے افکار و نظریات سے لاتعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ علّامہ موصوف کا نظریہ وحدۃ الوجود کافی حد تک مولانا رومؒ کی طرح ابنِ عربیؒ سے متاثر نظر آتا ہے۔ اگرچہ بعد میں انہوں نے وحدۃ الشہود کے تصوّر کو اپنا لیا تھا لیکن پھر بھی وہ پوری طرح وحدۃ الوجود کے تصوّر سے چھٹکارا نہ پا سکے۔ مُفکرِ اسلامؒ اور شاعرِ مشرقؒ نے اپنی ایک اردو کتاب "ضربِ کلیم" کی ایک نظم بعنوان "تقدیر" میں زیادہ تر محی الدین ابنِ عربیؒ کے تصوّرِ ابلیس پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ ابنِ عربیؒ سے ماخوذ ہے۔ اس نظم میں خدا اور ابلیس کے درمیان آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کے مسئلے پر یوں مکالمہ ہوتا ہے:

ابلیس

؎ اے خدائے کُن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیَر آہ! وہ زندانیٔ نزدیک و دُور و دیر و زُود
حرفِ اِستکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا ہاں مگر تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود!

یزداں

؎ کب کھلا تجھ پر یہ راز؟ انکار سے پہلے کہ بعد

ابلیس

۔بعد اے تیری تجلّی سے کمالاتِ وجود

یزداں (فرشتوں کی طرف دیکھ کر)

۔پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حُجت اُسے ۔کہتا ہے' تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام ۔ظالم اپنے شُعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دُود

(ماخوذ از محی الدین ابنِ عربیؒ)

محی الدین ابنِ عربیؒ کا نظریہ ہے کہ یہ کائنات خدا تعالیٰ کی حرکتِ عشق کی بدولت معرضِ وجود میں آئی ہے۔ خالقِ کائنات نے اپنے حُسنِ مطلق کے اظہار کیلئے اس کائنات کو تخلیق کیا۔ اظہارِ حسن کی خواہش جذبۂ حب پر مبنی تھی اس لئے دنیا کی آفرینش دراصل عشق و محبت کا لازمی نتیجہ ہے۔ علامہ اقبالؒ بھی ابنِ عربیؒ کی ہم نوائی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

۔بہ ضمیرت آرمیدم' تُو بجوشِ خود نمائی بہ کنارہ بر فگندی ' دُرِ آبدارِ خود را

(اے خدا!) میں تیرے ضمیر میں آرام کر رہا تھا لیکن تُو نے اپنے حُسن کے اظہار کے جوش میں اپنے قیمتی موتی (انسان) کو ساحل پر پھینک دیا) محی الدین ابنِ عربیؒ اور علّامہ اقبالؒ کے بعض دیگر خیالات میں اتفاق و اختلاف کے کافی پہلو موجود ہیں۔ علّامہ اقبالؒ کا معیارِ انتخاب ہمیشہ قرآنی تعلیمات کی صحیح تفسیر ــــــــــ ہے وہ دوسروں کے خیالات کے اندھا دھند مقلد اور خوشہ چین نہیں بلکہ وہ ہر ایک نظریئے کو قرآنی ترازو میں تولنے کے بعد ردّ و قبول سے کام لیتے ہیں۔ ابنِ عربیؒ کے ضمن میں بھی ان کا یہی معیار ہے۔

میاں میرؒ محمد (938ھ تا 1045ھ)

میاں میرؒ اگرچہ سندھ کے مشہور شہر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے تھے تاہم وہ جوانی کے دور میں لاہور آکر مقیم ہو گئے تھے۔ عقلی اور نقلی علوم حاصل کرنے کے بعد وہ سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہو گئے اور لاہور میں تبلیغِ دین کا فریضہ بڑے انہماک سے سرانجام دیتے رہے۔ ان کے دستِ حق پرست پر کئی انسان اسلام کی دولت سے فیض یاب ہوئے۔ غیر مسلم بھی ان کا بہت زیادہ احترام کیا کرتے تھے چنانچہ جب سکھ مذہب کے پیروکار امرتسر میں دربار صاحب کا سنگِ بنیاد رکھنے لگے تو انہوں نے حضرت میاں میرؒ سے ایسا کرنے کی درخواست کی تھی جسے انہوں نے قبول کر لیا تھا۔ وہ فقر و غنا کے اس قدر دلدادہ تھے کہ شاہی دربار میں جانا پسند نہ کرتے تھے۔ مغل بادشاہ جہانگیر اور شاہجہان خود ان کے آستانۂ فیض پر حاضر ہو کر خود کو خوش نصیب خیال کرتے تھے۔

حضرت میاں میرؒ نے لاہور کے ایک مشہور عالمِ دین ملا سعد اللہ لاہوری کے درس میں شریک ہو کر شریعت کے اسرار و رموز سیکھے اور جب وہ ایسا کر چکے تو روحانی فیض اکتساب کرنے کے لئے مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر سرہند شریف گئے۔ ان کے علمی کمالات سے کئی نامور علمائے شریعت نے روحانی فیوض حاصل کئے۔ ان کا مزار لاہور میں آج بھی مرجع خلائق بنا رہتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ان کی حق گوئی، بے باکی اور استغناء کو بہت سراہا ہے۔

قرآنی تعلیمات اور سنت نبویؐ کی رُو سے مسلمان کی زندگی کا مقصد حق کا کلمہ بلند کرنا ہے۔ حق گوئی بلاشبہ ایمان کی نمایاں خوبیوں میں سے ہے۔ مسلمان کی زندگی حقیقت میں جہادِ مسلسل ہے۔ جہاد کی بھی کئی قسمیں ہیں لسانی جہاد، قلمی جہاد، مالی جہاد، جہادِ نفس اور تلوار وغیرہ کا جہاد، جہاد بالسّیف (تلوار کا جہاد) اگر خدا کے لئے اور اسلام کے غلبہ و نفاذ کے لئے ہو تو وہ درست ہے اور اگر اس کا مقصد خدا کے علاوہ ملکی فتوحات، زر پرستی، ذاتی اقتدار اور انسانوں کے استحصال کے لئے ہو تو وہ حرام ہے۔ اسلامی تعلیمات کے اس پہلو کی وضاحت کے لئے علامہ اقبالؒ نے لاہور کے ایک مشہور ولی حضرت میاں میرؒ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ منظوم کیا ہے۔ انہوں نے اپنی فارسی تصنیف "اسرارِ خودی" کے باب "در بیانِ این کہ مقصدِ حیاتِ مسلم اعلائے کلمۃ اللہ است و جہاد اگر محرکِ او جوع الارض باشد در مذہبِ اسلام حرام است" میں اس واقعہ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مغل بادشاہ، شاہجہان ہندوستان میں کافی بڑی سلطنت کا مالک تھا۔ ایک دفعہ اس کی فوج دکن میں برسرِپیکار تھی۔ وہ حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور فتح کے لئے دعا کی درخواست کی۔ حضرت میاں میرؒ یہ درخواست سن کر خاموش رہے اور اس دوران ان کے ایک مزدور مرید نے ان کی خدمت میں چاندی کا ایک سکّہ نذر کے طور پر پیش کیا۔ حاضرینِ مجلس اور شاہ جہاں کی موجودگی میں اس مرید نے یہ سکّہ پیش کیا تھا۔ میاں میرؒ نے اس مرید سے کہا کہ یہ سکّہ بادشاہ کو دے دو کیونکہ وہ آج کل سب سے زیادہ مفلس ہے۔ ان کی نگاہ میں شاہجہان کی جوع الارض (تسخیرِ ممالک) شاہی لباس میں مفلسی سے کم نہیں تھی۔ انہوں نے شاہجہان کی ہوسِ ملک گیری اور ہوسِ زر کو انسانوں کی بدحالی، تنگ دستی اور پس ماندگی کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے اسے سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس واقعہ سے متعلق چند اہم اشعار ناظرین کے مطالعہ و غور کے لئے درجِ ذیل کئے جاتے ہیں، علامہ موصوف کہتے ہیں۔

گفت شیخ ایں زر حقِ سلطانِ ماست   آنکہ در پیراہنِ شاہی گداست
حکمرانِ مہر و ماہ و انجم است   شاہِ ما مفلس ترینِ مردم است
دیدہ بر خوانِ اجانب دوختہ است   آتشِ جوعش جہانے سوختہ است
قحط و طاعوں تابعِ شمشیرِ اُو   عالمے ویرانہ از تسخیرِ اُو
سطوتش اہلِ جہاں را دشمن است   نوعِ انساں کارواں، اُو رہزن است

از خیالِ خود فریب و فکرِ خام — می کُند تاراج را تسخیر نام
ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید — تیغِ اُو در سینۂ اُو آرمید

شیخ (میاں میرؒ) نے (مرید سے) کہا کہ یہ سکہ ہمارے بادشاہ کا حق ہے جو بادشاہت کے لباس میں گداگر ہے۔
جو مہر و ماہ اور ستاروں کا حکمران ہے پھر بھی ہمارا بادشاہ لوگوں میں سب سے زیادہ غریب ہے۔
اس نے اِرد گرد کے علاقوں کے دستر خوان پر آنکھیں جمائی ہیں۔ اس کی ملک گیری کی بھوک کی آگ نے دنیا کو جلا کر رکھ دیا ہے۔
قحط اور طاعون اس کی تلوار کے تابع ہیں۔ اس کی تسخیر ممالک کی وجہ سے دنیا ویرانہ بن چکی ہے۔
اس کی سطوت دنیا والوں کی دشمن ہے۔ وہ انسانیت کے کارواں کو لوٹنے والا ہے۔
وہ اپنی خود فریبی اور خام خیالی کے سبب عام انسانوں کی تباہی کو فتح کا نام دیتا ہے۔
جس کسی نے بھی اسلام کے غلبہ کے علاوہ کسی اور مقصد کیلئے تلوار اٹھائی آخر کار اس کی تلوار کو اس کے سینے میں آرام ملا۔

(اسرار خودی صفحہ 64)

مندرجہ بالا اشعار میں ایک بندۂ حق نے کتنی بے باکی، جرأت اور صاف گوئی کے ساتھ عوام النّاس کی موجودگی میں ایک عظیم الشان بادشاہ کی غلط روش، تباہ کُن طرزِ حکومت، عوام کُش پالیسی، ہوسِ زر، جوع الارض اور غیر اللہ کیلئے تیغ زنی پر سرزنش کی ہے۔ اللہ کے اس درویش کی باتوں میں تنقید اور طنز کے نشتر چھپے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اللہ کے شیروں کا یہی مسلک ہوا کرتا ہے بقول اقبالؒ:۔

- آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اس درویشِ خدامست کے پاس نہ خزانے تھے اور نہ ہی شاہی نوکر چاکر، اس کے باوجود اس نے بادشاہ کے عتاب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کتنی حق گوئی سے کام لیا تھا۔ حق گوئی اور بے باکی کی یہ صفت ان میں فقر اور تزکیۂ باطن کی بدولت پیدا ہو گئی تھی۔ معلوم نہیں اس دور کے کتنے ہی عالم، فاضل، دانش ور کتابی علوم کے رسیا اور فلسفہ طراز انسانوں نے شاہجہان کی نہ صرف خوشامد اور مدح سرائی کی ہوگی۔ بلکہ اسے ظل اللہ علی الارض (زمین پر اللہ کا سایہ) اور بادشاہ عادل کا لقب دیا ہو گا۔ یہ ہے ایک عام عالم اور صحیح صاحب طریقت میں فرق۔ علامہ اقبالؒ نے اسی لئے تو اسلام کے سچے عاشقوں اور حق کو صاحبانِ طریقت کے فقر کو شاہی پر ترجیح دیتے ہوئے کہا تھا:

- نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے — خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے
- مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے — روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہئے

حضرت میاں میرؒ کے مقامِ طریقت، ان کی اسلامی خدمات، انسانی بہبود کے جذبے اور خدا پرستی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے ان کی بارگاہ میں مندرجہ ذیل اشعار کا ہدیۂ عقیدت بڑے ہی پُرجوش

اور ایمان پرور انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ ان کی شان کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

حضرتِ شیخ میاں میرؒ ولی - ہر خفی از نورِ جانِ اُو جلی
بر طریقِ مصطفیٰؐ محکم پئے - نغمۂ عشق و محبت را نئے
تربتش ایمانِ خاکِ شہرِ ما - مشعلِ نورِ ہدایت بہرِ ما
بر درِ اُو جُبہ فرسا آسماں - از مریدانش شہِ ہندوستاں

حضرت شیخ میاں میرؒ ولی تھے۔ ان کی روح پُرنور سے ہر خفی جلی ہے۔
وہ سنتِ رسولؐ پر ثابت قدم رہتے تھے۔ ان کی نے (بانسری) سے عشق و محبّت کا نغمہ بلند ہوتا تھا۔
ان کی قبر ہمارے شہر کی خاک کی ایمان ہے۔ ان کا مزار ہماری ہدایت کیلئے مشعلِ نور ہے۔
ان کی بارگاہ پر آسمان جبیں خم کرتا ہے۔ ان کے مریدوں میں ہندوستان کا بادشاہ بھی تھا۔
(اسرار خودی صفحہ 63)

ان اشعار میں علامہ اقبالؒ نے حضرت میاں میرؒ کی چند نمایاں ترین خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ سنتِ رسولؐ کی پیروی ' خدا کی محبّت ' نورِ جاں اور ان کی تربت کی زیارت کی اہمیّت کو یہاں بڑے اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ ایسے روشن ضمیر ' حق گو ' بے باک ' عاشقِ رسولؐ اور نورِ باطن کے حامل درویش اور صاحبِ طریقت کے مزار کو بھی روحانی تاثر سے خالی نہیں سمجھتے۔ عوام کی مظلومیّت کا احساس ہم انسانوں کی ہمدردی ' جابر حکومت کا تنقیدی شعور اور اسلامی تعلیمات کا تحفّظ کرنے والی حق گو شخصیت کا وجود کمزور اور بے بس رعایا کیلئے خدا کی نعمت نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا ایسی بلند پایہ اور مخلص شخصیّت کی تعریف اور عقیدت کا اظہار حقیقت پسند شاعر اور مفکر پر لازم نہیں آتا؟ کیا یہ تحسین آمیز اشعار اندھا دھند پیر پرستی اور تصوّف کی بے جا حمایت قرار دیئے جا سکتے ہیں؟ حق پرستی کی بناء پر ایسا الزام دینا ناروا نہیں تو اور کیا ہے؟

مولانا جلال الدین رومیؒ

مولانا جلال الدین رومیؒ دنیائے اسلام کی ایک نابغہ شخصیت اور مایۂ ناز صوفی شاعر تھے۔ ان کی مشہور ترین کتاب "مثنویٔ معنوی" کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کے صوفیانہ نظریات اور عارفانہ تصوّرات نے مسلمانوں کے علاوہ روحانیّت پرست غیر مسلموں کو بھی خاصا متاثر کیا ہے۔ ان کی زندگی کا پہلا حصہ زیادہ تر کتابی علوم کی تحصیل و تدریس میں گزرا لیکن حضرت شمس الدین تبریزی کی ملاقات کے بعد وہ کتابی دنیا کو چھوڑ کر تصوّف و طریقت کے جہان میں داخل ہوئے۔ وہ تصوّف و طریقت کے اس قدر دلدادہ ہوئے کہ تاعمر انہیں اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ ان کی شاعری دراصل ان کے مخصوص مذہبی ' اخلاقی اور صوفیانہ عقائد و نظریات کی ترجمان اور اسرارِ معرفت کی زبان ہے۔ انہوں نے مذہب ' اخلاق ' فلسفہ ' شریعت اور طریقت کے دقیق مسائل کو اتنی آسان ' دلنشین اور سبق آموز حکایات اور

تمثیلات کے انداز میں بیان کیا ہے کہ بے اختیار ان کی ذہانت تبحرِ علمی اور دلآویز طرزِ نگارش کی داد دینی پڑتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے قرآن حکیم کے بے شمار حقائق اور وقائق کو ان کی اس بے مثال مثنوی کے مطالعہ کے بعد دریافت کیا تھا اس لئے وہ ان کے روحانی فیض کی بدولت انہیں اپنا پیرو مرشد تسلیم کرتے تھے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے روحانی پیرو مرشد مولانا جلال الدین رومؒ (رومیؒ) کے بارے میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ اس کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی جا سکتی۔ انہوں نے اپنی تمام تصانیفِ شعر و نثر میں رومیؒ کے افکار و نظریات، اُن کے کلام کی اہمیت اور اپنی ذاتی عقیدت و محبت کا ذکر کیا ہے۔ مولانا رومؒ سے اقبالؒ کی عقیدت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآنی حقائق اور اسلامی تعلیمات کو بڑے ہی عام فہم اور دلنشین پیرائے میں بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں اُن کے دلائل بہت ہی وزنی اور ٹھوس معلوم ہوتے ہیں۔ رومی علیہ الرحمتہ کے کلام میں رجائیت، عمل پرستی، سعیٔ پیہم، صحیح تصورِ تقدیر، انسانی احترام، مردِ کامل، جذبۂ عشقِ رسولؐ، عقل و عشق کا حسین امتزاج، تزکیۂ باطن، محبتِ مرشد کی اہمیت، اسلاف کا سوز و روں اور خدا پرستی کی صفات بدرجۂ اُتم پائی جاتی ہیں۔ اقبالؒ کی طرح وہ بھی خودی کے استحکام اور جذبۂ عشق میں شدید ایمان رکھتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اور مولانا رومیؒ کے نظریات میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان خوبیوں کی وجہ سے علامہ موصوف انہیں اپنا روحانی پیر تسلیم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ انہوں نے مولانا رومؒ کے اکثر اشعار کو اپنی تشریح اور توضیح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جاوید نامہ کا "عالم خواب میں سفر" انہوں نے مولانا رومؒ کی قیادت میں طے کیا تھا۔ اسی طرح بالِ جبریل کا ایک طویل باب "مرید ہندی" (اقبالؒ) اور "پیرِ رومیؒ" کے باہمی سوالات اور جوابات پر مشتمل ہے۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے آغاز میں مولانا رومؒ کے اشعار بطور تبرک و عقیدت شامل کئے گئے ہیں۔ الغرض یہ موضوع خاصا وقت طلب اور مفصل ہے۔ "اقبالؒ اور رومیؒ" کے عنوان سے میں نے ایک طویل مضمون تحریر کیا ہے جسے اہلِ نظر مفید اور معلومات افزا پائیں گے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی بیشتر تصانیف میں یہ اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے مولانا جلال الدین رومیؒ کے کلام سے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ اس احسان مندی کا انہوں نے جابجا برملا اظہار کیا ہے۔ اس سے علامہ اقبالؒ کی ذاتی شرافت، عظمتِ کردار، بلند نظری، احسان مندی اور حقیقت پسندی کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے اپنے قارئین کو بھی یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اسلام کی صحیح تعلیمات سے آگاہی حاصل کرنے، قرآنی پیغام کو جاننے اور اپنے دل میں عشقِ رسولؐ کا شدید جذبہ موجزن کرنے کیلئے کلامِ رومیؒ سے استفادہ کریں۔ اس بارے میں مندرجہ ذیل چند اشعار بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں:-

پیرِ رومیؒ خاک را اکسیر کرد — از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد
موجم و در بحرِ اُو منزل کنم — تا دُرِ تابندۂ حاصل کنم

(مرشد رومیؒ نے میری خاک کو اکسیر بنادیا ہے۔ اس نے میری خاک سے کئی جلوے تعمیر کئے ہیں۔
میں ایک موج کی مانند اس کے سمندر میں ہوں تاکہ میں کوئی چمکدار موتی حاصل کر سکوں۔)
(اسرارِ خودی صفحہ 9 - 8)

؎ بیا کہ من زخُمِ پیرِ رومؒ آوردم　　　مے سخن کہ جواں تر زبادۂ عنبی است
(آکے دیکھ کہ میں پیر رومیؒ کے خُم سے ایسی شراب لایا ہوں جو انگوری شراب سے بھی زیادہ جوان ہے۔)

(پیامِ مشرق صفحہ 335)

پیرِ رومیؒ را رفیقِ راہ ساز　　　تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومیؒ مغز را داند ز پوست　　　پائے اُو محکم فتد در کُوئے دوست
(پیرِ رومؒ کو تُو اپنا رفیقِ راہ بنا تاکہ خدا تعالیٰ تجھے سوز گداز عطا کرے
چونکہ رومیؒ چھلکے اور مغز میں تمیز کر لیتا ہے اس لئے وہ کوچۂ یار میں ثابت قدم رہتا ہے۔)
(جاوید نامہ صفحہ 796)

؎ نہ اُٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے　　　وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی!

(بالِ جبریل صفحہ 303)

؎ اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں　　　کبھی سوز و سازِ رومیؒ کبھی پیچ و تابِ رازیؒ

(بالِ جبریل صفحہ 309)

؎ علاج آتشِ رومیؒ کے سوز میں ہے ترا　　　تری خِرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسُوں

(بالِ جبریل صفحہ 320)

ہم خوگرِ محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اک بحرِ پُر آشوب و پُر اسرار ہے رومیؒ
تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبالؒ!
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومیؒ
(بالِ جبریل صفحہ 441'440)

؎ وقت است کہ بکشائم میخانۂ "رومی" باز
پیرانِ حرم دیدم در صحنِ کلیسا مست

این کارِ حکیمے نیست دامانِ کلیمے گیر
صد بندۂ ساحل مست، یک بندۂ دریا مست

(اب وقت ہے کہ میں دوبارہ میخانۂ "رومی" کو کھول دوں کیونکہ میں نے مذہبی راہنماؤں کو چرچ کے صحن میں مست دیکھا ہے۔
یہ کسی فلسفی کا کام نہیں اس لئے تو کسی خداشناس انسان کا دامن پکڑ لے۔ سینکڑوں ساحل پرستوں میں سے ایک مست ہو سکتا ہے لیکن ہر خداپرست مست ہوتا ہے۔)

(پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق صفحہ 872)

؎ غلط نگر ہے تری چشمِ نیم باز اب تک
ترا وجود ترے واسطے ہے راز اب تک

ترا نیاز نہیں آشنائے راز اب تک
کہ ہے قیام سے خالی تری نماز اب تک

گُسِتہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک
کہ تو ہے نغمۂ رومی" سے بے نیاز اب تک

(ضرب کلیم 'عنوان رومی" صفحہ 583)

....

؎ ز رومی" گیر اَسرارِ فقیری
کہ آں فقر است محسودِ امیری

حَذَر زاں فقر و درویشی کہ ازوے
رسیدی بر مقامِ سربزیری

(تو مولانا روم" سے فقر کے بھید حاصل کر کیونکہ اس کا فقر شاہی کیلئے باعثِ حسد ہے۔
تو اُس فقر اور درویشی سے پرہیز کر کہ جس سے تو پستی اور زوال کے مقام پر پہنچ جائے۔)

(ارمغان حجاز صفحہ 959)

مندرجہ بالا اشعار پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبال" مولانا جلال الدین رومی" کے کس قدر گرویدہ اور مدّاح ہیں۔ ان اشعار سے حسب ذیل نتائج مختصراً اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

(1) علامہ اقبال" بار بار اس حقیقت کا علی الاعلان اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے مولانا روم" سے کئی قابلِ فخر اَسرار و حقائق سیکھے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے رومی" سے جذبۂ عشق و محبت کی اہمیت و افادیت کا

راز بھی حاصل کیا ہے۔

(2) شاعرِ مشرقؒ نہ صرف ایک عظیم المرتبت شاعر اور فلسفی تھے بلکہ وہ اسلام کے بھی شیدائی تھے۔ خدا اور اس کے رسولؐ کی محبت بھی ان کی زندگی کی عزیز ترین متاع تھی۔ عقل و حکمت کی وجہ سے انہیں سکونِ دل کی بجائے پیچ و تابِ رازیؒ ملا تھا لیکن بعد ازاں خدا نے انہیں سوز و سازِ رومیؒ کی بدولت قلبی سکون عطا کر دیا تھا اس لئے وہ عشق و محبت کے بار بار راگ الاپتے ہیں۔

(3) مفکرِ اسلام علّامہ اقبالؒ دوسروں کو بھی رومیؒ کے کلام سے فیض حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ وہ حقیقت شناس اور خدا کی راہ میں ثابت قدم رہے۔

(4) اہل مغرب کی سیاسی غلامی نے مسلمانوں کو ذہنی طور پر اس قدر مرعوب کر دیا تھا کہ وہ اسلام کی ہر حقیقت کو مغربی فلسفہ کی عینک سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں اس کے علاوہ وہ مغربیوں کی طرح مادہ پرستی کا شکار ہو کر ذوق و شوق کی دولت سے محروم ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں فرنگیوں کی فسوں کاری پر غالب آنے کیلئے آتشِ رومیؒ کے سوز میں ہمارا علاج پنہاں ہے۔ ہم تو ساحل کے خریدار بن چکے ہیں لیکن رومیؒ اک بحرِ پُر آشوب و پُر اسرار ہے۔ موتیوں کے طلب گار ساحل پر بیٹھ کر انہیں حاصل نہیں کر سکتے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے انہیں بحرِ پُر آشوب و پُر اسرار میں غوطہ لگانا پڑے گا۔

(5) علّامہ اقبالؒ مشرق و مغرب کے علومِ ظاہری اور فلسفہ و حکمت کے حامل ہونے کے باوجود کسی فلسفی کو اپنا مُرشد اور راہنما تسلیم نہیں کرتے لیکن وہ رومیؒ کی شاگردی اور مریدی کو اپنے لئے قابلِ فخر قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اسی قافلۂ شوق کا ایک مسافر سمجھتے ہیں جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومیؒ۔ اس سے علّامہ اقبالؒ کی تصوّف و معرفت اور شریعت و طریقت سے گہری محبّت اور شیفتگی کا پتہ چلتا ہے۔

(6) علّامہ اقبالؒ جب اپنے دور کے سیاسی حالات میں مسلمان عُلماء اور دانشوروں کو اسلام کی اشاعت کی بجائے غیر مسلموں کا آلۂ کار پاتے ہیں تو وہ انہیں میخانۂ رومی سے شرابِ عشق و معرفت پلانے کے مشتاق نظر آتے ہیں تاکہ وہ اسلام کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کر سکیں وہ سینکڑوں دین فروش اربابِ دانش اور علمائے سو سے ایک بندۂ حق پرست کو بہتر خیال کرتے ہیں جو اسلام کی انقلابی تعلیمات سے سرشار ہو کر اسلام کے غلبہ و برتری کیلئے کچھ کام کر سکے جب شریعت اور فلسفہ و حکمت کے دعویدار بیکار ثابت ہوں تو اس وقت ایک انقلابی بندۂ خدا (کلیم) کا دامن پکڑ لینا چاہئے۔

(7) جب کسی انسان کی خودی کا سازِ گسستہ تار ہو جائے تو اس وقت نغمۂ رومی سے کام لینا چاہئے۔ مولانا رومؒ نے انسانی ذات کی تعمیر و استحکام پر بہت زور دیا ہے یہی وجہ ہے علامہ اقبالؒ اپنے قارئین کو کلامِ رومیؒ سے اکتسابِ فیض کا مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں۔

(8) مولانا رومؒ نے فقر اور درویشی کا جو سبق دیا ہے وہ اقبالؒ کی رائے میں ترقی، عظمت اور کامیابی کا زینہ ہے۔ وہ ہمیں اس فقرودرویشی اور تصوّف و طریقت سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں جو ہمارے

زوال، پستی، کمزوری، محکومیت اور تیرہ باطنی کا ذریعہ ہوں۔
مولانا جلال الدین رومیؒ کے افکار و تخیلات کی چند جھلکیاں ہمیں "بالِ جبریل" کی ایک بلند پایہ نظم (پیرو مرید) میں نظر آتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے جس طرح اپنی ایک فارسی تصنیف "جاوید نامہ" میں منصور حلاج سے چند اہم سوالات کئے تھے اس طرح یہاں بھی انہوں نے اپنے پیرو مرشد یعنی رومیؒ سے علم، عصرِ حاضر، مشرق، مغرب، نوجوانوں، سیاست، معاشرت، فلسفہ، اخلاق، شریعت اور طریقت وغیرہ سے متعلق کئی ضروری اور معلومات افزاء سوالات کئے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اپنے آپ کو مریدِ ہندی کہتے ہیں اور مولانا رومؒ کو پیرِ رومی، ہندی مرید نے یہ سوالات اپنی زبان اردو میں کئے ہیں اور مولانا رومؒ کے جوابات ان کی زبان فارسی میں دیئے ہیں۔ یہ طویل نظم بھی رومیؒ سے اقبالؒ کی عقیدت کی آئینہ دار اور افکار رومیؒ کی دلکش تلخیص ہے۔ اب پیرو مرید کی باہمی گفتگو کا یہاں مختصراً تعارف کرایا جاتا ہے۔ بالِ جبریل کی اس نظم کے مندرجہ ذیل سوالات اور جوابات ملاحظہ ہوں۔

سوال، مریدِ ہندی صفحہ نمبر 426

چشمِ بینا سے ہے جاری جُوئے خُوں   علمِ حاضر سے ہے دیں زار و زبُوں

(جواب) علم را برتن زنی مارے بُوَد
علم را بردِل زنی یارے بُوَد

تو اگر علم (حاضرہ) کو جسم کیلئے حاصل کرے تو یہ سانپ بن جائے گا اور اگر تو اسے دل (روح) کے لئے بروئے کار لائے تو یہ دوست ثابت ہو گا

سوال، مریدِ ہندی

اے امامِ عاشقانِ درد مند   یاد ہے مجھ کو ترا حرفِ بلند
خشک مغز و خشک تار و خشک پوست   از کُجا می آید ایں آوازِ دوست
دورِ حاضر، مستِ چنگ و بے سرور   بے ثبات و بے یقین و بے حضور
کیا خبر اس کو کہ ہے یہ راز کیا   دوست کیا ہے، دوست کی آواز کیا
آہ! یورپ با فروغ و تابناک   نغمہ اس کو کھینچتا ہے سُوئے خاک

جواب، پیرِ رومی 427

بر سماعِ راست ہر کس چیر نیست   طعمہ ہر مرغکے انجیر نیست
صحیح موسیقی پر ہر شخص غالب نہیں ہے۔ ہر پرندے کی خوراک انجیر نہیں ہوتی

سوال، مریدِ ہندی

پڑھ لئے میں نے علومِ شرق و غرب   روح میں باقی ہے ابتک درد و کرب

جواب، پیرِ رومی صفحہ نمبر427

دستِ ہر نااہل بیمارت کُند سُوئے مادر آ کہ تیمارت کُند

ہرنااہل (طبیب) کاہاتھ تجھے بیمار کردے گا اس لئے تو ماں (مرشد) کی طرف آ تاکہ وہ تیری تیمار داری کرے۔

سوال، مریدِ ہندی

اے نگہ تیری مِرے دل کی کُشاد کھول مجھ پر نکتۂ حکمِ جہاد

جواب، پیرِ رومی صفحہ نمبر427

نقش حق را ہم بہ امرِ حق شکن برزجاجِ دوست سنگِ دوست زن

خدا کے نقش (مراد باطل) کو خدا کے حکم سے مٹا اور اس طرح خدا کے ہی پیدا کردہ شیشے (باطل) کو اس کے پتھر (جہاد) سے توڑ دے

سوال، مریدِ ہندی

ہے نگاہِ خاوراں، مسحورِ غرب حورِ جنت سے ہے خوشتر حورِ غرب

جواب، پیرِ رومی صفحہ نمبر428-427

ظاہرِ نُقرہ گر اسپید است و نو دست و جامہ ہم سیہ گردد ازو

اگرچہ چاندی کا ظاہری پہلو نیا اور سفید نظر آتا ہے لیکن اس سے ہاتھ اور کپڑے سیاہ ہو جاتے ہیں

سوال، مریدِ ہندی

آہ! مکتب کا جوانِ گرم خوں ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں

جواب، پیرِ رومی صفحہ نمبر428

مرغِ پر نارُستہ چُوں پرّاں شوَد طعمۂ ہر گُربۂ درّاں شود

وہ چوزہ جس کے ابھی پَر نمودار نہیں ہوئے جب اڑنے لگتا ہے تو وہ پھاڑ کھانے والی بلی کی خوراک بن جاتا ہے

سوال، مریدِ ہندی

تا کُجا آویزشِ دین و وطن جوہرِ جاں پر مقدّم ہے بدن

جواب، پیرِ رومی صفحہ نمبر428

قلب پہلو می زند بازر بہ شب انتظارِ روز می دارد ذہب

کھوٹا سکہ رات کو سونے کے ساتھ برابری کرتا ہے لیکن سونا دن کے طلوع ہونے کا منتظر رہتا ہے۔

(صفحہ 428)

سوالِ مریدِ ہندی

سِرِّ آدم سے مجھے آگاہ کر خاک کے ذرّے کو مہر و ماہ کر

جواب، پیرِ رومی صفحہ نمبر429 - 428

ظاہرش را پشّہ آرد بہ چرخ باطنش آمد محیطِ ہفت چرخ

اس (انسان) کے ظاہر (جسم) کو ایک مچھر پچھتا ہے لیکن اس کا باطن (روح) سات آسمانوں کو محیط ہے

سوالِ مریدِ ہندی

خاک تیرے نور سے روشن بصر غایتِ آدم خبر ہے یا نظر؟

جواب، پیرِ رومی صفحہ نمبر429

آدمی دید است، باقی پوست است دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

انسان سراپا طالب دیدار ہے باقی پوست ہے صحیح دیدار تو دوست (خدا) کا دیدار ہوا کرتا ہے

سوالِ مریدِ ہندی

زندہ ہے مشرق تری گفتار سے امتیں مرتی ہیں کس آزار سے؟

جواب، پیرِ رومی صفحہ نمبر429

ہر ہلاکِ امّتِ پیشیں کہ بُود زانکہ بر جَندَل گماں بردند عُود

ہر سابقہ قوم کی ہلاکت اس وجہ سے تھی کہ اس نے پتھر (باطل) کو عود (حق) خیال کر لیا تھا

سوالِ مریدِ ہندی

اب مسلماں میں نہیں وہ رنگ و بو سرد کیونکر ہو گیا اس کا لہو؟

جواب، پیرِ رومی" صفحہ نمبر430 - 429

تا دلِ صاحب دِلے نامد بہ درد ہیچ قومے را خدا رُسوا نہ کرد

جب تک کسی صاحب دل (خدا کا بندۂ خاص) کا دل نہیں دکھایا گیا اس وقت تک خدا نے کسی قوم کو ذلیل نہیں کیا (صفحہ 430 - 420)

سوال 'مریدِ ہندی

گرچہ بے رونق ہے بازارِ وجود کون سے سودے میں ہے مردوں کا سُود؟

جواب 'پیرِ رومیؒ' صفحہ نمبر 430

زیرکی بفروش و حیرانی بخر زیرکی ظن است و حیرانی نظر

عقل (فلسفہ) کو فروخت کر دے اور حیرانی (عشق) کو خرید لے کیونکہ عقل گمان ہے اور عشق معرفت ہے

سوال 'مریدِ ہندی

ہم نفس میرے سلاطیں کے ندیم میں فقیرِ بے کلاہ و بے گلیم

جواب 'پیرِ رومیؒ' صفحہ نمبر 430

بندۂ یک مرد روشن دل شوی بہ کہ بر فرقِ سرِ شاہاں روی

اگر تو ایک روشن ضمیر انسان (نور بصیرت کا حامل) کا غلام بن جائے تو یہ بادشاہوں کے سر کی مانگ پر چلنے سے بہتر ہے! (430)

سوال 'مریدِ ہندی

اے شریکِ مستیٔ خاصانِ بدر میں نہیں سمجھا حدیثِ جبر و قدر

جواب 'پیرِ رومیؒ' صفحہ نمبر 431-430

بال بازاں را سوئے سلطاں بُرد بال زاغاں را بہ گورستاں بُرد

بازو (پرواز) بازوں کو بادشاہ کی جانب لے جاتی ہے اور یہی بازو کوّوں کو قبرستان کی طرف لے جاتا ہے۔

سوال 'مریدِ ہندی

کاروبارِ خسروی یا راہبی؟ کیا ہے آخر غایتِ دینِ نبیؐ؟

جواب 'پیرِ رومیؒ' صفحہ نمبر 431

مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ مصلحت در دینِ عیسیٰؑ غار و کوہ

(ہمارے دین (اسلام) میں نیکی جہاد اور دنیاوی شوکت ہے، لیکن عیسائی مذہب میں غار اور پہاڑ (صرف خلوت گزینی) کو نیکی خیال کیا جاتا ہے)

سوال 'مریدِ ہندی

کس طرح قابو میں آئے آب و گِل؟ کس طرح بیدار ہو سینے میں دِل؟

جواب 'پیرِرومی" صفحہ نمبر431

بندہ باش و برزمیں رَو چُوں سمند   چُوں جنازہ نے کہ برگردن بَرَند
(کسی مرد کامل کا) غلام بن اور زمین پر گھوڑے کی طرح چل۔ تو جنازہ (مردہ) مت بن کہ دوسرے لوگ تجھے اپنی گردن پر اٹھاتے رہیں)۔

سوال 'مریدِ ہندی

سِرِّ دیں ادراک میں آتا نہیں   کس طرح آئے قیامت کا یقیں؟

جواب 'پیرِرومی" صفحہ نمبر432-431

پس قیامت شو' قیامت را بہ بیں   دیدنِ ہر چیز را شرط است ایں
(پس تو خود قیامت کا آئینہ بن جا اسطرح تو قیامت کا نظارہ کر سکے گا۔ کسی چیز کو دیکھنے کی بس یہی شرط ہے)

سوال 'مریدِ ہندی

آسماں میں راہ کرتی ہے خودی   صید مہر و ماہ کرتی ہے خودی
بے حضور و بافروغ و بے فراغ   اپنے نخچیروں کے ہاتھوں داغ داغ

جواب 'پیرِرومی" صفحہ نمبر432

آں کہ ارزد صید را عشق است و بس   لیکن اُو کے گُنجد اندر دامِ کس؟
(شکار (خودی) کے لئے جو چیز قدر و قیمت رکھتی ہے وہ بس عشق ہی ہے لیکن وہ (خودی) کسی کے جال میں کب سما سکتی ہے؟)

سوال 'مریدِ ہندی

تجھ پہ روشن ہے ضمیرِ کائنات   کس طرح مُحکم ہو مِلّت کی حیات؟

جواب 'پیرِرومی"

دانہ باشی' مرغکانت بر چُنند   غنچہ باشی کودکانت بر کنند
دانہ پنہاں کُن' سراپا دام شو   غنچہ پنہاں کُن' گیاہِ بام شو
(اگر تو دانہ بنے گا تو پرندے تجھے چن لیں گے۔ اگر تو غنچہ ہو گا تو بچے تجھے اکھیڑ پھینکیں گے۔ اس لئے تو دانے کو چھپا کر سراپا جال بن جا۔ تو کلی کو پنہاں کر کے چھت تک پہنچنے والی گھاس ہو جا)

صفحہ نمبر433-432

سوال 'مریدِ ہندی

تو یہ کہتا ہے کہ دل کی کر تلاش   طالبِ دل باش و در پیکار باش'

جو مرا دل ہے مرے سینے میں ہے   میرا جوہر میرے آئینے میں ہے

جواب 'پیرِ رومیؒ' صفحہ نمبر433

تو ہمی گوئی مرا دل نیز ہست   دل فرازِ عرش باشد نے بہ پست
تو دلِ خود را دلے پنداشتی   جستجوئے اہل دل بگذاشتی

(تو کہتا ہے کہ میرے پاس بھی دل ہے حالانکہ اصل دل عرش کی بلندی پر ہوتا ہے نہ کہ پستی (جسم) میں۔ تونے اپنے (مادی) دل کو ہی اصلی دل خیال کر کے اہلِ دل (مردانِ کامل) کی تلاش چھوڑ دی ہے)۔

سوال 'مریدِ ہندی'

آسمانوں پر مرا فکرِ بلند   میں زمیں پر خوار و زار و دردمند
کارِ دنیا میں رہا جاتا ہوں میں   ٹھوکریں اس راہ میں کھاتا ہوں میں
کیوں مرے بس کا نہیں کارِ زمیں   ابلہِ دنیا ہے کیوں دانائے دیں؟

جواب 'پیرِ رومیؒ' صفحہ نمبر434

آں کہ بر افلاک رفتارش بُوَد   برزمیں رفتن چہ دُشوارش بُوَد؟

(جس آدمی کی رفتار آسمانوں پر ہو سکتی ہے اس کے لئے زمین پر چلنا کیسے مشکل ہو سکتا ہے؟)

سوال 'مریدِ ہندی'

علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ؟   کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ

جواب 'پیرِ رومیؒ' صفحہ نمبر434

(حلال کی روٹی کمانے سے علم و حکمت ملتے ہیں۔ عشق اور نرم دلی کو بھی رزق حلال پیدا کرتا ہے)۔

سوال 'مریدِ ہندی'

ہے زمانے کا تقاضا انجمن   اور بے خلوت نہیں سوزِ سخن

جواب 'پیرِ رومیؒ' صفحہ نمبر434

خلوت از اغیار باید نے زیار   پوستیں بہرِ دے آمد' نے بہار

(غیروں سے خلوت اختیار کرنی چاہئے نہ کہ اپنے دوستوں سے۔ کھال موسم سرما کے لئے ہے نہ کہ بہار کے لئے)۔

سوال 'مریدِ ہندی'

ہند میں اب نور باقی ہے نہ سوز   اہلِ دیں اس دیس میں ہیں تیرہ روز

جواب 'پیرِ رومیؒ' صفحہ نمبر 434

کارِ مرداں روشنی و گرمی است　　　　کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است
(مردانِ کامل کا کام (دلوں کو) روشنی اور گرمی پہنچانا ہے مگر ذلیل لوگوں کا کام مکر اور بے شرمی ہے)

علامہ اقبالؒ اور مولانا جلال الدین رومیؒ کے مندرجہ بالا مکالمہ میں دین ' تصوّف ' سیاست ' معاشرت ' علم و حکمت وغیرہ کے بہت سے موضوعات زیرِ بحث لائے گئے ہیں تاکہ قارئین کو مرشد اقبالؒ کے افکار و عقائد سے کسی قدر آگاہی حاصل ہو سکے۔ اقبالؒ نے رومیؒ کی چند غزلوں کو اپنے کلام کی زینت بھی بنایا ہے۔ مزید بر آں انہوں نے جا بجا اپنے بعض خیالات و عقائد کی وضاحت کے لئے مولانا رومؒ کے اشعار بھی درج کئے ہیں۔ اس طرح ہمیں رومیؒ سے اقبالؒ کی عقیدت و محبت کا کافی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے۔

رومیؒ کی فنّی عظمت ' روحانی ترفع اور ہمہ گیر شہرت کے نہ صرف علامہ اقبالؒ قائل تھے بلکہ دیگر حقیقت پسند مفکّرین نے بھی انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اس ضمن میں ان جرمن شعراء و ادباء کا تذکرہ بے محل نہ ہو گا جنہوں نے بعض ایرانی شعراء کے تتبع میں اپنی شاعری میں فارسی الفاظ اور تراکیب استعمال کی ہیں۔ علّامہ اقبالؒ نے اپنی کتاب "پیامِ مشرق" کے دیباچہ میں جرمنی میں رومیؒ کی عظمت سے متعلق لکھا ہے:۔

"غرضیکہ مغربی دیوان کی وساطت سے گوئٹے نے جرمن ادبیات میں عجمی روح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بعد کے شعراء پلاٹن ' روکرٹ اور بوڈن شاٹ نے اس مشرقی تحریک کو جس کا آغاز گوئٹے کے دیوان سے ہوا' تکمیل تک پہنچایا....... روکرٹ عربی ' فارسی ' سنسکرت تینوں زبانوں کا ماہر تھا۔ اس کی نگاہ میں رومیؒ کی بڑی وقعت تھی اور اس کی "غزلیات" زیادہ تر مولانا روم ہی کی تقلید میں لکھی گئی ہیں۔ چونکہ السنۂ شرقیہ کا عالم تھا اس لئے اس کی مشرقی نظم کے مواخذ بھی وسیع تھے"

(پیامِ مشرق صفحہ 180)

علامہ اقبالؒ نے اپنی ایک فارسی نظم "جلالؒ و گوئٹےؒ" میں گوئٹے اور رومیؒ دونوں کو جنّت میں مصروفِ گفتگو دکھایا ہے۔ گوئٹے نے حکیم فوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کے بارے میں ایک شہرۂ آفاق ڈرامہ "فوسٹ" faust لکھا تھا جس میں اس نے انسان کی امکانی نشوونما کے تمام مدارج بڑی خوبی اور کمالِ فن کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ گوئٹے رومیؒ کو ایک حکیم اور ابلیس کا قدیم روایتی قصۂ عہد و پیمان سناتا ہے تو رومیؒ اسے کہتا ہے ؎

دانَد آں کو نیک بخت و محرم است　　　　زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است
(رومیؒ)

(جو شخص نیک بخت اور محرمِ اَسرارِ معرفت ہے وہ یہ بات جانتا ہے کہ عقل پرستی ابلیس کی عادت ہے اور عشق آدم کی خوبی ہے۔)

شاعر مشرقؒ نے بڑے کمالِ فن کے ساتھ رومیؒ کی گوئٹے پر برتری یہاں ظاہر کی ہے۔ اس طرح اس نے "پیامِ مشرق" کی ایک اور نظم "جلال و ہیگل" میں یہ بتایا ہے کہ وہ ایک رات جرمن فلسفی ہیگل کے فلسفیانہ خیالات کے بارے میں کافی سوچ بچار کرنے کے بعد سو گئے۔ خواب میں انہیں پیر یزدانی، یعنی مولانا رومؒ کی زیارت نصیب ہوئی چنانچہ مولانا روم انہیں سمجھاتے ہیں کہ محدود انسانی عقل کی بدولت خدا کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی۔ علامہ اقبالؒ کے عقیدت آمیز اشعار اور رومیؒ کے ایمان افروز جواب کو اقبالؒ ہی کی زبان سے سُنیئے وہ کہتے ہیں۔

شعلہ اش در جہانِ تیرہ نہاد به بیاباں چراغِ رہبانی
معنی از حرفِ اُو ہمی رَدید صفتِ لالہ ہائے نعمانی
گفت با من، چہ خفتہ اِی برخیز به سُرابے سفینہ می رانی
"برخرد راہِ عشق می پوئی؟ به چراغ، آفتاب می جوئی؟

(اس کا شعلہ (عشق) ظلمت خیز دنیا میں ایسا ہے جیسا کہ بیابان میں کسی رہبان کا چراغ ہو۔
اس کی بات سے اس طرح معانی پیدا ہوتے ہیں جس طرح کہ لالہ کے پھول ہوتے ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا تُو کیوں سویا ہوا ہے اٹھ (غفلت سے بیدار ہو) تُو سراب میں کیوں کشتی چلا رہا ہے؟
تُو کیا عقل کے ذریعے عشق کی راہ پر چل رہا ہے؟ کیا تُو چراغ (عقل) لے کر آفتاب (خدا) کو تلاش کر رہا ہے؟")

الغرض مولانا رومؒ کی فنی عظمت، روحانی بلندی، حقیقت بینی، حقیقت گوئی، قرآنی حقائق کی شرح، عشق پرستی، خدا طلبی اور دلی پاکیزگی سے علامہ اقبالؒ بے حد متاثر ہیں۔ انہوں نے جابجا اپنے بعض مطالب کی تشریح و توضیح کیلئے رومیؒ کے اشعار و افکار کا حوالہ دیا ہے۔ انہیں اس بات پر فخر حاصل ہے کہ انہوں نے اس بلند پایہ شاعر، صوفی اور عاشقِ رسولؐ کی پیروی کرتے ہوئے اپنے دَور کے بعض اہم فتنوں مثلاً مادہ پرستی، عقلیت، انکارِ خدا، بے روح عبادات اور غلط اقدارِ حیات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے لوگوں کو قرآنی نظریات اور صحیح اسلامی تعلیمات کی طرف دعوت دی ہے۔ علامہ اقبالؒ اپنی اس خدمت کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

چُو رومیؒ درحَرَم دادم اذاں من ازُو آموختم اَسرارِ جاں من
بہ دَور فتنۂ عصرِ کہن او بہ دَورِ فتنۂ عصرِ رواں من

(ارمغانِ حجاز صفحہ 938)

(میں نے رومیؒ کی طرح حرم میں اذان دی ہے۔ میں نے ان سے ہی روح کے اَسرار سیکھے ہیں۔

انہوں نے یہ کام گزشتہ پُرفتن زمانے میں سرانجام دیا تھا اور میں نے یہ کام موجودہ دور کے فتنوں میں کیا ہے۔)

کیا یہ حقیقت نہیں کہ دورِ حاضر کی اس نابغہ شخصیت یعنی علامہ اقبالؒ نے مولانا رومؒ سے جس قدر اپنی دلی عقیدت اور ذہنی مماثلت کا تذکرہ کیا ہے وہ کسی مفکّر یا فلسفی سے نہیں کیا؟ کیا مولانا رومؒ ایک بلند پایہ عالمِ دین، روشن ضمیر صوفی، شریعت پسند صاحبِ طریقت اور انقلاب آفرین عاشقِ رسولؐ نہیں تھے؟ کیا ان باتوں سے یہ حقیقت نکھر کر ہمارے سامنے نہیں آجاتی کہ علامہ اقبالؒ صحیح قرآنی تصوّف اور اسلامی طریقت کے نہ صرف قائل تھے بلکہ وہ اس کے بےباک مبلّغ اور داعی بھی تھے۔؟ ان کی نظر میں قرآنی تعلیمات اور اسوۂ رسولؐ پر بخوبی چلنے کیلئے دل و دماغ کی یکسوئی، رضا و رغبت، خلوص و محبت، علمِ شریعت پر عمل کرنے کا جذبۂ صادق کا پہلے ہونا اشد ضروری ہے وگرنہ عبادات بے روح ہو کر متوقع مفید نتائج پیدا نہیں کر سکتیں۔ اگر تصوّف اور طریقت انسان کے اندر یہ صفاتِ حسنہ تخلیق کر دیں تو پھر ان کی مخالفت اور تنقید دراصل قرآن کی مخالفت و تنقید کے مترادف ہیں۔ قرآنی احکام (شریعت) پر چلنے کیلئے دل و دماغ میں جوش و ہوش (عشق و عقل) کا امتزاج بہترین نتائج کا حامل ہوا کرتا ہے۔ صحیح طریقت اور تصوّف تو ہمارے دلوں میں اسلامی احکام پر عمل پیرا ہونے کا جوش پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ دونوں چیزیں شریعت کے غلبہ و نفاذ اور اسلام کی پیش رفت کا باعث ثابت نہیں ہوتیں تو پھر ان کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ اس اہم بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

یہ حکمتِ ملکوتی، یہ علمِ لاہوتی حَرَم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سجود تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خِرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل؟ دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
(تصوّف ضربِ کلیم صفحہ 497 - 496)

....

نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ (پیدائش 634ھ)

نظام الدین اولیاءؒ برِّ صغیر پاک و ہند کے مشاہیر مشائخِ طریقت اور صوفیائے کبار کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی پیدائش بدایون میں ہوئی تھی لیکن وہ مزید تعلیم روحانی تربیّت اور عارفانہ فیض کیلئے باوا فرید الدین گنج شکرؒ کے پاس پاک پتن چلے گئے۔ اپنے مرشد سے روحانی فیض حاصل کرنے کے بعد وہ دوبارہ دہلی آ گئے اور یہاں دینِ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام بڑی تندہی سے شروع کر دیا۔ ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہزاروں انسان مسلمان ہو گئے۔ علامہ اقبالؒ جب 1905ء میں اعلیٰ تعلیم کیلئے یورپ جانے لگے تو وہ دہلی میں ان کے مزار پر حاضر ہوئے اور ایک عارفانہ نظم پڑھی۔ اس واقعہ سے

علامہ اقبالؒ کے ذوقِ تصوّف اور عارفانہ شوق کا پتہ چلتا ہے۔ وہ چونکہ خود تصوّف و شریعت کے امتزاج کے حامی تھے اس لئے وہ صحیح علمائے شریعت اور مشائخ طریقت سے بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔

بزرگانِ دین اور صحیح خادمانِ اسلام کے ساتھ علامہ اقبالؒ کو ہمیشہ گہری عقیدت رہی ہے۔ انہوں نے دہلی میں برّصغیر پاک و ہند کے ایک معروف اور عظیم المرتبت ولی حضرت نظام الدین اولیاءؒ، محبوبِ الٰہی کے مزار پر نہ صرف حاضری دی بلکہ ایک طویل یادگار نظم بھی لکھی۔ ذرا تصور تو کیجئے کہ ایک نوجوان مسلمان اعلیٰ تعلیم کی خاطر اپنے وطنِ عزیز کو چھوڑ کر انگلستان جا رہا ہے جہاں کے حسنِ دلآویز کے قصے عشق پرست بوڑھوں کو بھی آتش بجان کر دیتے ہیں۔ اسے اپنی تہذیب ' ثقافت ' مذہبی اقدار اور آبائی اطوار کا اس قدر خیال ہے کہ وہ ملّتِ اسلامیہ کے ایک روشن چراغ سے کسبِ ضیاء کر کے مغرب جا رہا ہے تاکہ وہاں کے ماحول کی تاریکی میں وہ اسے اپنا راہبر بنا سکے۔ علامہ اقبالؒ کی اس طویل ' یادگار اور معرفت خیز نظم کا عنوان ہے "التجائے مسافر (بہ درگاہ حضرت محبوب الٰہی دہلی)

(اس نظم کے چند اشعار ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا	بڑی جناب تری، فیضِ عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم	نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی	بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے	شرابِ علم کی لذّت کشاں کشاں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے	کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دُکھے	کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر	تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

(بانگ درا صفحہ 97 - 96)

خدا تعالیٰ نے اقبالؒ کی یہ مخلصانہ دعا قبول کرتے ہوئے اسے اپنے ہم سفروں سے بہت آگے مقام عطا کیا ہے اور اسے دلوں کو چاک کرنے والی فغاں بھی دی ہے۔

ان اکابر صوفیاء اور علمائے کرام کے علاوہ اقبالؒ نے دیگر عظیم المرتبت صاحبانِ طریقت اور حاملانِ شریعت کا بھی اپنے کلام خطوط اور دیگر تحریروں میں ذکر کیا ہے جس سے ان کی شدید عقیدت و محبّت کا اظہار ہوتا ہے۔ یاد رہے علامہ اقبالؒ کی اس عقیدت کا مرکز و محور صرف جذبہ اسلام اور ان بزرگوں کی اسلامی خدمات کا اعتراف ہے۔ انہوں نے اپنے روحانی مرشد مولانا رومؒ کے دو روحانی استادوں یعنی خواجہ کمال الدین بغدادیؒ اور شمس تبریزیؒ کا بھی بڑے احترام کے ساتھ تذکرہ کیا ہے علاوہ ازیں وہ شیخ

شہاب الدین سہروردیؒ المعروف شیخ مقتول اور شاہ ولیؒ اللہ کی خدماتِ جلیلہ کے بھی معترف تھے۔
صوفیائے کرام اور ان بزرگانِ عظام کے علاوہ شاعرِ مشرقؒ نے ان شعراء کا بھی بڑی محبت سے نام لیا ہے جنھوں نے کسی نہ کسی طرح کوئی اسلامی خدمت سرانجام دی ہے۔ حافظ شیرازیؒ ' مولانا جامیؒ ' عراقیؒ ' سعدیؒ اور عربی زبان کی مشہور ترین نعتیہ نظم ''قصیدۂ بردہ شریف'' کے مصنف حضرت بصیریؒ کے جذبۂ عشقِ رسولؐ اور رموزِ معرفت کی بناء پر ان کو بھی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ کئی مقامات پر ان کے اشعار کا حوالہ دیا ہے اور کہیں ان کی تضمین بھی کی ہے۔
صوفیائے کرام کے جذبۂ عشقِ اسلام کی اہمیت و برتری کو واضح کرنے کیلئے کہیں کہیں علامہ اقبالؒ نے مسلم اور غیر مسلم حکماء ' فلاسفہ اور ظاہر بین علماء کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان حکماء اور فلاسفہ کا انہوں نے جذبۂ عرفاً اور صوفیاء سے مقابلہ و موازنہ کر کے آخر کار جذبۂ عشق کو عقل پرستی پر ترجیح دی ہے۔ ان کی رائے میں فلسفہ ' علم الکلام اور محض علومِ ظاہری کی روش پر چل کر ہم حقیقت الحقائق (خدا) تک نہیں پہنچ سکتے اور نہ ہی فلسفہ و حکمت ہمارے اندر یقینِ محکم اور پختہ اعمال کو جنم دے سکتے ہیں۔ جب یقین ہی محکم نہ ہو گا تو ہم عمل کے راستے پر کیسے گامزن ہو سکیں گے؟ اسلام چونکہ ایمانِ کامل اور عملِ صالح کا دوسرا نام ہے اس لئے ہمیں ان دونوں صفات کا حامل ہونا چاہئے فلسفہ و حکمت چونکہ عقلِ محدود اور عقلِ ناقص پر مبنی ہیں اس لئے وہ بے یقینی ' تذبذب ' مصلحت کوشی ' بزدلی ' تشکیک پرستی ' مادیت ' عقلیت ' حواسِ ظاہری کی غلامی ' خیال آرائی اور سوزِ دروں کے فقدان کی علامت ہیں۔ جب ہمارے افکار و خیالات ہی غیر واضح ' غیر یقینی اور فرار عن الحیات کے مظہر ہوں گے تو پھر ہمارے اعمال میں پختگی ' عقائد میں شدت ' جذبۂ جہاد کا شوق اور جرأتِ رندانہ کی صفات کہاں سے آئیں گی؟ پختہ افکار و اعمال کا یہ فقدان ہمیں اسلامی تعلیمات اور قرآنی احکام پر عمل پیرا ہونے سے روکے گا۔ اس طرح ہم اسلام سے دور ہوتے جائیں گے۔ اس کے برعکس شریعتِ اسلامیہ کی پیروی اور تزکیۂ نفس کی تربیت ہمارے افکار اور اعمال کو پختہ اور منور بنانے کیلئے ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اربابِ نظر خود اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ قرآنی نظام پر عمل پیرا ہو کر اسے عملی شکل دینے کیلئے پختہ افکار و اعمال ضروری ہیں یا کہ ظن و تخمین پر مبنی خیالات اور بے ربط اعمال۔
اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر علامہ اقبالؒ نے جذبۂ عشقِ اسلام کے علمبرداروں کو عقل و خرد کے اندھے پرستاروں پر ترجیح دی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ علامہ اقبالؒ عقل دشمن تھے یا وہ عقل کو بیکار شے تصور کرتے تھے۔ وہ دنیاوی امور کو بخوبی سرانجام دینے اور کائنات کی قوتوں کو مسخر کرنے کیلئے عقل و علم کی اہمیت پر ہمیشہ ہی بہت زور دیتے ہیں جب عقلِ انسانی اپنی محدودیت کی سرحد سے آگے بڑھ کر غیبی حقائقِ زندگی اور مستور رموزِ دین کی ہمہ دانی کا دعویٰ کرتی ہے تو اقبالؒ اس کی اس روش پر تنقید کرتے ہیں۔ وہ عقل کو نُور اور چراغِ راہ تو تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ اسے منزل آشنا تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔
منزل سے آشنا ہونے کیلئے انسان کو محض عقل ہی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اسے وحی و الہام کو اپنا قائد ماننا

ہوتا ہے۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نُور چراغِ راہ ہے' منزل نہیں ہے

اب ذیل میں علامہ اقبالؒ کے وہ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں انہوں نے فلسفہ اور تصوّف کا موازنہ و مقابلہ کیا ہے۔ موضوع کو مختصر کرتے ہوئے ان اشعار ہی پر اکتفا کی جاتی ہے۔ وہ عالمِ اسلام کے ایک مایۂ ناز فلسفی بو علی سیناؒ کے فلسفہ و حکمت اور رومیؒ کے تصوّف کا یوں مقابلہ کرتے ہیں ؎

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم دستِ رومی پردۂ محمل گرفت
ایں فرو تر رفت و تا گوہر رسید آں بہ گردابے چو خس منزل گرفت

(بو علی سیناؒ اونٹنی کے غبار میں گم ہو گیا لیکن رومی کے ہاتھ نے محمل کے پردے کو پکڑ لیا ہے۔
یہ (رومیؒ) تو سمندر کی تہہ میں پہنچ کر موتی لے آیا لیکن وہ (بو علی سیناؒ) تنکے کی مانند گرداب ہی میں رہ گیا۔)

(پیامِ مشرق صفحہ 276)

امام فخر الدین رازیؒ بلاشبہ عالمِ اسلام کی ایک نابغہ شخصیت تھے۔ انہوں نے قرآنِ حکیم کی تفسیر کرتے ہوئے بڑے بڑے عجیب و غریب علمی نکات بیان کئے ہیں۔ ان کی تفسیرِ قرآن میں فلسفہ و منطق کے علاوہ دیگر علوم ظاہری کی بھی آن بان دکھائی دیتی ہے۔ ان کا طرزِ نگارش زیادہ تر استدلالی ہے۔ علامہ اقبال ان کے تبحرِ علمی اور نکتہ ہائے دقیق کے معترف ہیں لیکن ان کی رائے میں یہ علمی نکات اور عقلی دلائل بعض دلی شکوک و شبہات کا علاج نہیں کر سکے اس طرح دل کو مطمئن کرنے کی بجائے بعض مقامات میں یہ شکوک بے یقینی کا باعث بن گئے ہیں۔ ان کا نقطہ نگاہ ملاحظہ ہو

علاجِ ضعفِ یقیں ان سے ہو نہیں سکتا غریب اگرچہ ہیں رازیؔ کے نکتہ ہائے دقیق
(بالِ جبریل صفحہ 326)

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کُشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف
بالِ جبریل صفحہ 370)

علامہ اقبالؒ حضرت علیؓ کے دل کو کمالِ عشق و مستی اور رازی کے عقلی دلائل کو زوالِ عشق و مستی کا سبب قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

کمالِ عشق و مستی' ظرفِ حیدرؓ زوالِ عشق و مستی' حرفِ رازیؒ
(بالِ جبریل صفحہ 375)

اسی جذبۂ عشق و مستی کی بناء پر وہ مولانا رومؒ کو رازیؒ پر فائق تصوّر کرتے ہوئے اپنے عقیدے کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

نے مہرہ باقی' نے مہرہ بازی جیتا ہے رومی' ہارا ہے رازیؒ
(بالِ جبریل صفحہ 363)

تصوّف کے عناصرِ ترکیبی

جس طرح کسی نظامِ فکر و عمل کی عمارت چند ضروری اساسی اصولوں پر استوار ہوتی ہے اِسی طرح تصوّف کی تعمیر و تشکیل میں بھی چند بنیادی امور کو دخل حاصل ہے۔ تصوّف کے تار و پود میں جو اساسی چیزیں شامل ہیں ' ان کا یہاں اجمالی تذکرہ بے محل نہ ہو گا۔ تصوّف کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں دیگر فکری اور عملی نظاموں کی طرح اس کے عناصرِ ترکیبی چند سادہ اصول تھے لیکن جُوں جُوں زمانہ گزرتا گیا اس کی عمارت کے در و دیوار بھی مختلف اور بے شمار چیزوں سے مزیّن اور پیچیدہ تر ہوتے گئے۔ اس ارتقائی عمل کی بو قلمونی کے باوجود اس کے چند اساسی اور معروف ترین اصول اور طریقے تقریباً ہر دَور میں اختیار کئے گئے۔ علاّمہ اقبالؒ نے اپنی شعری تصانیف میں تصوّف کے جن عناصرِ ترکیبی پر اظہار خیال کیا ہے وہ بڑے اختصار کے ساتھ یہاں بیان کئے جاتے ہیں تاکہ قارئین کرام اس اہم موضوع کے گُونا گُوں پہلوؤں سے کسی قدر آشنا ہو سکیں۔ میری رائے میں "اقبالؒ اور تصوّف کی اہمیّت" کا موضوع اس وقت تک مکمل نہیں کہلایا جا سکتا جب تک کہ تصوّف و معرفت کے ان ضروری اور عام اصولوں پر روشنی نہ ڈالی جائے جو اس کی تعمیر و تشکیل میں بے حد معاون اور مفید ثابت ہوئے ہیں۔ تصوّف و طریقت کا تانا بانا مندرجہ ذیل چیزوں پر منحصر دکھائی دیتا ہے۔ اس ضمن میں مفکرِ اسلام اور شاعرِ مشرق علاّمہ اقبالؒ کے افکار و احساسات کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

(1) اخلاص وسوز

اپنے آپ کو کسی شخص یا کسی چیز کیلئے خالص کر لینا اخلاص اور کسی مقصد کو حاصل کرنے کی شدید لگن رکھنا سوز کہلاتا ہے۔ تصوف و طریقت میں ان دونوں خوبیوں کی اہمیت وافادیت پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص خدا' اس کے رسولؐ اور اس کے پیام کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین سمجھتا ہے یا اس کا دعویٰ کرتا ہے تو پھر اسے اپنے بھرپور عمل' نیت اور خیال کی صداقت کا ثبوت دینے کیلئے اخلاص و سوز کو اختیار کرنا چاہیئے۔ علامہ اقبالؒ' حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ کے سوز و عشق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

سروری در دینِ ما خدمت گری است　　عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری است

سوزِ صدیقؓ و علیؓ از حق طلب　　ذرۂ عشقِ نبی از حق طلب

ہمارے دین میں سرداری دراصل خدمت کا نام ہے۔ یہ حضرت عمرؓ کے عدل اور حضرت علیؓ کے فقر پر مبنی ہے تُو خدا سے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ کا سوز طلب کر۔ تو خدا سے عشقِ رسولؐ کا ذرہ مانگ

(پیام مشرق صفحہ 20)

سوزِ دروں نورِ بصیرت کے حصول اور سماجی فروغ کا سبب بنا کرتا ہے۔ ذاتی سوز اعلیٰ خوبی ہے لیکن یہ محض ذاتی فروغ کا ذریعہ نہ ہو بلکہ دوسروں کے اذہان و قلوب کی تنویر کا بھی باعث ہو تو بہتر ہے بقولِ اقبالؒ ؎

جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا　　یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمعِ انجمن بھی ہے

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا　　بزم کو مثلِ شمعِ بزم حاصلِ سوز و ساز دے

صورتِ شمع نور کی ملتی نہیں قبا اسے　　جس کو خدا نہ دہر میں گریۂ جاں گداز دے

(بانگ درا صفحہ 113)

سوز کی ایک وجہ محبوب سے جدائی اور دُوری کا احساس بھی ہے۔ جب عاشق اپنے معشوق سے دور ہو تو وہ اس سے ملاقات کیلئے بے چین ہوتا ہے۔ دُوری کا یہ احساس اور وصال کی آرزو محبت کے دل میں سوز و گداز کا سبب بنتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کی نظر میں یہ خاکی دنیا بہشت سے اس لئے خوشتر ہے کہ یہ اس کے ذوق و شوق کی آگ کو تیز تر کر دیتی ہے۔ اہل تصوف بھی محبوبِ حقیقی کے فراق میں بے چین اور پُر سوز ہوا کرتے ہیں ؎

مرا ایں خاکدان من ز فردوسِ بریں خوشتر　　مقام ذوق و شوق است ایں حریمِ سوز و ساز است ایں

(میرے لئے میری یہ خاکی دنیا جنّت سے بہتر ہے کیونکہ یہ ذوق وشوق کا مقام اور سوز و ساز کا حریم ہے۔)
(زبورِ عجم صفحہ 131)

سوز و اخلاص سے متعلق یہ اشعار بھی مدِ نظر رکھئے ۔

شیوۂ اخلاص را محکم بگیر　　پاک شو از خوفِ سلطان و امیر

(تو اخلاص کے شیوہ کو مضبوطی سے پکڑ لے۔ تو بادشاہ اور امیر کے ڈر سے محفوظ ہو جا۔)
(جاوید نامہ صفحہ 203)

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر　　حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے　　اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر
(بالِ جبریل صفحہ 9)

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے　　پھر اس میں عجب کیا کہ تُو بےباک نہیں ہے
ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں　　غافل! تُو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے
(بالِ جبریل صفحہ 33)

تصوف و طریقت میں انسان کے اندر اخلاص اور سوز کی خوبی پیدا کی جاتی ہے تاکہ وہ پورے ذوق اور خلوص کے ساتھ خدا کی اطاعت و محبّت کر سکے۔ خدا کا جذبۂ محبّت اس کے اندر بے باکی حق گوئی اور بے نیازی کی شان پیدا کر کے اسے دوسروں کی اصلاح کیلئے تیار کیا کرتا ہے۔

(2) بے نیازی اور بے باکی

تصوف و طریقت کا دوسرا عنصرِ ترکیبی بے نیازی اور بے خوفی کی صفت ہے۔ جب صوفی حقیقی معنوں میں خدا پرست بن جاتا ہے تو پھر وہ انسانوں سے بے نیاز ہو کر صرف خدا پر توکل کرنے لگتا ہے۔ وہ انسانوں کی بجائے اپنے محبوبِ حقیقی کو اپنی تمام حاجات کی تکمیل کیلئے پکارتا اور اس کے احکام کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ چونکہ وہ انسانوں کو اپنا حاجت روا اور ان داتا خیال نہیں کرتا اس لئے وہ بڑی بے باکی کے ساتھ ان سے پیش آتا ہے اور ان کی اصلاح کرتا ہے۔ جب انسان بتوں سے امیدیں وابستہ کرے اور خدا سے نومید ہو جائے تو پھر اسے ایمان میں پختہ قرار نہیں دیا جا سکتا بقول شاعرِ مشرق ۔

بُتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی　　مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

علّامہ اقبالؒ نے مندرجہ ذیل شعروں میں بے نیازی اور بے باکی کی اہمیت اور اثرات کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے تاکہ ناظرین ان کے سب گوشوں سے آشنا ہو سکیں۔ اب چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

خود فرود آ از شتر مثلِ عمرؓ　　الحذر از منّتِ غیر الحذر

(توحضرت عمرؓ کی طرح اونٹ سے خود نیچے آ۔ دوسروں کے احسان سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہئے۔)
(اسرارِ خودی صفحہ 23)

علامہ اقبالؒ خود اس شعر کی یوں وضاحت کرتے ہیں "جب بحالتِ سواریٔ اُشتر جناب فاروقؓ کا تازیانہ ہاتھ سے گر گیا تو اسے زمین پر سے اٹھانے کیلئے آپ خود اونٹ سے اترے اور اس معمولی کام کیلئے بھی کسی کا احسان گوارا نہ فرمایا۔ اس شعر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے"۔

علمِ حق را در قفا انداختی　　بہرِ نانے نقدِ دیں در باختی

(تو نے حق کے عطا کردہ علم کو پس پشت ڈالا ہے اور ایک روٹی کی خاطر دین کی پونجی لٹادی ہے۔)
(اسرارِ خودی صفحہ 68)

جب انسان حصولِ علم کو محض معاش کا ذریعہ بنائے تو وہ دوسروں کا محتاج ہو کر دین کی صحیح خدمت نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی روٹی کی خاطر دینی علم کو لوگوں کی بیجا خوشنودی اور چاپلوسی پر قربان کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔ محتاجی تو شیر دل انسانوں کو بھی لومڑی بنا دیا کرتی ہے بقول اقبالؒ ؎

آنچہ شیراں را کند رُوبہ مزاج　　احتیاج است احتیاج است احتیاج

(جو چیز شیروں کے اندر لومڑی جیسا مزاج پیدا کر دیتی ہے وہ محتاجی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔)

ایمان باللہ سے مومن کا دل خدا کے سوا ہر ایک ہستی اور چیز سے بے نیاز اور بے خوف ہو جایا کرتا ہے۔ بندۂ مومن کو نہ تو ماضی کا غم ہوتا ہے اور نہ ہی مستقبل کا کوئی خوف، وہ خدا کی ذات پر کامل بھروسہ رکھتے ہوئے اس کے احکام کو برضا و رغبت تسلیم کرتا ہے۔ وہ "مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ" کے مصداق ہر حال میں راضی برضا اور خوش رہتا ہے کیونکہ وہ عمل کرنے پر مکلّف ہے نہ کہ نتائج پر۔ جو شخص خدا سے نہیں ڈرتا وہ ہر انسان سے خائف ہوتا ہے۔ جس انسان نے خدا کو اپنا حقیقی رازق، مالک، خالق اور آقا مان لیا وہ کیونکر دوسروں کو اپنا حاجت روا خیال کر سکتا ہے؟ مسلم اور مومن تو خدا کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والا اور ان پر ایمان رکھنے والا ہوتا ہے۔ وہ جب خدا کا بن گیا تو پھر وہ دوسروں کی اطاعت اور خوف کو اپنے دل و دماغ میں کیونکر جگہ دے سکے گا؟ علامہ اقبالؒ مسلمان اور مومن کی بے باکی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں ؎

قوتِ ایماں حیات افزایدت　　وردِ لا خوفٌ علیہم بایدت
بیمِ غیر اللہ عمل را دشمن است　　کاروانِ زندگی را راہزن است

(رموزِ بے خودی صفحہ 96)

(ایمان کی طاقت تیرے لئے حیات افزا ہے اس لئے تجھے لاخوفٌ علیہم (اللہ کے دوست بے خوف ہوتے ہیں) کا ورد کرنا چاہئے خدا کے سوا کسی اور کا خوف عمل کیلئے دشمن ہے۔ وہ زندگی کے کارواں کا راہزن ہوتا ہے)

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست　　پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست
رمزِ قرآں از حسینؓ آموختیم　　ز آتشِ اُو شعلہ با اندوختیم

(مسلمان اللہ کے سوا کسی اور کا غلام نہیں ہوتا اس لئے اس کا سر کسی بھی فرعون کے سامنے خم نہیں ہوتا۔
ہم نے قرآن کا راز (توحید) حسینؓ سے سیکھا ہے۔ اس کی آگ (عشق) سے ہم نے شعلے جمع کئے ہیں۔)

(رموزِ بے خودی صفحہ 111)

مومنِ بالائے ہر بالا ترے　　غیرتِ اُو بر نتابد ہمسرے
خرقۂ لاتحزنوُ اندر برش　　انتم الاعلون تاجے برسرش
پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر　　امر و نہی اُو عیارِ خیر و شر

(بلند مرتبہ مومن ہر ایک سے اعلیٰ تر ہے اس لئے اس کی غیرت کسی بھی ہمسر کو برداشت نہیں کرتی
لا تحزنو (تم غم مت کھاؤ) کا خرقہ اس کے جسم پر ہوتا ہے اور انتم الاعلون (تم مومنین ہی افضل و اعلیٰ ہو)
کا تاج اس کے سر پر ہوتا ہے۔)
(باطل کے سامنے وہ تلوار مگر حق کے سامنے وہ سپر ہوتا ہے۔ خدا کے احکام (امر و نہی) اس کیلئے خیر و شر کا
معیار ہوتے ہیں۔)

(رموزِ بے خودی صفحہ 164)

بے نیازی سے متعلق علامہ اقبالؒ کے خیالاتِ عالیہ اور معرفت پرور جذبات کا ذرا سا عکس ان اشعار میں
دیکھئے ؎

حاجتے پیشِ سلاطیں نبرُد مردِ غیور　　چہ تواں کرد کہ از کوہ نیاید کاہی

(غیرت مند انسان اپنی کوئی حاجت بھی بادشاہوں کے سامنے نہیں لے جاتا کیونکہ پہاڑ گھاس کے طریقے
اختیار نہیں کر سکتا۔)

(پیامِ مشرق صفحہ 180)

ز آستانۂ سلطاں کنارہ می گیرم　　نہ کافرم کہ پرستم خدائے بے توفیق

(میں بادشاہ کی درگاہ سے دور رہتا ہوں۔ میں کافر نہیں کہ کسی بے توفیق خدا کی پوجا کروں۔)

(زبورِ عجم صفحہ 114)

؎ خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں　　زِرّہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا
نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی　　وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ

(بالِ جبریل صفحہ 23)

(3) جذبۂ عشق و محبت

دینِ اسلام کے پانچ ارکان (کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج) کی صحیح طور پر بجا آوری کیلئے خلوصِ نیت، عملِ صالح، ایثار، پیہم جدوجہد اور جذبۂ عشق و محبت کا ہونا اشد ضروری ہے۔ محض زبان سے خدا کی وحدانیت اور رسالتِ محمدیؐ کا اقرار کافی نہیں ہے بلکہ قلبی تصدیق، ایمانِ محکم اور عملِ صالح بھی لازمی ہیں۔ مسلمان ہونا کوئی آسان کام نہیں بلکہ یہ تو شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے اسی طرح نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے فرائض کی ادائیگی کیلئے بندۂ مومن کو وقت، آرام، نیند، پیسے اور ذاتی مرغوبات کو خدا کی رضا پر قربان کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے جب تک خدا اور اس کے پیارے رسولؐ کی محبت کسی کے دل و دماغ میں پوری طرح جاگزیں نہ ہوگی وہ ارکانِ اسلام کو پورا کرنے کیلئے راضی نہ ہوگا۔ اگر دل و دماغ ہم آہنگ نہ ہوئے تو پھر اطاعت کے تمام مقتضیات کی تکمیل ممکن نہیں ہو سکے گی۔ خدا، رسولِ کریمؐ اور اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے کیلئے جذبۂ عشق و محبت کا وجود بے حد لازمی ہے۔ عشق و محبت کی اس اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اکابر صوفیاء اور اہلِ طریقت و شریعت نے خدا کی اطلاعت اور اطاعتِ رسولؐ کو اسلام کی عمارت کیلئے بنیاد کا درجہ دیا ہے۔ اگر تصوّف بھی شریعت کے ارکان کی بجا آوری کیلئے خداپرستی اور عشقِ مصطفٰےؐ کے جذبات و احساسات کی تقویّت کا باعث بنتا ہے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اگر کوئی علم، فن اور طریقِ کار خداپرستی کے جذبات کے فروغ و استحکام کا ذریعہ ثابت ہو تو اسے قبول نہ کرنا دین و دانش کی حکمت کا اَبطال نہیں تو اور کیا ہے؟ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تصوّف ارکانِ اسلام کو قائم اور مضبوط رکھنے کا ایک مؤثر اور مفید طریقِ کار ہے۔ یہ شریعت کا مخالف نہیں بلکہ ممد و معاون ہے۔ اگر کوئی سلسلۂ تصوّف اور طریقِ معرفت شریعت کا مؤید اور دوست نہیں تو وہ قابلِ مذمت اور لائق تنقید ہے۔ علّامہ اقبالؒ جذبۂ عشق و محبت کی ہمہ گیریت کے زبردست حامی تھے۔ اس لئے وہ اس جذبے کی اہمیت و آفاقیت کو مختلف اسالیب میں بیان کرتے ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں وہ عقل پر عشق کو ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں

عشقِ افلاطون علّت ہائے عقل　　بہ شود از نشترش سودائے عقل
جُملہ عالَم ساجد و مسجود عشق　　سومناتِ عقل را محمود عشق

عشق عقل کے امراض کیلئے بمنزلہ افلاطون ہے۔ عشق کے نشتر سے عقل کی دیوانگی ٹھیک ہو جاتی ہے۔ تمام کائنات عشق کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہے۔ عقل کے سومنات کیلئے عشق محمود غزنویؒ کی حیثیت رکھتا ہے۔

بگذر از عقل و در آویز بہ موجِ یمِ عشق　　کہ در آں جوئے تُنک مایہ گہر پیدا نیست

(اسرارِ خودی صفحہ 69)

(تو عقل کو چھوڑ کر عشق کے سمندر کی موج کو پکڑ لے کیونکہ اس کم آب ندی (عقل) میں موتی نہیں ہوتے۔)

(پیام مشرق صفحہ 170)

؎ محبت کے شرر سے دل سراپا نُور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طُور ہوتا ہے
(بانگ درا صفحہ 74)

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل؟
حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں
(بالِ جبریل صفحہ 47)

علامہ اقبالؒ کو اس بات کا افسوس ہے کہ دورِ حاضر کے مسلمانوں میں خدا، رسولِ کریمؐ اور اسلام کے ساتھ گہری وابستگی نہیں رہی حالانکہ اطاعتِ خدا و رسولؐ مسلمانوں کی ہمہ جہت ترقی اور کامرانی کی ضامن ہے۔ ہمارے اسلاف کے پاس یہی قرآن تھا جو ہمارے پاس موجود ہے لیکن وہ زبانی دعویٰ کی بجائے اسلام کی حقیقی محبّت کے علمبردار تھے۔ شاعرِ مشرقؒ مسلمانوں کے دل میں وہی جذبۂ عشقِ اسلام موجزن دیکھنے کے خواہاں ہیں، اس بارے میں ان کے یہ اشعار قابل مطالعہ ہیں ؎

در مسلمان شانِ محبوبی نماند
خالدؓ و فاروقؓ و ایوبیؒ نماند
تازہ کُن آئینِ صدیقؓ و عمرؓ
چوں صبا بر لالۂ صحرا گذر

(مسلمانوں میں خدا کا محبوب ہونے کی شان باقی نہیں رہی یہی وجہ ہے اب ان میں خالدؓ، فاروقؓ اور ایوبیؒ نہیں رہے تُو ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے دستور کو تازہ کر تُو صبا کی مانند ریگستان کے لالہ زار پر سے گزر۔)

(پیام مشرق صفحہ 18)

؎ ہوسِ منزلِ لیلیٰ نہ تُو داری و نہ من
جگرِ گرمئ صحرا نہ تو داری و نہ من
دل و دِیں در گروِ زہرہ و شانِ عجمی
آتشِ شوقِ سلیمیٰ نہ تو داری و نہ من

(لیلیٰ (اسلام) کی منزل کی خواہش نہ تجھ میں ہے اور نہ مجھ میں۔ صحرا کی گرمی (عشق اسلام) کی نہ تجھ میں تاب ہے اور نہ مجھ میں ہمارے دل اور ہمارا دین عجم کے معشوقوں کے پاس گروی ہیں اس لئے اسلام کی محبت کی آگ نہ تجھ میں ہے اور نہ مجھ میں۔)

(پیام مشرق صفحہ 168)

؎ زندہ کُن باز آں محبت را کہ از نیروئے اُو
بوریائے رہ نشینے درفتد با تختِ کَے

(تو دوبارہ اس محبت کو زندہ کر جس کی طاقت سے ایک درویش بے نوا کا بوریا کیانی بادشاہ کے تخت سے الجھ

پڑتا ہے۔)

(زبورِ عجم صفحہ 47)

اس آخری شعر میں اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ ہے جبکہ چند غریب عرب مسلمان ایرانی بادشاہ کے دربار میں وفد کی حیثیت سے گئے اور وہ بادشاہ کی ظاہری شان و شوکت سے قطعاً متاثر نہ ہوئے۔ اہلِ دربار ان کے سادہ لباس لیکن پُر تمکنت اندازِ گفتگو سے کافی حیران ہوئے۔

علامہ اقبالؒ نہ صرف دوسروں کو جذبۂ عشق و محبت اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں بلکہ وہ خود بھی اس کے فیض کے معترف ہیں انہیں فخر ہے کہ عقلیت کی بھول بھلیوں سے نجات پا کر آخر کار انہیں کوچۂ عشقِ اسلام میں پناہ ملی۔ وہ اپنے فلسفی ہونے پر اتنے نازاں نہیں جتنے کہ وہ عاشقِ رسولؐ اور خادمِ اسلام ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ ان کے فخریہ احساسات سے ذرا لطف اٹھایئے۔

مدّتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی ۔۔۔ پا گئی آسودگی کوئے محبّت میں وہ خاک

(بانگِ درا صفحہ 139)

تکیہ بر عقلِ جہاں بینِ فلاطوں نکنم ۔۔۔ در کنارم دِلکے شوخ و نظر بازے ہست

(میں افلاطون کی جہاں بین عقل پر بھروسہ نہیں کرتا۔ میرے پہلو میں ایک شوخ اور نظر باز دل موجود ہے۔)

(زبورِ عجم صفحہ 16)

خِرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ ۔۔۔ سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبالؔ ۔۔۔ مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

(بالِ جبریل صفحہ 51)

(4) حضورِ دل

تصوّف و طریقت کا ایک اہم نظریہ حضورِ دل ہے جس کا آسان زبان میں مطلب یہ ہے کہ جو کام بھی کیا جائے اس کو پوری دلجمعی سے سرانجام دیا جائے۔ بے دلی کے ساتھ جو کام بھی کیا جائے گا وہ صحیح نتائج پیدا نہیں کر سکے گا۔ صوفیاء اور علمائے شریعت اس بات پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں کہ جب خدا کی عبادت کی جائے تو تمام دنیاوی معاملات اور ذہنی مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر اپنے آپ کو خدا کے حضور میں تصوّر کیا جائے۔ عبادت سے مراد محض نماز ہی نہیں بلکہ ہر وہ کام عبادت سمجھا جائے گا جس کو خدا اور رسولؐ کے احکام کے مطابق کیا جائے۔ نماز کے علاوہ روزہ، زکوٰۃ، حج اور دیگر امور میں خدا کی موجودگی اور اس کی رضا کا تصوّر دراصل حضورِ قلب ہی کا لازمی نتیجہ ہے۔ "لَاصَلٰوۃَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ" (حضورِ دل کے بغیر نماز نہیں ہوتی) کے مصداق دینِ اسلام کے ایک اہم رکن اور مومنین کی معراج کے ذریعہ دل و دماغ کی یکسوئی کی اہمیت سے انکار کرنا محال ہے۔ نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْن (صلوٰۃ

مومن کی معراج ہے) معراج ایک تو عروج کا ذریعہ ہے اور دوسرے اس میں دیدارِ الٰہی کا تصور بھی پنہاں ہے۔ ہادیٔ اعظمؐ نے فرمایا ہے کہ تم جب نماز پڑھو تو یہ خیال کرو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہ خیال کرو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے فَاِنْ لَّمْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ (اگر تو اسے نہ دیکھے تو پھر وہ تجھے دیکھے گا) کی رو سے نماز میں دید کا تصور ضرور موجود ہے۔ اگر انسان ہمیشہ خدا کی معیّت اور نگرانی کے نظریئے کو بدل و جان تسلیم کرلے تو پھر وہ غلط کام کرنے سے گریز کرتا رہے گا۔ قرآن نے اپنے ماننے والوں کو یہ کہا ہے ھُوَمَعَکُمْ (وہ یعنی خدا تمہارے ساتھ ہوتا ہے)۔ خدا کی ہمہ وقت موجودگی کا تصور مسلمانوں کو غلط کام سے روکنے کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ اگر ہم کوئی غلط کام کرتے ہیں تو اس کے دو ہی منطقی نتائج بر آمد ہوتے ہیں (1) یا تو ہم خدا کی موجودگی میں قطعاً کوئی ایمان نہیں رکھتے (2) یا ہم اس کی موجودگی میں یقین رکھنے کے باوجود اس کی اہمیت سے آگاہ نہیں۔ زبان پر خدا کا نام لینا اور دل میں کسی اور ہی چیز کو موجود پانا صلوٰۃ کو بے دلی سے ادا کرنے کے مترادف ہے ؎

بہ زباں تسبیح و در دل گاوَ خر
ایں چُنیں تسبیح کے دارد اثر ؟

(زبان پر تسبیح اور دل میں گاوَ خر کا خیال بڑا عجیب ہے ! اس طرح کی تسبیح کیسے اثر انگیز ہو سکتی ہے ؟)

علامہ اقبالؒ چونکہ قرآنی حقائق کے ترجمان خیال کئے جاتے ہیں اس لئے وہ مسلمانوں کو قرآنی تصورِ خدا سے آشنا کراتے ہوئے ان پر یہ حقیقت منکشف کرتے ہیں کہ عبادت کے وقت زبان اور دل کی موافقت بہت ضروری ہے وہ اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں کے دماغوں میں حضورِ قلب کی افادیت پیدا کرنے کے خواہاں ہیں اور صوفیائے کرام اور علمائے عظّام بھی اس کام پر زور دیتے ہیں۔ اگر تصوف و طریقت کے حامی خدا کی موجودگی کے تصوّر کو ہمارے دلوں میں راسخ کریں تو کیا یہ اقدام بھی لائق تحسین و آفریں نہیں ہونا چاہئے ؟ اندھا دھند تعصب کی بناء پر تصوّف کی اچھی باتوں کی افادیت کو تسلیم نہ کرنا تحقیق و دانش کے اصولوں کی مٹی پلید کرنا نہیں تو اور کیا ہے ؟ علّامہ اقبالؒ حضورِ دل کے مختلف پہلوؤں پر یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ ؎

تیرا امام بے حضور ' تیری نماز بے سرور .
ایسی نماز سے گزر ' ایسے امام سے گزر
(بالِ جبریل) صفحہ 29

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذّت کہاں حجابِ دلیل
(بالِ جبریل صفحہ 63)

اس شعر میں شاعرِ مشرقؒ نے یورپ میں اپنے زمانۂ تعلیم کی طرف اشارہ کیا ہے جبکہ وہ یہاں اعلیٰ تعلیم کے

حصول کیلئے موجود تھے۔ مغربی فلسفہ انہیں اطمینانِ قلب نہ دے سکا اس لئے وہ اسے "حجابِ دلیل" قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مطالعۂ قرآن اور رومیؒ کی مثنویٔ معنوی نے انہیں حضورِ دل کی لذّت سے آشنا کیا تھا وہ یہاں یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ خدا کے ہمہ وقت حاظر و ناظر ہونے کی کیفیت کی لذّت صرف قرآن کی بدولت مل سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں" اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوب"(آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے) فلسفہ پڑھنے سے یہ حالت پیدا نہیں ہو سکتی۔

دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا
تو بھی نمازی' میں بھی نمازی

(بالِ جبریل صفحہ 71)

اس شعر میں بھی ایک تلخ حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ زبان سے تو نماز کے کلمات ادا کئے جاتے ہیں لیکن دل میں اسلام کی سچی محبت نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ روزانہ نماز پڑھنے کے باوجود ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلام جلوہ گر نہیں۔ نمازوں کے باوجود ہماری معاشی' معاشرتی' سیاسی اور اخلاقی زندگی میں بے شمار برائیاں اور خلافِ اسلام باتیں موجود ہیں۔ صحیح نماز کے بارے میں تو قرآن یہ کہتا ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرْ (بے شک نماز فحش باتوں اور منکرات سے روکتی ہے) اگر نماز پڑھنے کے باوجود ہم غلط کاموں سے نہیں رُکتے تو ہم نے صحیح معنوں میں نماز کا حق ادا نہیں کیا۔ علامہ اقبالؒ نے اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے خدا تعالیٰ سے یہ کہا تھا۔

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے   وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج   یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے

دلے در سینہ دارم بے سرورے   نہ سوزے در کفِ خاکم' نہ نُورے
بگیر از من کہ بر من بارِ دوش است   ثوابِ ایں نمازِ بے حضورے

(میرے سینے کے اندر بے سرور دل ہے۔ میرے جسم میں نہ کوئی سوز ہے اور نہ کوئی نور ہے اے خدا! تو اس بے حضور نماز کا ثواب مجھ سے واپس لے کیونکہ یہ میرے لئے بارِ دوش ہے۔)

(ارمغان حجاز صفحہ 10)

(5) خلوت گزینی

تصوّف و طریقت کے اجزائے ترکیبی کا ایک لازمی جزو خلوت گزینی بھی ہے۔ محض دائمی خلوت گزینی اسلام کے غلبہ و نفاذ کے پروگرام سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ اسلام دنیا کے دیگر مذاہب و ادیان پر غالب آنے کیلئے آیا ہے دینِ اسلام کے غلبہ و قوّت کیلئے جہاد بالسیف کی اہمیت کو قرآنِ حکیم نے

بار بار بیان کیا ہے۔ اگر مجاہدینِ اسلام ہر وقت گوشۂ عزلت میں بیٹھے رہیں اور اسی کو مقصد حیات بنالیں تو پھر جہاد بالسیف (تلوار کے ساتھ جہاد) کا فریضہ کون ادا کرے گا؟ قرآنِ حکیم نے اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات قرار دیا ہے اس لئے اسے خلوت و جلوت دونوں میں جلوہ گر دیکھنا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے سپاہی کو کمروں اور بارکوں میں عسکری تعلیم و تربیت کے پہلوؤں سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ عسکری تعلیم کو پختہ تر بنانے کیلئے اسے روزانہ کھلے میدان میں بندوق چلانے اور دوسری متعلقہ مشقیں کروانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی سپاہی فوجی ٹریننگ اور بارک میں بیٹھنے ہی کو مقصدِ حیات بنالے اور دشمنوں کے مقابلہ کیلئے باہر نہ جائے تو اسے فوج سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ غلبۂ اسلام کیلئے مالی جسمانی، ذہنی، اخلاقی تربیت اور قلبی طہارت کی حیثیت کی حامل ہیں۔ قرآن حکیم غلبۂ اسلام کے اس مقصد کو یوں بیان کرتا ہے۔ "هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ"

(اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اسے دوسرے ادیان پر ظاہر کر دے۔)

علاوہ ازیں قرآن مبین میں مجاہدین کو تمام قاعدین (بیٹھنے والے) پر فوقیت دی گئی ہے جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ (اللہ نے مجاہدوں کو بیٹھنے والوں پر فضیلت دی ہے) قرآن شریف کی اس آیت کی رو سے اسلام کے غلبہ و نفاذ کیلئے مسلسل عملی جہاد کرنے والے ان تمام لوگوں سے افضل ہیں جو کہیں بیٹھے رہتے ہیں۔ اس جہاد کی تیاری کیلئے پہلے اپنے نفسِ امارہ کو مغلوب اور تربیت یافتہ بنانا اشد ضروری ہے۔ تزکیۂ نفس مقصود بالذات نہیں بلکہ یہ مقصدِ جہاد کو حاصل کرنے اور اسلام کو غالب کرنے کا ایک مفید اور مؤثر ذریعہ ہونا چاہیے اس اہم ذریعے کی اہمیت و افادیت کو تسلیم نہ کرنا بھی غلط اندیشی اور تعصبِ کورانہ کی دلیل ہے۔ جس طرح فوجی تربیت و تعلیم کے بغیر کوئی فوج صحیح طور پر اپنے فرائض سرانجام نہیں دے سکتا اسی طرح مذہبی، فکری اور روحانی پاکیزگی اور تربیت کے بغیر شریعتِ اسلامیہ کے احکام، اوامر و نواہی اور غلبۂ اسلام کا فریضہ ادا کرنا ممکن نہیں۔ صوفیائے کرام اس لئے روحانی تطہیر، تزکیۂ نفس اور فکری بالیدگی کیلئے خلوت گزینی اور یکسوئی کو لازمی خیال کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ بھی ان کی ہم نوائی کرتے ہوئے خلوت گزینی کی اہمیت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں ؎

گرچہ داری جانِ روشن چوں کلیمؑ
ہست افکارِ تو بے خلوت عقیم

از کم آمیزی تخیّل زندہ تر
زندہ تر جویندہ تر یابندہ تر

(اگرچہ تو موسیٰؑ کلیم اللہ کی طرح پُرنور روح کا مالک ہے پھر بھی تنہائی کے بغیر تیرے خیالات بانجھ

ہیں۔ لوگوں کے ساتھ کم ملنے کی وجہ سے تخیّل زیادہ زندگی حاصل کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کی جستجو اور کامیابی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔)

(جاوید نامہ صفحہ 70)

علم حاصل کرنے کیلئے زیادہ تر جلوت یعنی باہر کی دنیا کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ کائنات کے مطالعہ و مشاہدہ کیلئے خلوت کدہ سے باہر آنا پڑتا ہے قدرت کے مختلف مظاہر کی تسخیر بھی جلوت کی متقاضی ہے۔ مطالعہ و تحقیق کیلئے صاحبانِ علم کو خارجی دنیا سے زیادہ رابطہ رکھنا پڑتا ہے اس کے برعکس عشق کی راہ پر چلنے والوں کو پہلے خلوت اور باطنی دنیا میں مقیم ہونا پڑتا ہے تاکہ وہ بعدازاں بیرونی دنیا میں انقلاب پیدا کر سکیں۔ علامہ اقبالؒ کی زبان سے علم و شوق کے ان دو مختلف مقامات کا تذکرہ سنئے وہ کہتے ہیں ؎

علم و شوق ہم از مقاماتِ حیات   ہردو می گیرد نصیب از واردات
علم از تحقیق لذّت می بُرد   عشق از تخلیق لذّت می برد
صاحبِ تحقیق را جلوت عزیز   صاحبِ تخلیق را خلوت عزیز
در نگر ہنگامۂ آفاق را   زحمتِ جلوہ مدہ خلّاق را
حفظِ ہر نقش آفریں از خلوت است   خاتمِ اُو را نگیں از خلوت است

(علم اور شوق (عشق) دونوں ہی زندگی کے مراحل ہیں اور وہ دونوں ایزدی تجلّیات سے فیض پاتے ہیں علم کو تحقیق سے لذّت میسّر آتی ہے جبکہ عشق تخلیقی عمل سے لذّت حاصل کرتا ہے۔ تحقیق پسند انسان (عالم) کو جلوت پسند ہوتی ہے لیکن تخلیق پسند انسان (عاشق) کو خلوت عزیز ہوتی ہے تُو دنیا میں خدا کی جلوہ گری کا نظّارہ کر اور خدا کو اپنا ذاتی جلوہ ظاہر کرنے کی زحمت نہ دے۔ ہر خالق کی حفاظت خلوت سے ہے۔ دراصل خلوت اس کی انگوٹھی کیلئے نگینہ کا درجہ رکھتی ہے۔)

(جاوید نامہ صفحہ 70)

بعض صوفیائے کرام غارِ حرا میں نبیؐ اکرمؐ کی خلوت کو اپنی خلوت گزینی کیلئے وجۂ جواز بناتے ہیں۔ رسولِ کریمؐ ہمیشہ غارِ حرا میں خلوت گزیں نہیں رہے بلکہ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جلوت میں گزار کر بنی نوعِ انسان کی زندگیوں میں بے مثال انقلاب بھی تو پیدا کیا تھا۔ علامہ اقبالؒ جلوت کی اہمیّت پر یوں زور دیتے ہیں۔

؎ خلوت و جلوت کمالِ سوز و ساز   ہر دو حالات و مقاماتِ نیاز
گرچہ اندر خلوت و جلوت خدا ست   خلوت آغاز است و جلوت انتہا ست
راہِ حق با کارواں رفتن خوش است   ہمچو جاں اندر جہاں رفتن خوش است

(خلوت اور جلوت دونوں ہی سوز و ساز کا کمال ہیں وہ دونوں نیازمندی کے حالات و مقامات ہیں اگرچہ خلوت و جلوت میں خدا ہوتا ہے لیکن خلوت آغاز ہے اور جلوت انتہا ہے۔

سچائی کے راستے پر کارواں کے ساتھ چلنا بہتر ہے۔ جاں کی مانند دنیا میں جانا ہی ٹھیک ہوتا ہے۔)
(جاویدنامہ صفحہ 51)

(6) درویشی فقر اور قلندری

درویشی، فقر اور قلندری تصوّف و طریقت کی عام مگر بے حد اہم اصطلاحات ہیں۔ علاّمہ اقبالؒ نے اپنی شاعری میں تصوّف کی کافی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ انہوں نے ان ضروری الفاظ کو اپنے اصلی اور اعلیٰ معنوں میں استعمال کر کے ان کی شان و عظمت کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ دورِ غلامی میں آ کر کافی پرانے الفاظ اور اقدار اپنے قدیم معنی کھو دیتے ہیں جب مسلمان سیاسی اور ثقافتی زوال کا شکار ہو گئے تو تصوّف و طریقت میں بھی انحطاط کے اثرات نمایاں ہونے لگے چنانچہ پہلے روشن ضمیر، غیرت مند، بے نیاز اور انقلابی شخص کو درویش سمجھا جاتا تھا مگر اب مفلس اور قلاش آدمی کو درویش کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اسی طرح لفظ "فقر" کو اب غربت اور مسکنت کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے حالانکہ پرانے زمانے میں یہ اپنے اصل معنوں میں "شانِ بے نیازی" اور "استغناء" کہلاتا تھا جیسا کہ رسول کریمؐ نے فرمایا تھا اَلفَقرُ فَخرِی (بے نیازی میرا فخر ہے) اہلِ تصوّف بھی ان اصطلاحات کو اپنے اصل اور اعلیٰ معنوں میں استعمال کرتے ہیں تزکیۂ باطن، ضبطِ نفس اور روحانی تربیت حاصل کر کے مختلف انسان مختلف روحانی مناصب کے حق دار خیال کئے جاتے ہیں اسی طرح درویشی، فقر، فقیری اور قلندری تصوّف کے مقامات اور حالات ہیں۔ آیئے مختصراً یہ دیکھیں کہ علاّمہ اقبالؒ نے ان کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں ؎

آں مسلماناں کہ رہبری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند

(وہ صحیح مسلمان جو سیاسی اقتدار کے مالک رہے ہیں انہوں نے شاہی میں فقیری اختیار کی تھی۔)
(پیامِ مشرق صفحہ 20)

بانشۂ درویشی در ساز و دما دم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن
اے لالۂ صحرائی! تنہا نتوانی سوخت
ایں داغِ جگر تا بے بر سینۂ آدم زن

(تو درویشی کے نشے سے سرشار ہو کر انقلابی بن جا۔ جب تو درویشی میں پختہ ہو جائے تو تختِ جمشید پر قابض ہو جا۔
اے لالۂ صحرائی (سچا مسلمان) اکیلا جلنا درست نہیں۔ تو اپنے جگر کو روشن کرنے والا داغ دوسرے انسانوں کے سینوں میں بھی منتقل کر دے۔) (زبورِ عجم صفحہ 75)

مذکورہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ علاّمہ اقبالؒ تصوّف کو محض ذاتی پاکیزگی اور ذاتی نجات کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے اور نہ ہی وہ اسے کمزوری اور محکومیّت کی علامت خیال کرتے تھے۔ وہ مسلمان حکمران کو عوام کا سچا خادم اور بے لوث لیڈر دیکھنے کے متمنّی تھے کیونکہ ان کی نظر میں حکومت نیابتِ الٰہی کا دوسرا نام ہے۔ رسول کریمؐ نے مسلمان قائدین اور سرداروں کی صحیح قیادت اور سرداری کا معیار عوامُ النّاس کی بے لوث خدمت قرار دیتے ہوئے فرمایا تھا۔ "سَیّدُ الْقَومِ خَادِمُھُم" (قوم کا سردار افرادِ قوم کا خدمت گار ہوا کرتا ہے)

علاّمہ اقبالؒ اس حدیث کا ترجمہ کرتے ہوئے بجا فرماتے ہیں۔ ؏

سروری در دینِ ما خدمت گری است

(پیامِ مشرق صفحہ 20)

سرورِ کائنات اور وجۂ تزئینِ موجودات حضرت محمدؐ جب خود مدینہ منورہ میں دنیا کی سب سے پہلی اسلامی مملکت کے سربراہ تھے تو انھوں نے اپنے قدیم طرزِ زندگی میں کوئی اقتصادی تبدیلی پیدا نہ کی۔ وہ سربراہِ مملکت بن کر بھی پرانی طرز کی سادہ زندگی بسر کرتے رہے۔ علاّمہ اقبالؒ سچے مسلمان سربراہوں میں بھی اتباعِ رسولؐ کا یہی معیار دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ شاہی اور فقیری میں ایک ناگستنی رشتہ پاتے ہیں۔ صحیح مومن کبھی بھی غیر اللہ کی غلامی پر رضامند نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تو نظامِ مصطفیٰؐ کے نفاذ اور غلبہ کا حامی ہوا کرتا ہے۔ ان دو شعروں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خدا پرست اور صالح انسانوں کو سیاسی اقتدار پر قابض ہو کر عوام کی فلاح اور ہدایت کا فریضہ سرانجام دینا چاہئے۔ سیاسی اقتدار بذات خود کوئی بُری چیز نہیں ہے بلکہ اس کا غلط استعمال قابلِ مذمت ہے۔ علاوہ ازیں اگر نیک لوگ سیاسی اقتدار و غلبہ سے دُور رہیں تو پھر غلط کار لوگ ہی ہمارے حکمران ہو جائیں گے۔ تزکیۂ باطن صرف ذاتی نجات کا ذریعہ رہ جائے تو خدا کے دوسرے بندوں کی اصلاح اور نجات کون کرے گا؟

تصوّف کے حامی اسے اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس کا مؤثر ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ وہ علماء کو اہلِ ظواہر کہہ کر ان کی ظاہر پرستی پر باطن پرستی کو ترجیح دیتے ہیں اسی طرح درویشی محض صوف کا لباس پہننے اور سادہ خوراک کھانے کا نام نہیں بلکہ اسلامی نظام کو برپا کرنے کا فریضہ بھی ہے۔ علاوہ ازیں یہ شاہی شان و شوکت سے مرعوب ہونا بھی نہیں۔ اقبالؒ کہتے ہیں ؎

هزار خیبر و صدگونه اژدر است این جا
نه هر که نانِ جوین خورد حیدری داند

بیا به مجلسِ اقبالؒ یک دو ساغر کش
اگرچه سر نتراشد قلندری داند

(اس دنیا میں ہزاروں خیبر اور سینکڑوں قسم کے سانپ ہیں۔ جو کی روٹی کھانے والا ہر شخص حیدریؓ مقام سے واقف نہیں ہوتا تُو اقبال کی مجلس میں آ کر معرفت کے ایک دو جام پی۔ وہ اگرچہ سر نہیں منڈواتا لیکن قلندری کے راز جانتا ہے۔) (پیام مشرق صفحہ 175)

علامہ اقبالؒ خود کو قلندر، درویش اور فقیر کہتے ہیں وہ قلندروں کی چند صفات یوں بیان کرتے ہیں ؎

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و رگِل کوشند
زشاہ باج ستانند و رخرقہ می پوشند
نظامِ تازہ بہ چرخِ دو رنگ می بخشند
ستارہ ہائے کہن را جنازہ بر دوشند

(وہ قلندر جو عالمِ خاکی کو مسخر کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بادشاہوں سے خراج لیتے ہیں لیکن خود گدڑی پہنتے ہیں۔ وہ دو رنگوں والے آسمان کو نیا نظام عطا کرتے اور پرانے ستاروں کا جنازہ اٹھا دیتے ہیں)
(زبورِ عجم صفحہ 121)

(7) ذِکر و فکر

اہلِ تصوّف و طریقت ذکرِ الٰہی کی کثرت کو تزکیۂ نفس اور باطنی پاکیزگی کیلئے ایک مجرّب نسخہ تسلیم کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں ذکرِ الٰہی کو دلی اطمینان کا ایک مؤثر ذریعہ قرار دیا گیا ہے جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے) جب خالقِ فطرتِ انسانی خود اپنی تخلیق سے بخوبی آگاہ ہو کر اپنے ذکر کو قلبی راحت و سکون کی ضمانت قرار دے تو پھر کسے اس صداقت سے انکار ہو سکتا ہے؟ قرآن حکیم کو خدا نے ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْن (تمام جہانوں کیلئے ذکر) کہا ہے اس لحاظ سے یہ بے مثال الہامی کتاب ہمارے جملہ مسائل کا حل اور روحانی امراض کیلئے نسخۂ کیمیا کا درجہ رکھتی ہے۔ خدا کو محض زبان سے یاد کرنا اور عملی طور پر اس کی حاکمیّت کو نہ ماننا حکمتِ قرآنی کے خلاف ہے۔ قرآن محض پڑھی جانے والی کتاب کا نام ہی نہیں بلکہ یہ ہماری زندگی کے تمام شعبہ جات کیلئے راہنمائی بھی مہیا کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر خدا ہمیں مخاطب کر کے یہ نہ فرماتا "اُدْخُلُوْ فِیْ السِّلْمِ کَافَّۃ" (تم اسلام میں مکمل طور پر داخل ہو جاؤ) ذکرِ خدا دل کی بیداری، جذبۂ عشق کی تقویّت، باطن کی تنویر اور اطاعتِ خدا اور رسولؐ کی اساس بنتا ہے اس طرح غور و فکر دماغی ترقی، عقلی ترفع، تسخیرِ کائنات اور حصولِ علم کی بنیاد ثابت ہوتا ہے۔ ذکر و فکر کی حالت میں ہم اپنی زندگی کی رفتار ترقی اور روحانی عروج و زوال کا تنقیدی جائزہ بھی لے سکتے ہیں۔ تصوّف و طریقت میں مراقبہ اور محاسبۂ نفس کو اسی لئے خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ قرآن کے عمیق مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ انفس و آفاق (باطنی دنیا اور خارجی دنیا) دونوں کو قابلِ توجہ اور اہم سمجھتا ہے یہ ہمیں ذکر کے ساتھ غور و فکر کی بھی تلقین کرتا ہے۔ اس لحاظ سے نفس و مادہ، جسم و روح، ظاہر و باطن، دنیا و آخرت، دین و سیاست، فقر و شاہی اور ذکر و فکر ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہیں علامہ اقبالؒ ان دونوں کی اہمیت، افادیّت، ہم آہنگی اور باہمی تکمیل کو جا بجا بیان کرتے ہیں وہ تدبّر، تفکّر اور تعقّل کے بارے میں کہتے ہیں ؎

جستجو را محکم از تدبیر کُن ۔ اَنفس و آفاق را تسخیر کُن
چشمِ خود بکُشاو در اشیاءٔ نگر ۔ نشّہ زیرِ پردۂ صہبا نگر
تُو کہ مقصودِ خطابِ ’اُنظری‘ ۔ پس چرا ایں راہ چوں کوراں روی
ہمرہانت پے بہ منزل بردہ اند ۔ لیلیٰٔ معنی ز محمل بُردہ اند
تو بہ صحرا مثلِ قیس آوارۂ ۔ خستۂ درماندۂ بیچارۂ
(رموزِ بے خودی صفحہ 144 - 143)

(تُو اپنی جستجو کو تدبیر سے مضبوط بنا اور انفس و آفاق کو مسخر کر لے۔
تو اپنی آنکھ کھول کر چیزوں کو دیکھ۔ تُو شراب کے پردے میں چھپے ہوئے نشہ کو دیکھ
تو انظری کے خطاب کا مقصود ہے پھر تو کیوں اندھوں کی طرح یہ راستہ طے کر رہا ہے۔
تیرے ہم سفر تو منزل پر جا چکے ہیں اور انہوں نے محمل سے حقیقت کی لیلیٰ کو نکال لیا ہے لیکن تو ریگستان میں قیس کی طرح آوارہ ’خستہ ‘درماندہ اور بیچارہ ہے۔)

کائنات کے مطالعہ اور تسخیر سے متعلق قرآن کی یہ آیات ذرا مدنظر رکھیئے ” سَخَّرَ لَکُم مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیعًا “ (جو کچھ زمین میں ہے وہ تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا ہے)
” اَلَی اْلاِبلِ کَیفَ خُلِقَتْ وَاِلَی السَّمَاءِ کَیفَ رُفِعَتْ “ (کیا وہ اونٹ کی پیدائش پر غور نہیں کرتے اور یہ نہیں دیکھتے کہ آسمان کو کیسے بلند کیا گیا ہے)

قرآن میں ذکر اور فکر ’عشق اور عقل ‘ جذبہ و تخیّل اور انفس و آفاق کا یہ حسین امتزاج کس قدر دلفریب اور حیات بخش ہے۔

ذکر و فکر سے متعلق علاّمہ اقبالؒ کے مندرجہ ذیل اشعار بھی دلچسپی سے خالی نہیں وہ فرماتے ہیں ؎

گلزارِ ہست و بُود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
(بانگِ درا صفحہ 98)

حجرہ نشینی گزار ‘ گوشۂ صحرا گزیں
بر لبِ جوئے نشیں آبِ رواں را بہ بیں

تُو حجرہ نشینی چھوڑ کر صحرا کا گوشہ اختیار کر۔ تو باہر آ کر ندّی کے کنارے بیٹھ اور بہتے ہوئے پانی کو دیکھ)

(پیامِ مشرق صفحہ 93)

صوفی! بروں زنگنۂ تاریک پا بنہ
فِطرت متاعِ خویش بہ سوداگری کشید

صبح و ستارہ و شفق و ماہ و آفتاب
بے پردہ جلوہ ہا بہ نگاہے تواں خرید

(اے صوفی! تو تاریک کٹیا سے پاؤں باہر رکھ کیونکہ فطرت اپنی متاع کو بیچنے کیلئے پیش کر رہی ہے۔
صبح، ستارہ، شفق، چاند اور سورج کے بے پردہ جلووں کو (مفت میں) خریدا جا سکتا ہے)

(زبورِ عجم صفحہ 134)

علامہ اقبالؒ چونکہ غور و فکر اور تسخیرِ کائنات کو بندۂ مومن کی زندگی کی ایک امتیازی شان تصور کرتے ہیں اس لئے وہ صوفی کو خلوت کدہ سے باہر نکل کر قدرت کے حسین و دلکش مناظر کے مطالعہ و مشاہدہ کی دعوت دیتے ہیں۔ جب وہ اپنے عزلت کدہ سے باہر آ کر مناظرِ فطرت کو دیکھے گا تو وہ لازماً خالقِ کائنات کی اس صنعت گری کے بارے میں بھی غور و فکر کرے گا۔

جاوید نامہ میں علامہ اقبالؒ نے اپنے روحانی مرشد مولانا رومؒ کی صحبت میں عالَمِ بالا کی خیالی سیر کی تھی وہاں پر جہاں دوست، اقبالؒ کی علمیّت کا امتحان لینے کیلئے اس سے یہ سوال کرتا ہے عقل و دل کی موت اور عوام الناس اور عارفین کے تصورِ دین میں فرق کی وجہ کیا ہے۔ اقبالؒ اس کے جواب میں کہتا ہے:

گُفت مرگِ عقل؟ گفتم ترکِ فکر
گفت مرگِ قلب؟ گفتم ترکِ ذکر
گفت دینِ عامیان؟ گفتم شنید
گفت دینِ عارفاں؟ گفتم کہ دید

(جاوید نامہ صفحہ 37)

(اس نے کہا عقل کی موت کیا ہے؟ میں نے کہا کہ ذکر و فکر کو ترک دینا۔ اس نے کہا دل کی موت کیسے ہوتی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ذکرِ خدا کو چھوڑ دینا۔
اس نے کہا کہ عام لوگوں کا دین کیا ہے؟ میں نے کہا سنی ہوئی بات ہے۔ اس نے پوچھا کہ عارفین کا دین کیا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ دید ہے)

(8) زبان و دِل کی رفاقت

اسلام کی تعلیمات کا طرۂ امتیاز توحید ہے۔ عقیدۂ توحید نہ صرف ہمارے اندر خدا تعالیٰ کی یکتائی کا تصور جاگزیں کرتا ہے بلکہ یہ ہمیں بنی نوعِ انساں کی وحدت اور زندگی کی وحدت کا بھی درس دیتا ہے۔ جب اس عظیم و وسیع کائنات کی تخلیق ایک ہی ہستی مطلق کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہے تو پھر مخلوقات کی وحدت میں یقین رکھنا دانش مندی اور خدا کی بندگی کا لازمی تقاضا ہے۔ وحدتِ انسانیت کے بارے میں قرآن کا ارشاد

ہے "كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً" (تمام انسان اُمّتِ واحدہ تھے) سب انسان آدمؑ وحوا کی نسل سے ہیں اس لحاظ سے وہ ایک ہی وسیع خاندان کے مختلف افراد ہیں۔ جب کائنات کا خالق ایک ہے تو اس کا مربّی، رازق اور مالک بھی ایک ہی ہونا چاہئے۔ جب خدائے واحد میں ایمان رکھا جائے تو پھر ایک ہی آقا کی حاکمیّت کو بدل وجان تسلیم کرنا ہوگا۔ عقیدۂ توحید کی بنا پر اُمّتِ مسلمہ کے افراد ایک ہی نظریۂ حیات کے مالک ہونے کی حیثیت سے وحدتِ فکر وعمل کی دولت سے مالامال ہو جاتے ہیں۔ عقیدۂ توحید کے علاوہ ختمِ نبوّت کا عقیدہ بھی اسلامی نظامِ فکر وعمل کا جزو لاینفک ہے۔ توحید کے تصوّر کی بناء پر دین ودنیا، دین و سیاست، مادہ وروح، شریعت وطریقت اور زبان ودل کو ایک ہی حقیقت کے دو ہم آہنگ پہلو قرار دیا جاتا ہے۔ کلمۂ طیبّہ یعنی لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ کیلئے زبانی اقرار کے علاوہ دلی تصدیق بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ ان دونوں کی رفاقت قول اور فعل کی ہم آہنگی کو جنم دینے میں کافی مفید ثابت ہوا کرتی ہے۔ جب دل اور زبان ایک دوسرے کے رفیق نہ ہوں تو اسے منافقت کا نام دیا جاتا ہے۔ جو بات زبان سے ادا کی جائے اس کے مطابق عمل بھی کرنا چاہئے اس لحاظ سے علاّمہ اقبالؒ خیال، قول اور فعل کی وحدت کی اہمیّت اور افادیّت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل؟
بنایا ہے بُتِ پندار کو اپنا خدا تو نے
(بانگِ درا صفحہ 73)

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
(بالِ جبریل صفحہ 34)

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل؟
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
(ضربِ کلیم صفحہ 35)

تصوّف وطریقت میں دل، زبان اور عمل کی پاکیزگی، ہم آہنگی اور مطابقت پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ذکرِ الٰہی مختلف اوراد و اشغال کے ذریعے دل، زبان اور فعل کو احکامِ الٰہی کا مطیع بنایا جاتا ہے۔ خدا کے نیک بندے حق گوئی اور بے باکی کے مسلک پر گامزن ہو کر لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ قرآن قول و فعل کی مطابقت پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (تم وہ کیوں کہتے ہو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے ہو؟) مزید ارشادِ ربانی ہے اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (بے شک اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید کو بھی جاننے والا ہے)

رسول کریمؐ کا فرمان ہے "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ" (بلاشبہ اعمال نیت پر منحصر ہوتے ہیں) اسی طرح قرآن و حدیث میں نیت، قول اور عمل کی اصلاح کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ اقبالؒ اپنے مسلک کو یوں بیان کرتا ہے ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

(9) تسلیم و رضا

تصوّف و طریقت کا ایک اور عنصرِ ترکیبی تسلیم و رضا کا شیوہ ہے۔ یہ شیوۂ تسلیم و رضا کافی حد تک قرآنی تعلیمات اور اسوۂ نبویؐ کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ تسلیم کا مطلب خداتعالیٰ کے احکام کے سامنے بلا چون وچرا سر خم کرنے اور آمنّا و صدّقنا کہنے کا نام ہے۔ جب بندۂ مسلم خداتعالیٰ کو اپنا خالق، مالک، رازق اور آقا مان لیتا ہے اور وہ اپنی تمام خواہشاتِ نفسانیہ اور غلط خیالات کی پیروی کو رد کرتے ہوئے اس کی پناہ میں آتا ہے تو پھر اس کی ذاتی مرضی خدا کی مرضی میں گم ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے نفسِ امارہ کو خوش کرنے کی بجائے خدا کی خوشنودی کا جویا اور شیدا ہو جاتا ہے۔ اسے رضا کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

مرضیٔ اُو در رضائش گُم شود
ایں سخن کے باورِ مردم شود؟

(اس کی مرضی خدا کی مرضی میں گم ہو جاتی ہے۔ اس بات کو لوگ کیسے باور کر سکتے ہیں؟)

تسلیم و رضا کے بارے میں قرآنی ارشاد یہ ہے "اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

(بے شک میری صلوٰۃ، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب جہانوں کے پروردگار کیلئے ہیں)

جب بندۂ مسلم اپنا مال، جان، وقت، آرام اور موت خدا کیلئے وقف کر دے تو پھر اس کی ذاتی مرضی کہاں باقی رہتی ہے؟ علاوہ ازیں خداتعالیٰ ہمارا معبود ہے اور ہم اس کے عباد (بندے) ہیں۔ خدا اور انسان کے درمیان خلق کے علاوہ ایک اور تعلق بھی ہوتا ہے۔ یہ تعلق عابد اور معبود کا ہے۔ عبادت محض پوجا پاٹ کا نام نہیں بلکہ یہ خدا کی ہمہ وقت بندگی، محکومیّت اور اطاعت کا نام ہے۔ ہمارے تمام خیالات، احساسات اور اعمال کا مرکزِ عقیدت اور مرجعِ محبّت صرف خداتعالیٰ ہے۔ کیا غلام کا فریضہ اپنے آقا کی اطاعت اور خوشنودی کا حصول نہیں ہوتا؟ اگر یہ درست ہے تو پھر صحیح مسلمان کیلئے تسلیم و رضا کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں۔ قرآن حکیم ہماری بندگی کے اس فرض پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہے۔ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ" (میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے) اگر عبادت کا مفہوم صرف تسبیح و تہلیل ہے تو کیا فرشتے ہر وقت یہ فریضہ سرانجام نہیں دیتے رہتے؟ انسان کی

عبادت اس کی زندگی کے تمام اہم معاملات میں خدائی احکام کی غیر مشروط اور ہمہ وقت اطاعت کا دوسرا نام ہے۔ انسان کو دردِ دل کی دولت دے کر باہمی محبت و صلح کی تلقین کی گئی ہے ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کرّو بیاں

تسلیم کا قرآنی تصور جدّوجُہد اور سعیٔ پیہم سے گریز کی تعلیم نہیں دیتا۔ قرآن تو یہ کہتا ہے "لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" (انسان کیلئے اس کی کوشش کا ثمرہ ہے) خدا کے احکام کی اطاعت کرنا دراصل سعی و عمل پر مبنی ہے۔ صوفیائے کرام نے قرآنی تعلیمات کے اس اہم پہلو کو بھی اپنے صوفیانہ مسلک کا لازم جزو بنایا۔ علامہ اقبالؒ بھی تسلیم و رضا اور سعی و عمل کے معترف اور مداح ہیں۔

(10) سحر خیزی اور محاسبۂ نفس

قرآنِ حکیم میں انسان کی ظاہری اور باطنی صفائی پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ احادیث میں نظافت کو ایمان کا حصہ قرار دیا گیا ہے قرآن میں ارشادِ ربانی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْن (بے شک اللہ پاکیزہ لوگوں سے محبت کرتا ہے) چونکہ خدا تعالیٰ خود حُسنِ مطلق ہے اس لئے وہ حُسن و جمال کو پسند کرتا ہے۔ حُسنِ خیال حُسنِ نیت اور حُسنِ عمل کو پروان چڑھانے کیلئے صوفیائے عظامؒ نے طرح طرح کے طریقے اختیار کئے ہیں۔ اگرچہ ان کے ذرائع مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ان کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے کہ کس طرح انسان کے اندر اعلیٰ صفات کا جذبہ بیدار کیا جائے۔ رسولِ کریمؐ کو مخاطب کر کے خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

"یَا اَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلاً" (اے مزّمل (رسول کریمؐ)! تورات کو تھوڑی دیر کیلئے اٹھ) شب بیداری اور سحر خیزی کو عاشقانِ رسولؐ اور محبانِ خدا نے بھی اختیار کر کے اپنی اطاعت و محبّت کا عملی ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ شب بیداری اور سحر خیزی صوفیائے کرام، علمائے عظام اور اکابر شعراء کا معمول رہا ہے۔ طبّی، ذہنی اور تعلیمی فوائد کے علاوہ یہ طریقِ زندگی بے شمار روحانی فوائد کا بھی حامل ہے۔ خدا کے چاہنے والے اس وقت اپنے آرام، نیند اور سکون کو چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی کی بارگاہ میں دست بدعا ہوتے ہیں اور روحانی بلندی کے طلب گار بن جاتے ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے سحر خیزی کے بارے میں کیا خوب فرمایا ہے۔

یَغُوصُ الْبَحْرَ مَنْ طَلَبَ اللَّآلِی
وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰی سَهَرَ اللَّیَالِی

(جو موتیوں کا طالب ہوتا ہے وہ سمندر میں غوطہ زن بنتا ہے اور جو بلندی چاہتا ہے وہ راتوں کو بیدار رہتا ہے)

سحر خیزی کا ایک مقصد خدا کی یاد میں مگن رہنا ہے اور دوسرا مقصد اپنی موجودہ رفتارِ زندگی کا متواتر محاسبہ کرنا

اور نفس کی اصلاح کے درپے ہوتا ہے تا کہ خدا کی اطاعت برضا و رغبت کی جائے۔ محاسبۂ نفس کیلئے عموماً مراقبہ اختیار کیا جاتا ہے مشاہیر صوفیاء اور خدا کے برگزیدہ انسانوں کا یہی وطیرہ رہا ہے بقول اقبالؒ ؎

عطارؒ ہو، رومیؒ ہو، رازیؒ ہو، غزالیؒ ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

(بالِ جبریل صفحہ 56)

علامہ اقبالؒ بھی شب بیداری اور سحر خیزی کے نہ صرف زبانی طور پر قائل تھے بلکہ وہ عملاً اس مسلک پر گامزن بھی تھے۔

حد تو یہ ہے کہ وہ جب اعلیٰ تعلیم کیلئے انگلستان میں مقیم تھے اس وقت وہ یہاں کے شدید موسم سرما میں بھی آدابِ سحر خیزی کے پابند تھے جیسا کہ وہ خود بیان کرتے ہیں ؎

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

(بالِ جبریل صفحہ 40)

وہ چونکہ ملّتِ اسلامیہ کے غمخوار مُفکر اور شاعرِ انسانیت تھے اس لئے ان کی دعائے نیم شبی اور گریۂ سحری میں مسلمانوں کا سوز اور غمِ انسان شامل تھے۔ یہاں صرف چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

بہرِ انساں چشمِ من شبہا گریست
تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست

(اسرارِ خودی صفحہ 11)

(انسانوں کیلئے میں راتوں کو آنسو بہاتا رہا یہاں تک کہ میں نے زندگی کے رموز کا پردہ چاک کر دیا)

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز
یہی کچھ ہے ساقی! متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے — لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

(بالِ جبریل صفحہ 125 "ساقی نامہ")

(11) شریعت کی پابندی

اس سے قبل اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ شریعت کی پابندی سے بے نیاز ہو کر تصوّف و طریقت کی کوئی اہمیت اور قدر و قیمت نہیں۔ اسلامی تصوّف کا شریعتِ اسلامیہ اور قرآنی ضوابط کے ساتھ ہمیشہ گہرا تعلق ہوا کرتا ہے۔ عظیم اور قابلِ احترام صوفیاء، علماء اور مشاہیر مسلمانوں نے ہمیشہ قرآن اور اسوۂ نبویؐ کو صحیح مسلمانوں کے خیالات و اعمال کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ اگر کوئی جاہل صوفی اور عارف قرآن و سنت کی اتباع کی ممانعت کرتا ہے تو اس کا عمل اور قول ہمارے لئے حجت نہیں ہو سکتے۔ ہمارے

مرشدِ اعظم اور ہادیٔ کامل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ خود قرآنی تعلیمات پر عمل کر کے دکھایا اور ہمیں بھی قرآن کے تمسک کی تلقین کی ہے۔ اُمُ المومنین حضرت عائشہؓ کا قول ہے کہ رسولِ کریم کی ذاتِ بابرکات مجسمۂ قرآن تھی۔ ان کا یہ قول سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ "کَانَ خُلُقُہٗ الْقُرْآن" (ان کا خلق قرآن تھا) کسی شخص کا عمل اور قول اگر خدا اور رسولؐ کے حکم کے خلاف جاتا ہو تو ہم اس کی تقلید کے مکلف نہیں ہوسکتے۔ پیغمبرؐ خدا کا ارشاد گرامی ہے "لَا طَاعَةَ الْمَخْلُوقِ فِیْ مَعْصِیَۃِ الْخَالِق" (خالق کی حکم عدولی کر کے کسی بھی مخلوق کی اطاعت نہیں ہونی چاہئے) خدا تعالیٰ کا حکم ہے "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُول" (خدا کی اطاعت کرو اور اس کے رسولؐ کی پیروی بھی کرو) اُولِی الْاَمْر کی تابعداری مشروط ہے۔ اگر کوئی مسلمان حکمران یا سربراہِ مملکت خدا اور اس کے پیارے رسولؐ کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اطاعت غلط ہوگی مسلمان کی زندگی کا کوئی شعبہ یا علم بھی شریعتِ محمدیؐ اور شیوۂ مصطفویؐ کی خلاف ورزی کر کے اسلامی اور قرآنی لیبل نہیں لگاسکتا۔ اگر کوئی ایسا کرے تو مسلم عوامُ النّاس اسے قبول کرنے سے انکار کرسکتے ہیں۔ صحابۂ کرامؓ اور علمائے حق کا ہمیشہ یہی مسلک رہا ہے۔

○○○○

علامہ اقبالؒ شریعتِ اسلامیہ کی پابندی سے کسی بھی مسلمان اور کسی بھی شعبۂ حیات کو مستثنیٰ نہیں کرتے۔ ان کی رائے میں ہماری دنیوی اور دینی کامرانیوں اور ترقیوں کا راز شریعتِ محمدیؐ کی پیروی میں مخفی ہے۔ اس ضمن میں، ان کے مندرجہ ذیل اشعار بطور ثبوت پیش کئے جاتے ہیں۔ ان اشعار میں بڑے اختصار کے ساتھ اس موضوع کے متعلقہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے ؎

شکوہ سنجِ سختیٔ آئیں مشو
از حدودِ مصطفیٰؐ بیروں مرو

(تو آئین اسلامی کی سختی کی شکایت نہ کر۔ تو ہرگز رسولِ کریمؐ کی مقرر کردہ حدود سے باہر نہ جا)

(اسرارِ خودی صفحہ 41)

قربِ حق از ہر عمل مقصود دار
تا ز تو گردد جمالش آشکار

(تو اپنے ہر عمل سے خدا کا قرب مقصد بنا تا کہ تیری وجہ سے اس کا جمال ظاہر ہو جائے)

(اسرارِ خودی صفحہ 63)

در شریعت معنیٔ دیگر مجو
غیرِ ضو در باطنِ گوہر مجو

(تو شریعت میں باطنی معانی تلاش مت کر۔ موتی کے باطن میں روشنی کے سوا کچھ اور مت ڈھونڈ)

(رموزِ بے خودی صفحہ 126)

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست ؟
زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست ؟

(رموزِ بے خودی صفحہ 121)

(کیا تو جانتا ہے کہ تیرا دستورِ زندگی کیا ہے؟ دنیا میں تیری تمکنت کا بھید کیا ہے؟)

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

(رموزِ بے خودی صفحہ 165)

(تو قرآن کو چھوڑ کر ذلیل ہو گیا ہے اور اسی لئے تو زمانے کی گردش کا شاکی بن گیا ہے)

(12) صحبتِ مرشد

تصوّف و طریقت میں مرشد' مردِ کامل اور عاملِ شریعت صاحبِ بصیرت کی صحبت اور روحانی تعلیم و تربیت کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ اربابِ تصوف کی رائے میں جس طرح ہر فن میں مہارت نامہ حاصل کرنے کیلئے نظری تعلیم کے علاوہ عملی تربیت اور کسی ماہر فن کی صحبت لازمی خیال کی جاتی ہے اسی طرح باطنی پاکیزگی' تزکیۂ نفس اور روحانی ترقی کیلئے بھی ماہر طریقت کی شاگردی ضروری ہوا کرتی ہے۔ کیا کوئی طالب علم صرف طبّ کی کتابیں پڑھ کر ڈاکٹر اور سرجن بنا دیا جاتا ہے؟ کیا کتابی علم کے علاوہ اس کے لئے ماہر ڈاکٹر اور سرجن کی عملی ٹریننگ لابدی نہیں ہوا کرتی؟ جس طرح جسمانی امراض کیلئے علاج پر زور دیا جاتا ہے اسی طرح روحانی بیماریوں کو دُور کرنے کیلئے بھی قادرِ مطلق نے انتظام کر رکھا ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآنِ حکیم کے بارے میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے "شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ" (دلوں کے امراض کیلئے شفاء) رسولِ کریمؐ کی ظاہری عدم موجودگی میں روحانی امراض کی شفاء کا کام ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو شریعت و طریقت کے رازداں اور خدا اور رسولؐ کے احکام پر عمل پیرا ہیں۔ علاّمہ اقبالؒ کے خیالات اس موضوع پر یوں مزید روشنی ڈالتے ہیں ؎

ہست معشوقے نہاں اندر دِلت
چشم اگر داری بیا بنمائمت

در دلِ مسلم مقامِ مصطفٰی است
آبروئے ما ز نامِ مصطفٰی است

(تیرے دل کے اندر ایک معشوق پوشیدہ ہے۔ اگر تو آنکھ رکھتا ہے تو آ میں تجھے دکھاؤں

مسلمان کے دل میں رسولِ کریمؐ کا مقام ہے۔ ہماری آبروذاتِ محمدؐ کے نام کی وجہ سے ہے)
(اسرارِ خودی صفحہ 18)

کیمیا پیدا کُن از مُشتِ گِلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے
(تو اپنے جسم سے کیمیا پیدا کر اور کسی مردِ کامل کی چوکھٹ پر بوسہ دے)

(اسرارِ خودی صفحہ 18)

دیں نگردد پختہ بے آدابِ عشق
دیں بگیر از صحبتِ اربابِ عشق
(عشق کے آداب کے بغیر دین پختہ نہیں ہوتا اس لئے تو اربابِ عشق کی صحبت سے دین حاصل کر)
(جاوید نامہ صفحہ 112)

پیرِ رومیؒ را رفیقِ راہ ساز
تا خدا بخشد تُرا سوز و گداز
(تو پیر رومیؒ کو اپنے سفر کا ساتھی بنا تاکہ خدا تجھے سوز و گداز عطا کرے)
(جاوید نامہ صفحہ 208)

(13) ضبطِ نفس

اس حقیقت سے انکار کرنا دانشمندی کے اصولوں کو بالائے طاق رکھنا ہے کہ نظم وضبط نہ صرف اجتماعی بلکہ انفرادی زندگی کی خوشگواری کیلئے بھی بہت زیادہ اہمیّت رکھتا ہے۔ نظم وضبط کی پابندی ہی سے نظامِ کائنات خوش اسلوبی کے ساتھ صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ سورج، چاند، ستارے، شجر حجر اور دیگر اشیائے جہاں خاص قدرتی اصولوں اور ضابطوں کی پابند ہیں۔ جس طرح خارجی کائنات قدرت کے مقررہ قوانین کے مطابق رواں دواں ہے اسی طرح انفس کی دنیا بھی اپنے قیام وبقاء کیلئے خاص ضابطوں کی پابندی پر مجبور ہے۔ چونکہ کائنات کی خارجی تبدیلیاں اور گوناگوں مظاہر انسانی شعور اور باطن کے آئینہ دار ہیں اس لئے باطن کی دنیا کو نظم وضبط کی زیادہ ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ماہرینِ نفسیات، اخلاقیات کے علمبردار اور مذہبی اقدار کے پرستار انسان کی زندگی کے ظاہری پہلوؤں کی نسبت اس کے باطنی پہلوؤں کو زیادہ اہم اور دیرپا خیال کیا کرتے ہیں۔ اہلِ تصوّف وطریقت بھی نفسِ انسانی کی اس اہمیت کو پیشِ نظر رکھ کر اس کی

اصلاح، پاکیزگی اور ترقی کے شدید خواہشمند ہیں۔

اسلام نفس کو مکمل طور پر کچلنے اور برباد کرنے کی بجائے اس کی غلط طاقتوں کی اصلاح کر کے اسے صراطِ مستقیم کی جانب رواں کر دیتا ہے۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب خصوصاً ہندو مت، بدھ دھرم اور عیسائیت انسانی نفس کے بعض جائز تقاضوں کی تکمیل کو بھی نظرانداز کر دیتے ہیں عموماً مختلف ریاضتوں اور جسمانی اذیتوں کے ذریعے روحانی نجات کا راستہ تلاش کیا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم غلط قسم کی نفس کشی کی

اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی یہ نفی ذات کو مقصدِ حیات قرار دیتا ہے قرآنِ حکیم نے نفس کی تین حالتوں (نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ، اور نفسِ مطمئنہ) میں [illegible] الی اللہ کا حقدار قرار دیا ہے، وہ کہتا ہے

"قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا" (اس نے یقیناً فلاح پائی جس نے نفس کا تزکیہ کیا) قرآنی تعلیم کی پیروی کرتے ہوئے اسلامی تصوف تزکیۂ نفس کی طرف خاص توجہ دیتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اسی نظریئے کی حمایت میں مندرجہ ذیل اشعار کہے ہیں وہ فرماتے ہیں ؎

نفسِ تو مثلِ شتر خود پرور است — خود پرست و خود سوار و خود سر است
مرد شو آور زمامِ او بکف — تا شوی گوہر اگر باشی خزف
ہر کہ برخود نیست فرمانش رواں — می شود فرماں پذیر از دیگراں

(اسرارِ خودی صفحہ 42)

(تیرا نفس اونٹ کی طرح خود پرور، خود پرست، خود سوار اور خود سر ہے۔
تو بہادر انسان بن کر اس کی لگام کو اپنے ہاتھ میں پکڑ تاکہ تو ٹھیکری سے موتی بن سکے۔
جو آدمی اپنی ذات کو تابعِ فرمان نہیں بناتا وہ دوسروں کا مطیع ہو جاتا ہے)

حفظِ جاں ہا ذکر و فکرِ بے حساب
حفظِ تن ہا ضبطِ نفس اندر شباب
حاکمی در عالمِ بالا و پست
جز بہ حفظِ جان و تن ناید بدست

(جاوید نامہ صفحہ 204)

(ارواح کی حفاظت بے حساب ذکر و فکر ہے لیکن اجسام کی حفاظت جوانی میں اپنے نفس پر قابو پانا ہے۔
عالمِ بالا و پست کی حکومت روح اور جسم کی حفاظت کے بغیر ہاتھ نہیں آیا کرتی)

ضبطِ نفس علّامہ اقبالؒ کے فلسفۂ خودی کا ایک لازمی عنصر ہے۔ وہ اسے نیست و نابود کرنے کی بجائے اسے مسلمان بنانے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

(بہتر تو یہ ہے کہ تو نفس کو مسلمان کرلے اور اسے قرآن کی تلوار سے ہلاک کرے)

فقر (14)

علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں جا بجا اسلامی تعلیمات، قرآنی حقائق اور اسلام پرست بزرگوں کی زندگی کے اعلیٰ اصولوں اور روحانی عفت کے عناصرِ ترکیبی کا بڑے والہانہ اور مفکرانہ انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ وہ ہر اس طریقِ زندگی کے مدّاح اور ترجمان نظر آتے ہیں جو انسانیت کی فلاح و بہبود اور اعلیٰ اخلاقی اقدار پر مبنی ہو۔ وہ تصوّف، طریقت اور معرفت کے اصولوں کا بھی اسی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیتے ہیں۔ لفظ فقر کو انہوں نے دیگر صوفیانہ اصطلاحات کی طرح اپنے قدیم اصل اور اسلامی معنوں میں استعمال کر کے ہمیں اس کی خوبیوں اور معیار کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا ہے۔ اس سے قبل "درویشی اور قلندری" کے عنوان سے فقر کا بھی ذکر آ گیا تھا۔ یہاں فقر سے متعلق مفکرِ اسلام اور شاعرِ مشرق علامہ اقبال مرحوم و مغفور کے چند مزید اشعار بطور حوالہ پیش کیے جاتے ہیں۔ انہیں فقر و درویشی سے اس قدر پیار ہے کہ وہ اسے اسلاف کے کردار کا ایک نمایاں پہلو تصوّر کرتے ہوئے اپنے آپ کو فقیر، درویش اور قلندر کہلانے پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اپنے فلسفہ دان اور عقل پرست ہونے پر اس قدر نازاں نہیں جس قدر کہ وہ فقر، درویشی اور قلندری کو اپنی ذات کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اگرچہ زیبِ سرش افسر کلاہے نیست
گدائے کوئے تو کم تر ز پادشاہے نیست

بیا کہ دامنِ اقبالؔ را بدست آریم
کہ او ز خرقہ فروشانِ خانقاہے نیست

(پیامِ مشرق صفحہ 162)

(اگرچہ اس کے سر پر تاج اور ٹوپی نہیں اس کے باوجود تیرے کوچے کا گدا کسی بادشاہ سے کم نہیں ہے۔ آؤ ہم اقبال کے دامن کو پکڑ لیں کیونکہ وہ کسی خانقاہ کے گدڑی فروشوں میں سے نہیں)

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے؟ — خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے؟
اسی خطا سے عتابِ ملوک ہے مجھ پر — کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے
خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری — وگرنہ شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے

(بانگِ درا صفحہ 47، 48)

فقر کی مختلف صفات کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے جو کچھ کہا ہے ان کی چند جھلکیاں ہدیۂ ناظرین ہیں، وہ کہتے ہیں ؎

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

(بانگِ درا صفحہ 270)

آں فقر کہ بے تیغے صد کشورِ دل گیرد
از شوکتِ دارا بہ، از فرِّ فریدوں بہ
(زبورِ عجم صفحہ 23)

(وہ فقر جو تلوار کے بغیر دلوں کے سینکڑوں ملکوں کو فتح کر لے وہ دارا بادشاہ کی شوکت اور فریدوں بادشاہ کی شان سے بہتر ہے)

چوں بہ کمال می رسد، فقر دلیل خسروی است
مسندِ کیقباد را در تہِ بوریا نگر
(زبورِ عجم صفحہ 115)

(جب فقر کمال تک پہنچ جاتا ہے تو وہ بادشاہی کی دلیل بن جاتا ہے اس لئے تو کیقباد بادشاہ کی مسند کو بوریئے کے نیچے دیکھ)

دبدبۂ قلندری طنطنۂ سکندری
آں ہمہ جذبۂ کلیمؑ ایں ہمہ سحرِ سامری
آں بہ نگاہ می کُشد ایں بہ سپاہ می کُشد
آں ہمہ صلح و آشتی ایں ہمہ جنگ و داوری

ہر دو جہاں کُشا ستند، ہر دو دوام خواستند
ایں بہ دلیلِ قاہری آں بہ دلیلِ دلبری

(جاوید نامہ صفحہ 28)

(قلندری دبدبہ اور سکندرانہ جلال۔ ایک تو سراپا جذبۂ کلیمؑ ہے اور دوسرا کلیتہً سامری کا جادو۔ قلندری نگاہ کے ساتھ اور سکندری فوج کے ذریعے زیر کرتی ہیں۔ قلندری صلح و آشتی ہے اور سکندری جنگ اور اقتدار۔
یہ دونوں جہاں کشائی اور دوام کی طالب ہیں۔ بادشاہی جبر کی دلیل ہے اور قلندری دلبرانہ کردار کی حامل ہے)

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بُوئے اسدُ اللّٰہی
آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

(بالِ جبریل صفحہ 57)

(15) یقین و عمل

کیا یہ نفسیاتی حقیقت نہیں کہ جب تک کسی چیز کی صداقت کا ہمیں صحیح علم نہ ہو اسوقت تک ہم کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے؟ عمل کی جانب قدم بڑھانے سے پہلے ہمارے لئے یہ اشد ضروری ہوتا ہے کہ ہم ذہنی طور پر ایسا کرنے کیلئے تیار ہوں۔ محض ظن و تخمین کے سہارے کاروانِ زندگی کو جانبِ منزل رواں دواں نہیں کیا جا سکتا صرف فلسفیانہ دلائل اور عقلی موشگافیاں شدیدِ عمل کیلئے مہمیز کا کام نہیں دیا کرتیں۔ اس کے برعکس وحی والہام پر مبنی حقائق کی صداقت میں محکم یقین ہمیں سعی و عمل کیلئے اُبھارتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے ایمان و یقین اور عمل کے درمیان گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ اسلامی تصوّف و طریقت چونکہ اسلامی تعلیمات کا ایک ثمرہ ہیں اس لئے وہ بھی یقین و عمل کی اہمیت وافادیت کو نظرانداز نہیں کرتے۔ درحقیقت اسلامی تصوّف تو سراسر سعی و عمل کی ترغیب دے کر ہمارے دل و دماغ میں نیک خیالات اور صالح جذبات کو جنم دیتا ہے۔ علامّہ اقبالؒ بھی یقین و عمل اور تصوّف و طریقت کے باہمی تعلق کے پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ
تا جزائے عملِ تُست جناں چیزے ہست

(وہ بہشت جو خدا تجھے ویسے ہی بخش دے کچھ نہیں جب تک کہ جنّت تیرے عمل کی جزا نہ ہو)
(جاوید نامہ صفحہ 47)

اک شرعِ مسلمانی، اک جذبِ مسلمانی
ہے جذبِ مسلمانی، سِرّ فلک الا فلاک

اے رہروِ فرزانہ! بے جذبِ مسلمانی
نے راہِ عمل پیدا، نے شاخِ یقیں نمناک
(بالِ جبریل صفحہ 41)

یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری
(بالِ جبریل صفحہ 59)

یا سنجر و طُغرل کا آئینِ جہانگیری
یا مردِ قلندر کے اندازِ ملوکانہ

یا حیرتِ فارابی یا تاب و تبِ رومی
یا فکرِ حکیمانہ یا جذبِ کلیمانہ

میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی ہو
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ
(بالِ جبریل صفحہ 68)

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن
نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن
ہر کہ اندر دستِ اُو شمشیرِ لاست
جملہ موجودات را فرماں رواست

(اے کہ تو حجروں کے اندر باتیں بنارہا ہے تو کسی نمرود کے سامنے "لا" کانعرہ بلند کر جس کے ہاتھ میں لا کی تلوار ہے وہ تمام مخلوقات پر اپنا حکم چلانے والا ہے)

(پس چہ باید کرد اے اقوام شرق صفحہ 19)

مندرجہ بالا اشعار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یقین و عمل بھی تصوّف وطریقت کے عناصرِ ترکیبی میں سے ہیں یقین اور عمل کے بغیر نہ تو دنیاوی امور سرانجام دیئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی دینی امور۔ دینی امور کی تکمیل کیلئے تصوّف ہمیں آمادۂ عمل بناتا ہے۔

حصہ دوم

تصوّف کی اہمیّت وافادیّت

تصوّف کی اہمیّت وافادیّت سے متعلق علامہ اقبالؒ کے افکار ونظریات کی مندرجہ ذیل تلخیص قابل غور ہے۔ وہ رقم طراز ہیں

(1) "ہمہ اُوست مذہبی مسئلہ نہیں یہ فلسفہ کا مسئلہ ہے۔ وحدت اور کثرت کی بحث سے اسلام کا کوئی سروکار نہیں اسلام کی روح توحید ہے اور اس کی ضد کثرت نہیں بلکہ شرک ہے...... ... خالص اسلامی تصوّف یہ ہے کہ احکامِ الٰہی انسان کی اپنی ذات کے احکام بن جائیں"

یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

(ملفوظات صفحہ 162 ڈاکٹر سعید اللہ کی روایت مورخہ 21 نومبر 1937ء)

(2) "اسلام کو دینِ فطرت کے طور پر realize کرنے کا نام تصوّف ہے اور ایک اخلاص مند مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس کیفیت کو اپنے اندر پیدا کرے"

(انوارِ اقبال صفحہ 47، خط بنام سیّد نذیر نیازی مؤرخہ اکتوبر 1935ء)

(3) "حقیقی تصوّف کا میں کیونکر مخالف ہو سکتا ہوں کہ خود سلسلۂ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں نے

تصوّف کرآت سے دیکھا ہے۔ بعض لوگوں نے ضرور غیر اسلامی عناصر اس میں داخل کر دیئے ہیں جو شخص غیر اسلامی عناصر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے وہ تصوّف کا خیر خواہ ہے نہ کہ مخالف۔ انھی غیر اسلامی عناصر کی وجہ سے مغربی محققین نے تمام تصوّف کو غیر اسلامی قرار دے دیا ہے اور یہ حملہ انہوں نے حقیقت میں مذہب اسلام پر کیا ہے"

(انوارِ اقبال صفحہ 181 'خط بنام شاہ سلیمان پھلواری مورخہ 9 مارچ 1916ء)

(4) "غلام قومیں مادّیات کو روحانیّت پر مقدم سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں اور جب ان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتی ہیں جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو"

(انوارِ اقبال صفحہ 217 'ظفر احمد صدیقی کے نام خط مورخہ 12 دسمبر 1936ء)

(5) تصوّف سے اگر اخلاص فی العمل مراد لی جائے (اور یہی مفہوم قرونِ اولیٰ میں اس کا لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا ہاں جب تصوّف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے"

(شرحِ اسرارِ خودی صفحہ 70 مولانا اسلم جیراج پوری کے نام خط مورخہ 17 مئی 1919ء)

(6) "تصوف لکھنے پڑھنے کی چیز نہیں، کرنے کی چیز ہے"

(مکتوباتِ اقبال صفحہ 10 سیّد نذیر نیازی کے نام خط مورخہ 4 جون 1929ء)

تصوّف کے ضروری موضوعات

علاّمہ اقبالؒ نے اپنے نظریۂ تصوّف میں جن اہم موضوعات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا خلاصہ یہاں ان کے اپنے ہی الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے وہ فرماتے ہیں۔

(1) ”اس کے بعد میں نے عرض کیا معرفتِ الٰہی سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا سید الطائفہ جنید بغدادی کے نزدیک معرفت یا عرفان کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب یا متعلق نہیں کرنا چاہئے کیونکہ قرآنِ عزیز میں اس کا استعمال نہیں کیا گیا البتہ علم و ایمان کا ذکر بار بار آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ تو عارف ہے نہ معروف ہاں ”عالم و علیم“ ہے اور معلوم ہے جس پر بہت سی آیتیں شاہد ہیں“

(ملفوظات صفحہ 56 محمد حسین عرشی کی روایت)

(2) ”خدا کی رحمت ہو سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ پر کہ انہوں نے اس رہبانیت کی جڑ یعنی امتیازِ علم و معرفت کے پیدا ہوتے ہی اس کے خطرناک نتائج کا احساس کر کے اس کی مخالفت کی“

(انوارِ اقبال صفحہ 270)

(3) ”اس کے بعد لفظِ علم پر گفتگو ہوئی فرمایا ”علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہمارے اکتسابی معلومات کا ذخیرہ.......... پس ایسے علم کو علمِ الٰہی سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرا وہ علم ہے جو خواص کو عطا ہوتا ہے وہ بے منّتِ کسب قلب و روح کے اعمال سے اُبلتا ہے“ میں نے عرض کیا اس علم کی کلید کیا ہے؟ فرمایا ارشاد خداوندی ہے قد افلح من زکھا جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا اس پر علم کے دروازے

کھول دیئے جاتے ہیں میں نے کہا تزکیۂ نفس کا طریق کیا ہے؟ اس پر آپ نے صوفیاؒ کے بعض مشاغل کی طرف اشارہ کر دیا۔"

(ملفوظات، صفحہ 57 روایت محمد حسین عرشیؒ)

(4) "16 جنوری 1938ء 3 بجے بعد دوپہر بمقام جاوید منزل قریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک ملاقات رہی۔ دورانِ کلام میں آپ نے فرمایا علم کے چار ذریعے ہیں اور قرآن مجید نے ان چاروں کی طرف واضح رہنمائی کی ہے........ علم کا تیسرا ذریعہ علم النفس ہے جس کا آغاز وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ سے ہوتا ہے۔ اس کو حضرت جنیدؒ اور ان کے رفقاء و اتباع نے کمال تک پہنچایا۔ آخری ذریعہ صحیفۂ فطرت ہے جس پر قرآن مجید کی بے شمار آیات دلالت کر رہی ہیں مثلاً اِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ

(ملفوظات صفحہ 63 محمد حسین عرشیؒ سے ملاقات 16ر جنوری 1938ء)

(5) "پھر میں نے پوچھا مولانا روم کے شعر ذیل کی شرح کیا ہے؟

دفترِ صوفی کتاب و حرف نیست
جز دلِ اسپید ہمچو برف نیست

... مجھے اس کا ترجمہ کر کے سمجھا دیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ عالِم قلم پر چلتا ہے اور صوفی قدم پر پھر رومیؒ کا یہ شعر پڑھا

زادِ دانشمند آثارِ قلم
زادِ صوفی چیست انوارِ قدم

یہ شعر پڑھ کر بہت روئے اس کے بعد پھر رومیؒ کا ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ صوفی ہرن کے قدموں کے نشان سے اس کا سراغ لگاتا ہے........ پھر فرمایا قلم کی راہ چلنے والا بھی آخر پہنچ ہی جاتا ہے بلکہ محفوظ طریق سے"

"The God-intoxicated sufi who stands aloof from the Theological controversies of the age, saves and spiritualises both
the aspects of existence, and looks upon the whole Universe as the self-revelation of God - a higher notion which synthesises the opposite extremes of his predecessers.

(The Development of Metaphysics In Persia) (P 62)

ترجمہ:

"خدامست صوفی جو اپنے زمانے کے مذہبی مناظروں سے الگ تھلگ رہتا ہے وہ زندگی کے پہلوؤں کی حفاظت کرتا ہے اور انہیں روحانی رنگ میں بھی پیش کرتا ہے۔ اس طرح وہ تمام کائنات کو خدا کا انکشافِ

ذات خیال کرتا ہے۔ یہ صوفیانہ تصوّر ایک ایسا عظیم تر نظریہ ہے جو صوفی کے پیش رووں کی مخالف انتہاؤں کو آپس میں ملا دیتا ہے"

(ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء صفحہ 62)

The Semitic formula of salvation can be briefly stated in the words, "Transform your will - which signifies that the Semitic looks upon will as the essence of human nature. the Indian Vedanntist, on the other hand, teaches that all pain is due to our mistaken attitude towards the Universe. He, therefore, Commands us to our understanding - implying thereby that the nature of man in thought, not activity or will. But the Sufi holds that the nature of man consists in thought, not activity or will. But the Sufi holds that the mere transformation of will or understanding will not bring peace, we should bring about the transformation of both by a complete transformation of feeling, of which will and understanding are only specialised forms, His message to the dividual is - "Love all, and forget your own individuality in doing good the other. ---" Semitic religion is a code of strict rules of conduct: the Indian Vedanta, on the other hand, is a cold system of thought. Sufism avoids their in complete psychology, and attempts to synthesise both the Semitic
and the Aryan formulas in the higher category of Vone. --- The secret of the vitality of sufism is the complete view of human nature upon which it is based. it has survived orthodox perspectives and political resolutions, because it appeals to human
nature in its entirety."
(The Development of Metophysics in Persia) (P. 82 - 83)

ترجمہ:

"نجات کا سامی فارمولا "اپنے ارادے کو بدل ڈالو" کے الفاظ میں مختصر طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ سامی 'ارادے کو انسانی فطرت کا لب لباب خیال کرتا ہے۔ اس کے علی الرغم انڈین ویدانت کا پرستار یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہماری تمام تکلیف کائنات کے بارے میں ہمارے غلط رویئے کی بناء پر جنم لیتی ہے۔ اس لئے وہ ہمیں اپنے ادراک کو بدلنے کا حکم دیتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی رائے میں انسان کی اصلی فطرت فعل اور ارادے کی بجائے خیال پر مشتمل ہوتی ہے لیکن صوفی کی رائے میں ارادے اور ادراک کی محض تبدیلی سکون نہیں دے گی۔ چنانچہ ہمیں احساس کی مکمل تبدیلی کے ذریعے ارادے اور ادراک کی کایا پلٹ دینی چاہئے یہ یاد رہے کہ ارادہ اور ادراک تو احساس اور جذبے کی خاص شکلیں ہیں۔ فرد کیلئے صوفی کا پیغام یہ ہے "سب سے محبت کرو اور دوسروں کے ساتھ نیکی کرتے

ہوئے اپنی انفرادیت کو بھول جاؤ......"

سامی مذہب' کردار کے سخت ضوابط کا مجموعہ ہے۔ اس کے برعکس انڈین ویدانت خیال کا ایک سرد نظام ہے۔ صوفی ان دونوں کی ناتمام نفسیات سے اپنا دامن بچاتا ہوا سامی اور آرین فارمولوں کو عشق و محبت کے عظیم تر درجے کے ذریعے آپس میں ملا دیتا ہے.......... تصوّف کی قوت کا راز انسانی فطرت پر مبنی کامل تصور میں پایا جاتا ہے۔ چونکہ یہ اپنی کاملیت کے سبب انسانی فطرت کو متاثر کرتا ہے اس لئے یہ راسخ العقیدہ لوگوں کے مظالم اور سیاسی انقلابات کے باوجود زندہ رہا ہے"

(ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء صفحہ 83 - 82)

(8) "میں نے پوچھا قبلہ! اس میں کیا مصلحت ہے کہ انسان مختار بھی ہے اور مجبور بھی' کیوں نہ ہمیں بالکل مجبور یا مختار بنایا گیا؟ مسکرا کر فرمانے لگے۔ اس کی مصلحت سے تو وہی واقف ہے جس نے انسان کو پیدا کیا البتہ انسانی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ آدمی اپنی مجبوریوں پر غالب آتا ہے"

(ملفوظات صفحہ 241 سید الطاف حسین)

(9) "ہم نے آپ سے دریافت کیا کہ فوق البشر کی کیا تعریف ہے؟ کہنے لگے' ہر صحیح مومن فوق البشر ہے اور اسلام وہ بہترین سانچہ ہے جس میں فوق البشر ڈھلتے ہیں........ کہنے لگے' ہیرو کی تعریف یہ ہے کہ وہ انسان جس کے اعمال و افعال نوع انسانی کیلئے چشمہ ہائے زندگی جاری کرنے والے ہوں۔ شخصیت پرستی (Hero Worship) ہندو قوم کی امتیازی صفت ہے مگر اسلام اس کے خلاف ہے"

(ملفوظات صفحہ 249 - 248 سید الطاف حسین)

"The powerful man creates environment. the feeble have to adjust themselves to it."

Stray Thoughts 28th July 1917

ترجمہ:

"طاقتور انسان ماحول کی تخلیق کرتا ہے مگر کمزور انسان اپنے آپ کو اس ماحول کے مطابق بدلنے پر مجبور ہوتے ہیں"

(افکارِ پریشان 28 جولائی 1917ء)

". . perfect man, who shares in both the divine and the human attributes The Perfect man, then, is the joining link. On the one hand he receives illumination from all the Eternal names, on the other hand all divine attributes reapper in him."

(The Development of Metaphsics, In Persia) (P. 131)

ترجمہ:

"انسان کامل جس میں ایزدی اور انسانی صفات کا اشتراک پایا جاتا ہے۔ ...... تب ایسا کامل انسان ملانے والی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک طرف تو وہ تمام ازلی اسماء سے تجلی حاصل کرتا ہے اور دوسری طرف اس میں تمام ایزدی صفات دوبارہ ظہور پذیر ہوتی ہیں"

(ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء صفحہ 131)

(12) "فقر کی بابت پوچھا تو فرمایا فقر سے میری مراد افلاس اور تنگدستی نہیں بلکہ استغناء، دولت سے لاپروائی ہے دولت جوہر مردانگی کی موت ہے اس سے جرأت اور بہادری جاتی رہتی ہے۔

میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

(ملفوظات صفحہ 313 عبدالرشید طارق سے ملاقات)

(13) "نبیٔ آخر الزمان کی غلامی، غلامی نہیں بلکہ آزادی ہے کیونکہ اس کی نبوت کے احکام دینِ فطرت ہیں یعنی فطرت صحیحہ ان کو خود بخود قبول کرتی ہے"

(انوارِ اقبال صفحہ 46، سید نذیر نیازی کے نام خط اکتوبر 1935ء)

(14) "دینِ اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدہ کی رو سے ہر شے پر مقدم ہے، نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کیلئے حدود معیّن کرتا ہے۔ ان حدود کے متعیّن کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے۔ .... حدودِ خودی کے تعیّن کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔ جب احکامِ الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیّت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے بعض نے اس کا نام بقا رکھا ہے لیکن ہندی اور ایرانی صوفیاء میں سے اکثر نے مسئلۂ فنا کی تفسیر فلسفۂ ویدانت اور بدھ مت کے زیرِ اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اس تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں"

(انوارِ اقبال، ظفر احمد صدیقی کے نام خط 12 دسمبر 1936ء)

(15) "فرمایا "قوم کی تشکیل و تعمیر کیلئے اسلام کے پانچ ارکان یعنی شہادت، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کا اجراء و انضباط کافی ہے اس کی محسوس اور عملی صورت عہدِ سعادت سے بہتر کہیں نظر نہیں آتی ہے۔ ..... طاقت کے بغیر امر و نہی کیسے ہو سکتے ہیں"

(ذکرِ اقبال، از مولانا عبدالمجید سالک)

(16) "کوئی فعل مسلمانوں کا ایسا نہیں ہونا چاہیے جس کا مقصد اعلائے کلمتہ اللہ کے سوا کچھ اور ہو"
(فیضانِ اقبال صفحہ 292 اکبر الہ آبادی کے نام خط 25 اکتوبر
1915ء)

(17) "تصوّف کی تحریک غیر اسلامی عناصر سے خالی نہیں اور میں اگر مخالف ہوں تو صرف ایک گروہ کا جس نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر بیعت لے کر دانستہ یا نادانستہ ایسے مسائل کی تعلیم دی ہے جو مذہبِ اسلام سے تعلق نہیں رکھتے ہیں"

(مضمون اسرارِ خودی اور تصوّف 'مطبوعہ رسالہ وکیل (امرتسر) 15 جنوری 1915ء)

(18) "رہبانیت عیسائی مذہب کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہر قوم میں پیدا ہوئی ہے اور ہر جگہ اس نے قانون اور شریعت کا مقابلہ کیا ہے اور اس کے اثر کو کم کرنا چاہا ہے۔ اسلام در حقیقت اسی رہبانیت کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے"

(خواجہ حسن نظامی کے نام خط 30 دسمبر 1915ء)

"The fact, however, that religious experience is in communicable does not mean that the religious man,s pursuit is futile. Indeed, the incommunicability of religious experience gives us a clue to the ultimate nature of the ego."

The Reconstruction of Religious thought in Islam P. 183

ترجمہ:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی تجربات و مشاہدات ناقابلِ بیان ہوتے ہیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مذہبی آدمی کی یہ تلاش بے فائدہ ہے۔ در حقیقت مذہبی واردات کی اس صفت کی بدولت ہم خودی کی ماہیت کا سراغ لگاتے ہیں"

(اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل نو صفحہ 183)

"From a study of the Islamic religion it would become clear that it is a rationalistic religion and as shown by our Prophet Mohammad its formulae could be practised in everyday life."

(Allama Iqbal, speech on "The Philosophy of Islam" in Madras. 5th January, 1929 .)

ترجمہ:

"دینِ اسلام کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ ایک عقل پرستانہ مذہب ہے۔ جیسا کہ حضرت محمدؐ نے ثابت کیا ہے 'اس کے اصولوں کو روز مرّہ کی زندگی میں عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے"

(مدراس میں فلسفۂ اسلام کے بارے میں علامہ اقبالؒ کی تقریر '5 جنوری 1929ء)

(21) "علوم کے مواخذ انسان کے حواس اندرونی اور بیرونی ہیں۔ عقل ان حواسِ ظاہری و معنوی کے انکشافات کی تنقید کرتی ہے اور یہی تنقید اس کا حقیقی function ہے اور بس......... وحی کا function حقائق کا انکشاف ہے یا یوں کہئے کہ وحی تھوڑے وقت میں ایسے حقائق کا انکشاف کر دیتی ہے جس کو مشاہدہ برسوں میں بھی نہیں کر سکتا.......... میرے عقیدے کی رو سے بعدِ وحیٔ محمدیؐ کے الہام کی حیثیت محض ثانوی ہے.......... بالفاظِ دیگر بعدِ وحیٔ محمدیؐ الہام ایک پرائیویٹ fact ہے اس کا کوئی سوشل مفہوم یا وقعت نہیں ہے"

(انوارِ اقبال صفحہ 48 - 47)

(22) "خداشناسی کا ذریعہ خرد نہیں، عشق ہے" جسے فلسفے کی اصطلاح میں وجدان کہتے ہیں"

(روز گارِ فقیر جلد اول صفحہ 185)

(23) "تصوّف کے ادبیات کا وہ حصہ جو اخلاق و عمل سے تعلق رکھتا ہے، نہایت قابلِ قدر ہے کیونکہ اس کے پڑھنے سے طبیعت پر سوز و گداز کی حالت طاری ہوتی ہے۔ فلسفہ کا حصہ محض بیکار ہے اور بعض صورتوں میں میرے خیال میں تعلیمِ قرآن کے مخالف" (مکاتیبِ اقبال صفحہ 2)

(24) "حضراتِ صوفیاً خود کہتے ہیں کہ شریعت ظاہر ہے اور تصوّف باطن، لیکن اس پُر آشوب زمانے میں وہ ظاہر جس کا باطن تصوّف ہے، معرضِ خطر میں ہے۔ اگر ظاہر قائم نہ رہا تو اس کا باطن کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟" (مکاتیبِ اقبال صفحہ 2)

(25) "کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل میں باطنی معانی تلاش کرنے یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے (جیسا کہ قرامطہ کے طرزِ عمل سے ثابت ہے) یہ ایک نہایت عیّارانہ طریقہ ہے تنسیخ کا"

(سراج الدین پال کے نام خط مورخہ 10 جولائی 1916ء)

(26) "جو فعل خودی کو مستحکم کرے وہ حسین ہے اور جو خودی کو ضعیف بنائے وہ قبیح ہے"

(روز گارِ فقیر جلد اوّل صفحہ 182)

(27) "میں اس خودی کا حامی ہوں جو سچّی بے خودی سے پیدا ہوتی ہے یعنی جو نتیجہ ہے ہجرت الی الحق کا اور جو باطل کے مقابلہ میں پہاڑ کی طرح مضبوط ہے"

(اکبر الہ آبادی کے نام خط مورخہ 25 اکتوبر 1918ء)

"My ideal of human personality i.e. infinite personality - is nowhere better expressed than in a Persian verse which an old Persian poet wrote on the Prophet:

موسیٰ زہوش رفت بیک جلوۂ صفات   تو عینِ ذات می نگری در تبسمی

This is my ideal of the unshakableness, of the individual Personality even before the Infinite. ---- :

زخود گذشتہ اے قطرۂ محال اندیش   شدن بہ بحر و گہر برنخاستن ننگ است

This is the view of man which, I think, underlies the whole teaching of the Quran, and this is what modern Islam has to re—learn. I feel impelled by some irresistable force to show up inner
richness of this idea to the younger generation of Islam to-day in all its bearings on life here and Hereafter I feel I have touched the hidden wound of the Muslim of today, and hope to be able to tell him "thou ailest here. "I am fully conscious of the seriousness of my task and hope that those who read me also realise the responsibility that lies on their shoulders,"

(Letter to Dr. Hadi Hasan, 2nd February, 1924)

ترجمہ:

"انسان کی محدود ذات کے بارے میں میرے نصب العین کو اس فارسی شعر سے زیادہ کہیں بھی بہتر انداز میں بیان نہیں کیا گیا جسے ایک قدیم فارسی شاعر نے مندرجہ ذیل الفاظ میں رسولِ کریمؐ سے متعلق کہا تھا۔

موسیٰؑ تو خدا کی صفات کے ایک جلوے ہی کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئے تھے لیکن آپؐ نے تو خدا کی ذات کو متبسم ہو کر دیکھا ہے۔ غیر محدود ہستی (خدا) کے سامنے بھی انفرادی ذات کے استحکام سے متعلق یہ ہے میرا تصوّر۔

اے محال اندیش قطرے! تو اپنی ہستی کو کھو چکا ہے۔ سمندر میں رہ کر موتی پیدا کرنا باعث ننگ ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ تصوّرِ انسان جسے قرآن حکیم کی تمام تعلیمات کی جان قرار دیا جاتا ہے۔ دَورِ حاضر کے مسلمان کو یہی قرآنی نظریہ سیکھنا ہے۔ مجھے کوئی ناقابلِ مزاحمت طاقت مجبور کر رہی ہے کہ میں مسلمانوں کی نئی نسل پر دنیوی اور اُخروی زندگی پر اس نظریئے کے تمام اثرات کی ثروت کو واضح کر دوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے موجودہ زمانے کے مسلمان کے پوشیدہ زخم کو چھُو لیا ہے مجھے امید ہے کہ میں اسے یہ بتانے کی صلاحیت رکھتا ہوں "تیرا مرض یہ ہے" مجھے اپنے اس کام کی سنجیدگی کا پورا پورا احساس ہے۔ میں توقع کرتا ہوں، کہ میرے قارئین بھی اس ذمہ داری کو محسوس کریں گے جو ان کے کندھوں پر آ پڑی ہے"

(ڈاکٹر ہادی حسن کے نام مکتوب مورخہ 2 فروری 1924ء)

"The ultimate end of all human activity is life glorious, powerful, exuberant. All human art must be subordinated to this final purpose, and the value of every thing must be determined in response to its life-yielding capacity.

(Iqbal's article which was published in The New Era, 1916)

ترجمہ:

"تمام انسانی سرگرمی کی غایتِ اولیٰ پُرشکوہ' طاقتور اور بھرپور زندگی ہے۔ تمام انسانی آرٹ کو بھی اس آخری غرض وغایت کے ماتحت ہونا چاہئے اور ہر چیز کی قدر وقیمت کو اس کی حیات بخش صلاحیّت کے مطابق متعین کرنا ہو گا"۔

(علامہ اقبال" کا مقالہ مطبوعہ نیو ایرا' مورخہ 1916ء)

(30) "فرمایا: یہ صرف دل ہی ہے جو خرد سے الجھتا ہے اور کوئی اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ تنہا دل ہے جو خم ٹھونک کر سامنے آتا ہے"

(روز گارِ فقیر' جلد اول صفحہ 185)

"Unaided reason is untrustworthy: it must always be supplemented by "DHAUQ" the mysterious perception of the essence of things - which brings knowledge and peace to the restless soul, and disarms Scepticism for ever. --- Besides sense and reason, however, There is another source of knowledge called "DHAUQ" - the inner perception which reveals nontemporal and non-spatial planes of being --- This mysterious sense corroborates and Corrects the conclusions of intellect."
(The Development of Metaphysics in Persia.) (P 98 & 111)

ترجمہ:

"بے یار و مدد گار عقل ناقابلِ اعتبار ہے۔ اس میں ہمیشہ "ذوق" بھی شامل ہونا چاہئے "ذوق" اشیاء کے جوہر کا وہ پُراسرار احساس ہے جو بے چین روح کو علم اور سکون کی دولت عطا کرتا ہے اور جو ہمیشہ کیلئے تشکیک پرستی کو غیر مسلح بنا دیتا ہے...... تاہم حس اور عقل کے علاوہ حصولِ علم کا ایک اور سرچشمہ ہے جسے "ذوق" کہا جاتا ہے یہ "ذوق" دراصل ایک ایسا باطنی احساس ہے جو ہستی کے غیر زمانی اور غیر مکانی مدارج کو منکشف کرتا ہے.......... یہ پُراسرار احساس عقل و خرد کے صحیح نتائج کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے غلط نتائج کی تصحیح کیا کرتا ہے"

(ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء صفحہ 111'98)

(32) "مسلمانوں کا فرض ہے کہ اسوۂ رسولؐ کو مدِّنظر رکھیں تاکہ جذبۂ تقلید اور جذبۂ عمل قائم رہے"

(تقریر میلاد النبیؐ مطبوعہ "صوفی" اکتوبر 1916ء)

(33) "خوشا وہ دلِ جو عشقِ نبویؐ کا نشیمن ہو"

(انوارِ اقبال صفحہ 35)

(34) "نہایت بے دردی سے قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیّلات داخل کیے جا رہے ہیں"

(نیاز احمد خاں کے نام خط مورخہ 1931ء)

(35) "میری رائے میں عجمیّت ایشیا کے مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوئی ہے۔ اس وقت اس باطل کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے"

(فیضانِ اقبال' ڈاکٹر سید یامین ہاشمی کے نام خط)

"Come, then out of the fogs of Persianism and walk into the brilliant desert - sunshine of Arabia."

(Thoughts and Reflections of Iqbal,) (P. 83)

ترجمہ:

"عجمیت، کی دھند سے باہر آ کر عرب کے صحرا کی شاندار دھوپ میں چلو"

(اقبالؒ کے افکار و تصوّرات صفحہ 83)

تصوف کے محرکات

مشرق کے اس عظیم شاعر اور فلسفی نے تصوف کے مختلف عوامل اور محرکات پر بھی اظہار خیال کیا ہے یہاں اس بارے میں ان کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے :۔

"In opposition, therefore, to the generally accepted view I have t r u to maintain that Sufism is a necessary product of the play of vairous intellectual and moral forces which would reasonily awaken the slumbering soul to a higher ideal of life."

The Development of Metaphysics In Persia. P. xi

ترجمہ:

"عام طور پر تسلیم شدہ نظریئے کے برعکس میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تصوف ان تمام مختلف ذہنی اور اخلاقی قوتوں کے کھیل کی پیداوار ہے جو لازماً خوابیدہ روح کو بیدار کر کے زندگی کے اعلیٰ نصب العین کی طرف لے جاتی ہیں" (ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء صفحہ ۱۱)

" Sufism - an appeal to a higher source of knowledge which was first systematised by Dhul'l Nun, and became more and more depened and anti-scholastic in contrast to the dry in-tellectualism of the Ash "arite."

The Development of Metaphysics In Persia, P. 46

ترجمہ:

"تصوّف اُس برتر ذریعۂ علم کی دلالت کرتا ہے جس کے نظام کو سب سے پہلے ذوالنون (مصری) نے تشکیل دیا تھا اور جو اشاعرہ کی خشک عقلیت کے مقابلے میں زیادہ عمیق اور متکلّمانہ انداز کے زیادہ خلاف ہوتا گیا"

(ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء صفحہ 46)

"The multiplicity of phi losophical and religious means - a necessory consequence of speculative activity - is a pt to invoke forces which operate against this, religiously speaking, dangerous multiplicity. In the 18th century history of European thought we see Fichte, starting with a sceptical inquing concerning the nature of matter, and finding its last word in Schleiermacher appeals to faith as opposed to reason, Jacobi point's to a source of knowledge higher then reason, while Cante abandous all metaphysical inquiry and limits all knowledge to sernsous perception."

ترجمہ:

"تفکّر آمیز سرگرمی کا ایک ضروری نتیجہ یعنی فلسفیانہ اور مذہبی نظریات کی کثرت اس خطرناک مذہبی کثرت کی مخالف قوتوں کو عمل پر ابھارنے کی طرف مائل ہوتی ہے۔ فلسفۂ یورپ کی اٹھارہویں صدی کی تاریخ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ فشتے نے مادے کی نوعیّت کے بارے میں شکوک پرور تحقیق سے آغاز کیا اور فشتے کو حرفِ آخر قرار دیا۔
عقل کی بجائے ایمان کو متاثر کرتا ہے اور جیکبی عقل سے بالاتر سرچشمۂ علم کی طرف اشارہ کرتا ہے جبکہ تمام قسم کی مابعد الطبیعی تحقیق کو ترک کر کے علم کو حسّی ادراک تک محدود کر دیتا ہے"

(ایران میں مابعد الصبیعیات کا ارتقاء صفحہ 47 - 46)

" ---- about the end of the 8th and the first half of the 9th century when, properly speeking, the Sufi ideal of life came into existence, to be soon followed by a philosophical justification of than ideal

(a) "When we study the history of the time, we find it to be a time of more or less political unrest --- It contributed to drive away spirits of devotinal character from the seen of contional unrest to the blissful peace of an ever - deepening contemplative life.

"The germs of Scepticism latent in Rationalism ultimatily meanitated an appeal to a super - intellectual source of knowledge which asserted itself in the Risola of Al-Qushair (986). In our own time the negative results of Kant's Critique of Pure Reason drove Jocobi and Schleiermacher to base faith on the feeling of the reality of the ideal: and to the 19th Century Sceptic Wordsworth uncovered that mysterious state of mind in which me grow all spirit and see into the life of things."

"The unemotional party of the various schools of Islam.

c

"The religious discussions among the representating of various creeds everaged by Al-Ma'mun.

e "The gradual softening of religious servency due to the rationalistic tendeney of the early Abbased period, and the rapid growth of wealth which tended to produce moral laxity and in difference to religious life in the upper circles of Islam.

f "The presence of christainity as a working ideal of life. It was, however, principally the actual life of the Christian hermit rather than his religious ideas, that exercised the greatest fascination over the minds of early Islamic saints whose complete unworldlinerss, though extrenally charming in itself is, I believe, quite contrary to the spirit of Islam."

(The Development of Metaphysics In Persia,) (P. 76 - 80)

ترجمہ:

: "آٹھویں صدی کے آخر میں اور نویں صدی کے نصف اوّل کے لگ بھگ صحیح طور پر زندگی کا وہ متصوفانہ نصب العین معرض وجود میں آیا جس کو بعد ازاں فوراً ہی فلسفیانہ جواز مل گیا۔

(ا) جب ہم اس زمانے کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اسے کم و بیش سیاسی اضطراب کا حامل پاتے ہیں...... اس سیاسی بے چینی نے زہد و عبادت کے فریفتہ انسانوں کو مسلسل اضطراب کے منظر سے ہٹا کر زیادہ گہری غور و فکر والی زندگی کی بابرکت تسکین کی جانب متوجہ کر دیا۔

(ب) عقل پرستی میں تشکیک پسندی کے مخفی جراثیم نے آخر کار عقل سے ماوراء سرچشمۂ علم کا وجود لازمی بنا دیا جس نے القشیری (986ء) کے "رسالہ" میں اپنا اثبات پایا۔ ہمارے اپنے زمانے میں کانٹ کی "تنقیدِ عقل محض" کے منفی نتائج نے جیکی ———— کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے نصب العین کی حقیقت کے احساس کی ایمان پر بنیاد رکھیں اور انیسویں صدی کے تشکیک پرست ورڈز ورتھ نے دل و دماغ کی اس پُراسرار حالت کا سراغ لگایا - جس میں ہماری روحانیت پروان چڑھتی ہے اور ہم اشیاء کی زندگی کو دیکھتے ہیں

(ج) مختلف اسلامی مکاتبِ فکر کا جذبات سے عاری تقویٰ۔

(د) المامون نے مختلف عقائد کے نمائندوں کے درمیان مذہبی بحثوں کی حوصلہ افزائی کی۔

(ہ) ابتدائی عباسی دَور کے عقل پرستانہ رجحان کے باعث مذہبی جوش بتدریج ٹھنڈا پڑ گیا اور دولت کی فوری ریل پیل نے مسلمانوں کے اعلیٰ طبقوں میں اخلاقی تساہل اور مذہبی اغماض کو جنم دیا۔

(و) زندگی کے قابلِ عمل نصب العین کی حیثیت سے عیسائیت کی موجودگی' عیسائی راہب کی حقیقی زندگی نے اس کے مذہبی نظریات سے زیادہ اوّل دَور کے مسلمان اولیاء کے ذہنوں کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ اگرچہ ان مسلمان زاہدوں اور ولیوں کی دنیا سے بے نیازی اپنے اندر بہت زیادہ کشش رکھتی ہے تاہم میرے خیال میں یہ اسلام کی روح کی بالکل ضد ہے۔"

(ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء صفحہ 80 - 76)

تصوف کے ضروری عناصر

:تصوف کے اہم اور ضروری عناصر کے بارے میں علامہ اقبالؒ کے درجِ ذیل اقتباسات بھی بہت حقیقت کشا ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے :۔

(1) "ایک دفعہ میں نے پوچھا۔ مثنوی 'پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق' میں آپ کے مصرع

علم و حکمت از کتب' دیں از نظر

میں "نظر" سے کیا مراد ہے؟ فرمایا "صحبت"

(مفلوظات صفحہ 68 محمد حسین عرشی سے ملاقات)

(2) "اس کے بعد علاّمہ نے چودھری محمد حسین صاحب سے کہا۔ - جاوید نامہ کے آخر میں خطاب بہ جاوید' کے عنوان سے میں نے چند باتیں جاوید کیلئے لکھی ہیں۔ ان میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ عصرِ حاضر میں قحط الرجال ہے اور مردانِ باخدا کا ملنا سخت مشکل ہو رہا ہے اگر تم خوش قسمت ہوئے تو تمہیں کوئی صاحبِ نظر مل جائے گا اور اگر نہ ملا تو تم میرے ہی نصائح پر عمل کرنا' پھر کہنے لگے کہ میرے مرنے کے بعد جب جاوید جوان ہو تو اسے ان اشعار کا مطلب سمجھا دینا"

(سیرتِ اقبال صفحہ 53 - 52' مرتضیٰ احمد خاں کی روایت 20 اپریل 1938ء)

(3) ۔ اقبال نے رازداری کے طور پر مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے والد مرحوم سے بیعت ہوں ۔ اقبال کے والد کے پاس ایک مجذوب صفت درویش آیا کرتے تھے وہ انہی سے بیعت تھے 'ان کا سلسلہ قادریہ تھا۔

(سیرتِ اقبال' صفحہ 103 پیر جماعت علی شاہؒ کی روایت مئی 1935ء)

(4) "یہی حال سلسلۂ قادریہ کا ہے جس میں خود بیعت رکھتا ہوں"

(مکاتیبِ اقبال' خط نمبر 35 سید سلیمان ندویؒ کے نام خط)

(5) "لڑکا (آفتاب اقبال) دہلی کالج میں پڑھتا ہے۔ ذہین وطباع ہے مگر کھیل کود کی طرف زیادہ راغب ہے آج کل اس فکر میں ہوں کہ اس کو کہیں مرید کرادوں یا اس کی شادی کر دوں کہ اس کے ناز میں نیاز پیدا ہو جائے۔ کہ

ناز تا ناز است کم خیزد نیاز

(سیرتِ اقبال صفحہ 105 مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نام خط 7 مارچ 1917ء)

(6) "گدی نشینوں نے جب سے دین کو حصولِ دنیا کا ذریعہ بنالیا اس وقت سے اخلاص رخصت ہو چکا ہے"

(فیضانِ اقبال صفحہ 331' صالح محمد کے نام خط)

(7) "تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا"

(ایضاً صفحہ 333 خط بنام محمد اسلم جیراج پوری)

Contemplation without action is death."

Stray Thought, 28 July, 1917

ترجمہ:

"عمل کے بغیر گیان دھیان موت کے مترادف ہے"۔

(افکارِ پریشان 28 جنوری 1917ء)

"The orders of Muslim mystics have invented various rules and Practices by which to come into direct contact with the Ultimate Reality The truth, however, is neither worship nor reflection nor any kind of practices entitle a man to this response from the Ultimate Lane. It depends eventually on what religion calls "grace"

(Iqbal's article on "Mctaggart's Philosophy. 1932)

ترجمہ:

"حقیقتِ مطلقہ (خدا) کے ساتھ براہِ راست رابطہ قائم کرنے کیلئے مسلمان صوفیاء کے گروہوں نے مختلف قواعد اور اعمال کو ایجاد کیا ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ نہ ہی عبادت 'نہ ہی تفکر اور نہ

ہی کسی قسم کے اعمال انسان کو اس بات کا حق دار بناتے ہیں کہ وہ عشقِ کل (خدا) کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ انجام کار اس کا دارومدار اس چیز پر ہے جسے مذہب خدا کا کرم کہتا ہے" ★

(اقبال" کا مقالہ بعنوان "میک ٹیگرٹ کا فلسفہ" 1932ء)

اس مختصر سے جائزے نے ہم پر یہ واضح کر دیا ہے کہ علاّمہ اقبال" کے خیال میں مسلم تصوّف کے آغاز اور ارتقاء کے مختلف اسباب کیا تھے۔ انہوں نے اس ضمن میں بہت سے تاریخی، علمی اور مذہبی محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی رائے میں مسلم تصوّف خالصتاً قرآنی تعلیمات کا حامل نہیں کیونکہ اس میں بعض عیسائی اور عجمی اثرات بھی نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

چند اکابر صوفیاء کا تذکرہ

: (1) "خدا کی رحمت ہو سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ پر کہ انہوں نے اس رہبانیت کی جڑ یعنی امتیازِ علم و معرفت کے پیدا ہوتے ہی اس کے خطرناک نتائج کا احساس کر کے اس کی مخالفت کی"

(انوارِ اقبال' صفحہ 269)

(2) "فرمایا: انالحق کے معنی یہ نہیں کہ میں نہ رہوں۔ اس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ انا ہی اصل شے ہے۔ بندہ اگر خدا میں گم ہو گیا تو گویا اس نے اپنی ہستی مٹا دی"

(ملفوظات صفحہ 162 بروایت ڈاکٹر سعید اللہ)

(3) "حکیم سنائیؒ اور مولانا رومؒ کو زیرِ نظر رکھنا چاہئے اس قسم کے لوگ اقوام و ملت کی زندگی کا اصل راز ہیں"

(فیضانِ اقبال" صفحہ 259 پروفیسر اکبر منیر کے نام خط)

The world of today needs a Rumi to create an attitude of hope, and to kindle the fire of enthusiasm for life."

(The Resonstruction of Religious Thought In Islam) (P 121)

ترجمہ:

: "آج کی دنیا کو ایک ایسے رومی کی ضرورت ہے جو لوگوں کے اندر رجائیت آمیز روّیہ پیدا کرے

اوران میں زندگی کے جوش وخروش کی آگ کو روشن کرے"

(اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل نو صفحہ 121)

"The superb Rumi - born to the Muslim world at a time when enervating modes of life and thought, and an outwardly beautiful scenrio but inwordly denitolising literature had almost completely sucked up the blood of Muslim Asia and paved the way for an easy victory for the Tartar --- he was not less keenly alive than Nietzsche to the poverty of life, incompetence, in adequacy and decay of the body - social of which he formed a part and parcel. See with what unerring insight he describes the corroding disease of his society and suggests the ideal type of Muslim Manhood

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر — کز دام ودَد ملولم وانسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سُست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا ورستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

(نیوایرا 18 اگست 1917ء)

ترجمہ:

: "عالی شان رومی" عالمِ اسلام میں اس وقت متولد ہوا تھا جب زندگی اور خیال کے ضعف آمیز طریقوں اور بظاہر خوبصورت مگر بباطن قوت زائل کرنے والے لٹریچر نے مسلمانانِ ایشیا کے خون کو مکمل طور پر چوس کر تاتاریوں کی آسان فتح کیلئے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ .... وہ اپنے دَور کے سیاسی حالات کا جزو لاینفک ہونے کی حیثیت سے زندگی کے افلاس سیاسی نااہلی ناموزونیت اور زوال کے بارے میں نطشے کی نسبت زیادہ ہی آگاہ تھا۔ ذرا دیکھئے تو سہی وہ کس درست بصیرت کے ساتھ اپنی سوسائٹی کی آہستہ آہستہ گھلانے والی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے مثالی نوعیت کے حامل مسلمان مردوں کی تجویز پیش کرتا ہے۔

گزشتہ رات ایک بزرگ چراغ لے کر شہر کا گشت کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں چوپایوں اور درندوں سے ملول ہوں اور مجھے انسانوں کی آرزو ہے۔ ان سُست اور کم کوش ساتھیوں سے میں رنجیدہ ہوں اس لئے مجھے شیرِ خدا اور رستمِ دستاں کی خواہش ہے۔

میں نے اس بزرگ سے کہا کہ جستجو کے باوجود ہمیں ایسے انسان نہیں ملے تو اس نے کہا کہ مجھے تو ایسے ہی نہ ملنے والے مثالی انسانوں کی آرزو ہے"

(نیوایرا 18 اگست 1917ء)

Nietzsche and Maulana Jalal-ul-din Rumi stand at the opposite poles."

ترجمہ:

نطشے اور مولانا جلال الدین رومی" مخالف سمتوں پر کھڑے ہیں"

(اقبالؒ کے افکار و تصوّرات صفحہ 89 - 88)

(7) "مثنوی رومیؒ پڑھنے سے اگر قلب میں گرمیٔ شوق پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہئے؟ شوق خود مرشد ہے۔ میں ایک مدت سے مطالعۂ کتب ترک کر چکا ہوں۔ اگر کبھی پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومیؒ"

(ملفوظات صفحہ 45 روایت محمد حسین عرشی 19 مارچ 1935ء)

Ghazali was the first to write a systematic refutation of philosophy, and completelv to annihilate that dread of intellectualism which hadcharacterised the orthodos. It was chiefly his influence that made men study dogma and metqhphysics together."

(The Development of Metaphysics in Persia) (P 38 - 39)

ترجمہ:

: "غزالیؒ وہ پہلا انسان تھا جس نے فلسفے کی باضابطہ تردید کے بارے میں لکھا اور اس عقل پرستی کے ہوّا کو مکمل طور پر نیست و نابود کر دیا جو قدامت پرستوں کا طرۂ امتیاز بنی ہوئی تھی۔ زیادہ تر اس کے زیر اثر ہی لوگوں نے مذہبی نظریات اور مابعد الطبیعیات، کا اکٹھا مطالعہ کیا تھا"

(ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء صفحہ 39 - 38)

"There is However our important difference between Ghazali and Kant. Kant consistensly with his principles, could not affirm the possibility of a knowledge of God. Ghazali, finding no hope in analytic thought, moved to mystic experience, and there found an independent content for religion. In this way he succeeded in securing for religion the right to exist independently of science and metaphysies."

(The Reconstruction of Religious thought In Islam,) (P. 5)

ترجمہ:

: "تاہم غزالیؒ اور کانٹ کے درمیان ایک اہم فرق ہے۔ اپنے اصولوں کے تسلسل اور تواتر کو مدِنظر رکھتے ہوئے کانٹ خدا کے علم کے امکان کو ثابت نہ کر سکا۔ (اس کے برعکس) غزالیؒ نے تجزیاتی فکر سے مایوس ہو کر صوفیانہ تجربے کی طرف توجہ دی اور وہاں مذہب کیلئے ایک آزاد موضوع کی تشکیل کی۔ اس طرح وہ مذہب کو سائنس اور مابعد الطبیعیات سے آزاد ہو کر زندہ رہنے کا حق دلانے میں کامیاب ہو گیا"

(اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل نو صفحہ 5)

(10) "مجھے اپنے خاندان کے بزرگوں سے معلوم ہوا ہے کہ میری پیدائش سے کئی سال پیشتر ابّا جان حضرت مجددؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور دعا کی کہ اللہ انہیں ایک بیٹا عطا کرے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے اپنے ساتھ لے کر دوبارہ سرہند شریف پہنچے"

(ملفوظات صفحہ 322 جاوید اقبال کی روایت)

(11) "حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمتہ اپنے مکتوبات میں کئی جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تصوّف شعارِ حقّۂ اسلامیہ میں خلوص پیدا کرنے کا نام ہے۔ اگر تصوّف کی یہ تعریف کی جائے تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ راقم الحروف اس تصوّف کو جس کا نصب العین شعائرِ اسلام میں مخلصانہ استقامت پیدا کرنا ہو، عین اسلام جانتا ہے اور اس پر اعتراض کرنے کو بدبختی اور خسران کا مرادف سمجھتا ہے لیکن اہلِ نظر کو معلوم ہے کہ صوفیائے اسلام میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو شریعتِ اسلامیہ کو علمِ ظاہر کے حقارت آمیز خطاب سے یاد کرتا ہے"

(انوارِ اقبال صفحہ 268)

(12) "مجدّد الف ثانی اور مولانا اسماعیل شہید رحمتہ اللہ علیہم نے اسلامی سیرت کے احیاء کی کوشش کی مگر صوفیائے اس گروہِ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا"

(فیضانِ اقبال صفحہ 383 لسان العصر اکبر الہ آبادی کے نام خط)

" .. modern psychology has not yet touched even the outer fringe of religious life, and is still far from the richness and variety of what is called religious experience. In order to give you an idea of its richness and variety I quote here the substance of a passage from a great religious genius of the seventeenth century Sheikh Ahmad of Sarhand - whose fearless analytical criticism of contemparary Sufism resulted in the development of a new technique. All the various systems of Sufi technique in India came from central Asia and Arabia: his the only techique which croned the Indian border and is still a living force in the punjab, Afghanistan, and Asiatic Russia."

(The Reconstruction of Religious Thought In Islam,) (PP 192 - 193)

ترجمہ:

: "...... .. .. جدید نفسیات نے ابھی تک مذہبی زندگی کے بیرونی سرے کو بھی نہیں چھوا ہے اور وہ تا

ہنوز مذہبی تجربات کی ثروت اور تنوع سے دُور ہے۔ تمہیں ان دونوں کا عندیہ دینے کیلئے میں یہاں سترہویں صدی کی ایک عظیم اور مذہبی نابغہ شخصیت یعنی شیخ احمد سرہندیؒ کی کتاب کے ایک اقتباس کا لُبِ لباب پیش کرتا ہوں۔ شیخ احمدؒ سرہندیؒ نے اپنے عہد کے تصوّف کو اپنی بیباک تجزیاتی تنقید کا نشانہ بنایا جس کے نتیجہ میں ایک نئے طریق عمل کو ترقی ملی۔ ہندوستان میں صوفیانہ طریق کے مختلف نظام سنٹرل ایشیا اور عرب سے آئے تھے اس کے برعکس صرف شیخ احمدؒ سرہندیؒ کے صوفیانہ طریق نے انڈین سرحدوں کو عبور کیا اور یہ طریق ابھی تک پنجاب، افغانستان اور ایشیائی روس میں زندہ قوّت ہے"

(اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل نو صفحہ 193 - 192)

(14) "اس وقت میرا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت شیخ کی تعلیمات قرآن کے مطابق نہیں ہیں اور نہ ہی کسی تاویل و تشریح سے اس کے مطابق ہو سکتی ہیں"

(شاہ سلیمان پھلواری کے نام خط 24 فروری 1916ء)

(15) "مسئلہ وحدت الوجود، ان معنوں میں کہ ذاتِ باری تعالیٰ ہر شے کی عین ہے قرآن سے ثابت نہیں اور روحانیت میں اسلامی تربیت کا طریق - صحو ' ہے نہ سُکر"

(خواجہ حسن نظامی کے نام خط 11 جنوری 1918ء)

(16) "مسلمانوں اور ہندوؤں کی تاریخ میں ایک عجیب و غریب ذہنی مماثلت ہے اور وہ ہے مسئلہ اَنا کی تحقیق و تدقیق میں اور وہ یہ کہ جس نقطۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی، اسی نقطۂ خیال سے شیخ محی الدین ابنِ عربیؒ اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی۔ انہوں نے مسئلہ وحدت الوجود کو اسلامی تخیّل کا لاینفک عنصر بنادیا۔ ہندو حکماء نے مسئلہ وحدت الوجود کے اسباب میں دماغ کو مخاطب کیا مگر ایرانی شعراء نے دل کو آماجگاہ بنایا۔ ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔ علماء میں غالباً ابن تیمیہ علیہ الرحمتہ اور حکماء میں واحد محمود نے اسلامی تخیّل کے اس ہمہ گیر میلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی"

(دیباچہ مثنوی اسرارِ خود اشاعت اول 1915ء)

(17) "فرمایا میں نے شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی فصوص الحکم اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی حکمتہ الاشراق کوئی دس دس دفعہ نہایت غور و خوض سے پڑھی ہیں۔ ان بزرگوں کے علم اور ذوق میں کوئی کلام نہیں لیکن ان کتابوں کے اکثر مندرجات کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں"

(ذکرِ اقبال صفحہ 46)

(18) "اصل بات یہ ہے کہ صوفیاء کو توحید اور وحدۃ الوجود کا مفہوم سمجھنے میں سخت غلطی ہوئی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں مترادف نہیں ہیں. .... قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یا اس کی رُو سے وجود فی الخارج (کائنات) کو ذات باری کے ساتھ اتحاد یا غیبت کی نسبت نہیں بلکہ مخلوقیت کی نسبت ہے"

ہنوز مذہبی تجربات کی ثروت اور تنوع سے دُور ہے۔ تمہیں ان دونوں کا عندیہ دینے کیلئے میں یہاں سترہویں صدی کی ایک عظیم اور مذہبی نابغہ شخصیت یعنی شیخ احمد سرہندیؒ کی کتاب کے ایک اقتباس کا لُبِ لباب پیش کرتا ہوں۔ شیخ احمدؒ سرہندیؒ نے اپنے عہد کے تصوّف کو اپنی بیباک تجزیاتی تنقید کا نشانہ بنایا جس کے نتیجہ میں ایک نئے طریق عمل کو ترقی ملی۔ ہندوستان میں صوفیانہ طریق کے مختلف نظام سنٹرل ایشیا اور عرب سے آئے تھے اس کے برعکس صرف شیخ احمدؒ سرہندیؒ کے صوفیانہ طریق نے انڈین سرحدوں کو عبور کیا اور یہ طریق ابھی تک پنجاب، افغانستان اور ایشیائی روس میں زندہ قوّت ہے۔"

(اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل نو صفحہ 193 - 192)

(14) "اس وقت میرا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت شیخ کی تعلیمات قرآن کے مطابق نہیں ہیں اور نہ ہی کسی تاویل و تشریح سے اس کے مطابق ہو سکتی ہیں"

(شاہ سلیمان پھلواری کے نام خط 24 فروری 1916ء)

(15) "مسئلہ وحدت الوجود، ان معنوں میں کہ ذاتِ باری تعالیٰ ہر شے کی عین ہے قرآن سے ثابت نہیں اور روحانیت میں اسلامی تربیت کا طریق - صحو، ہے نہ سُکر"

(خواجہ حسن نظامی کے نام خط 11 جنوری 1918ء)

(16) "مسلمانوں اور ہندوؤں کی تاریخ میں ایک عجیب و غریب ذہنی مماثلت ہے اور وہ ہے مسئلہ اَنا کی تحقیق و تدقیق میں اور وہ یہ کہ جس نقطۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی، اسی نقطۂ خیال سے شیخ محی الدین ابنِ عربیؒ اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی۔ انہوں نے مسئلہ وحدت الوجود کو اسلامی تخیّل کا لاینفک عنصر بنا دیا۔ ہندو حکماء نے مسئلہ وحدت الوجود کے اسباب میں دماغ کو مخاطب کیا مگر ایرانی شعراء نے دل کو آماجگاہ بنایا۔ ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔ علماء میں غالباً ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ اور حکماء میں واحد محمود نے اسلامی تخیّل کے اس ہمہ گیر میلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی"

(دیباچہ مثنوی اسرارِ خود اشاعت اول 1915ء)

(17) "فرمایا میں نے شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی فصوص الحکمؒ اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی حکمتہ الاشراق کوئی دس دس دفعہ نہایت غور و خوض سے پڑھی ہیں۔ ان بزرگوں کے علم اور ذوق میں کوئی کلام نہیں لیکن ان کتابوں کے اکثر مندرجات کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں"

(ذکرِ اقبال صفحہ 46)

(18) "اصل بات یہ ہے کہ صوفیاء کو توحید اور وحدۃ الوجود کا مفہوم سمجھنے میں سخت غلطی ہوئی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں مترادف نہیں ہیں ...... قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یا اس کی رُو سے وجود فی الخارج (کائنات) کو ذات باری کے ساتھ اتحاد یا غیبت کی نسبت نہیں بلکہ مخلوقیت کی نسبت ہے۔"

(خواجہ حسن نظامی کے نام خط 30 دسمبر 1915ء)

"--- it was kant who first raised the question: Is metaphysics possible? He answered this question in the negative; and his argument applies with equal force to the realitis in which religion is aspecially interested. --- There liesy question. therefore, is whether the normal level is the only level of knowledge-yielding experience. Kant's view of the thing to itself and the thing as it appears to us very much determined the character of his question regarding the possibility of metaphysics But what is the position, as understood by him, is reversed the great Muslim Sufi philosopher, Muhyuddin IBNULARABI of Spain, has made the acute observotion that God is a percept; the world is a concept."

(The Reconstruction of Religious Thought In Islam PP 182 - 183.)

ترجمہ:

"سب سے پہلے کانٹ نے یہ سوال اٹھایا تھا' کیا مابعد الطبیعیات ممکن ہے؟'۔ اس نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا تھا۔ اس کی دلیل پوری قوت کے ساتھ ان حقائق پر بھی لاگو ہوتی ہے جن میں مذہب کو خصوصی دلچسپی ہے.......... اس لئے صرف سوال یہ ہے کہ عام سطح علم پیدا کرنے والے تجربے کی واحد سطح ہے۔ کسی شے کی اصل اور اس کے ظاہر کے بارے میں کانٹ کے نظریئے نے مابعد الطبیعیات کے امکان کے ضمن میں اس کے سوال کی نوعیت کو بہت زیادہ متعین کیا تھا۔ اگر ہم اس کے سوال کو الٹ کر دیکھیں تو اس کی حالت کیا ہوگی؟ سپین کے ایک عظیم مسلمان صوفی فلسفی، محی الدین ابنِ عربی نے ایک بڑی نازک بات کہی ہے کہ خدا تو احساس ہے اور دنیا ایک تصور ہے"

(اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل نو صفحہ 183 - 182)

(20) "آپ (اقبالؒ) ولایت جاتے ہوئے بھی بمقام دہلی آستانۂ حضرت محبوبِ الٰہیؒ پر حاضر ہوئے۔ وہاں ایک خالص صوفیانہ نظم بھی پڑھی اور واپسی کے وقت بھی جب کہ علاوہ علمی قابلیتوں میں اضافہ کے آزادئ یورپ کی ہوا بھی کھا چکے تھے۔ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ (محبوبِ الٰہی) پر بصد عجز سرِ تسلیم و نیاز خم کیا غرض یہ موروثی مذاق ہمارے موجودہ شاعر میں بھی موجود ہے اور اس کی شاعری کا جزوِ ضروری بن گیا ہے"

(محمد دین فوق، کشمیری میگزین (اپریل 1909ء)

تصوّف سے علّامہ اقبالؒ کاذاتی شغف

(1) "ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ پنجابی نظم میں تصوّف کے بڑے بڑے ذخیرے پنہاں ہیں خصوصاً فریدؒ کے دوہے فارسی کے بعد شاید یہ دوسری زبان ہے جو تصوّف سے مملو ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فریدؒ کا یہ مشہور بیت سنایا تھا۔

اٹھ فریدا! جاگ سویرے تے جھاڑو دے مسیت

تُوں سُتّا تے رب جاگ دا تیری ڈاہڈے نال پریت

(ملفوظات صفحہ 300 - 299 عبدالرشید طارق کی روایت)

(2) "اہل اللہ کے حالات نے جو آپ نے بنام "یادِ رفتگان" تحریر فرمائے ہیں مجھ پر بڑا اثر کیا اور بعض باتوں نے جو آپ نے اس چھوٹی سی کتاب میں درج کی ہیں مجھے اتنا رلایا کہ میں بے خود ہو گیا............ زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ ان لوگوں کے حیرت ناک تذکروں کو زندہ کیا جائے. .... بھائی فوق خود بھی اس گوہرِ نایاب کی تلاش میں رہو جو بادشاہوں کے خزانوں میں نہیں مل سکتا بلکہ کسی خرقہ پوش کے پاؤں کی خاک میں اتفاقیہ مل جاتا ہے"

(انوارِ اقبال" صفحہ 52 محمد دین فوق کے نام خط '7 اکتوبر 1904ء)

(3) "جن لوگوں کے عقائد و عمل کا ماخذ کتاب و سنّت ہے اقبال ان کے قدموں پر ٹوپی کیا سر رکھنے کو تیار ہے اور ان کی صحبت کے ایک لحظہ کو دنیا کی تمام عزت و آبرو پر ترجیح دیتا ہے"

(خواجہ حسن نظامیؒ کے نام خط 11 جنوری 1918ء)

(4) "میری ایک مدّت سے خواہش ہے کہ اسلامی حکماء و صوفیاؒ کے نقطۂ نگاہ سے یورپ کو روشناس کرایا جائے، یقین ہے کہ اس کا بہت اچھا اثر ہو گا"

(سیّد سلیمان ندویؒ کے نام خط فیضانِ اقبال صفحہ 256)

(5) "قرآن مجید کثرت سے پڑھنا چاہئے تاکہ قلب میں محمدیؐ نسبت پیدا کرے"

(ایضاً صفحہ 281 نیاز الدین خاں کے نام خط)

(6) "افسوس کوئی آدمی ہم میں ایسا نہیں جس کی زندگی قلوب پر مؤثر ہو۔ علماء میں مداہنت آ گئی ہے"

(ایضاً صفحہ 382 عبدالماجد دریا آبادی کے نام خط)

(7) آپ کو معلوم ہے کہ میرا فطری اور آبائی میلان تصوّف کی طرف ہے"

(خواجہ حسن نظامی کے نام خط 30 دسمبر 1915ء)

(8) "تصوّف کے مقاصد سے مجھے کیونکر اختلاف ہو سکتا ہے۔ کوئی مسلمان ہے جو ان لوگوں کو بُرا سمجھے جن کا نصب العین محبّتِ رسول اللہؐ ہے اور جو اس ذریعے سے ذاتِ باری سے تعلق پیدا کر کے اپنے اور دوسروں کے ایمان کی پختگی کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر میں تمام صوفیا کا مخالف ہوتا تو مثنوی (اسرار و رموز) میں ان کی حکایات و مقولات سے استدلال نہ کرتا"

(اقبال ریویو صفحہ 12 - 11 محمد عبداللہ قریشی کا مضمون "علّامہ اقبال اور خواجہ حسن نظامی")

'' --- religions as a deliberate enterprise to seize the ultimate principle of value and thereby to reintegrate the forces of one's own personality, is a fact which cannot be devided. The whole religious literature of the world — is a standling testimony to it. There experiences are perfectly natural, like our normal experience. --- If an outlook beyond physics is possible we must courgiously face the possibility, even though it may disturb or tend to modify our normal ways of life nd thought. The interests of truth require that we must abandon our present attitude.''

The Reconstruction of Relitions thought In Islam, PP 189 190

ترجمہ

"..........مذہب ایک بالارادہ عظیم کام کی حیثیت سے قدر و قیمت کے مُطلقؑ اصول کو قابو کر کے اس کے ذریعے کسی کی شخصیت کی طاقتوں کو از سرِ نو مجتمع کرنے کے مترادف ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت

ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کا تمام مذہبی لٹریچر اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے۔ ہمارے عام تجربات کی طرح یہ (مذہبی) تجربات مکمل طور پر فطرتی ہیں۔ ...... اگر مابعد الطبیعیات کے ماوراء کوئی نقطہ نظر ممکن ہے تو پھر انسان کو چاہیئے کہ وہ اس کے امکان کا جرأت کے ساتھ سامنا کرے اگرچہ یہ زندگی اور خیال کے بارے میں ہمارے مروجہ طریقوں میں خلل اندازی اور تبدیلی کا باعث ہی کیوں نہ ہو۔ حقیقت کے مفادات اس امر کے متقاضی ہیں کہ ہم اپنے موجودہ رویئے کو چھوڑ دیں "

(اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیلِ نو صفحہ 190 - 189)

(10) "ڈاکٹر صاحب نے فرمایا چند دن ہوئے میں باہر بیٹھا تھا۔ ایک فقیر ہاتھ میں ڈنڈا لئے تہمد باندھے آگیا میں کُرسی پر بیٹھا تھا۔ میری ٹانگیں دبانے لگا.......... آخر میں نے پوچھا آپ کس طرح آئے ہیں؟ اس فقیر نے کہا میں فلاں پیر صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ انہوں نے کہا کہ تمہارے علاقہ کا قلندر ڈاکٹر اقبال کو مقرر کر دیا گیا ہے تم اُن کے پاس جاؤ۔ اتنے میں چودھری محمد حسین صاحب تشریف لائے اور آتے ہی سر سکندر کے بارے میں گفتگو شروع کرنے ہی کو تھے کہ میں نے ٹوکا اور کہا۔ چودھری صاحب اس سکندری کو رہنے دیجئے' آج یہاں قلندری کی باتیں ہو رہی ہیں "

(سیرتِ اقبال صفحہ 94 ڈاکٹر سعید اللہ کی روایت)

(11) "ایک بار ایک درویش علامہ اقبال کے پاس آیا۔ آپ نے اس سے دعا کی درخواست کی۔ پوچھا " دولت چاہتے ہو؟ " جواب دیا " میں درویش ہوں۔ دولت کی ہوس نہیں " " عزت و جاہ مانگتے ہو؟ " جواب دیا " وہ بھی خدا نے کافی بخش دی ہے " پوچھا " " تو کیا خدا سے ملنا چاہتے ہو؟ " جواب دیا " " سائیں جی! کیا کہہ رہے ہو؟ ۔ میں بندہ وہ خدا۔ بندہ خدا سے کیونکر مل سکتا ہے؛ قطرہ دریا میں مل جائے تو قطرہ نہیں رہتا۔ میں قطرہ کی حیثیت میں رہ کر دریا بننا چاہتا ہوں " یہ سن کر اس درویش پر خاص کیفیت طاری ہوئی اور کہا " " بابا! جیسا سنا تھا ویسا پایا تُو خود آگاہِ راز ہے۔ تجھے کسی کی دعا کی کیا ضرورت ہے "

(سیرتِ اقبال صفحہ 99 - 98)

"Materialism pure and simple cannot serve as a basis for human society."

Letters And Writings of Iqbal. P. 56. December, 1931.

ترجمہ:

" " خالص اور سادہ مادہ پرستی انسانی سوسائٹی کیلئے بنیاد کا کام نہیں دے سکتی "

(اقبال" کے خطوط و تصانیف صفحہ 56 دسمبر 1931ء)

تصوّف اہلِ تصوّف کی نظر میں

(1) "اے ابنِ آدم!..... یہی وہ نفس ہے کہ اگر اس نے نجات پائی تو تجھے بھی نجات مل گئی اور اگر یہ ہلاک ہو گیا تو تو بھی ہلاکت سے ہر گز نہ بچ سکے گا"

(حسن بصریؒ کا قول، تصوّفِ اسلام صفحہ 151)

(2) "اے نفس! تو اللہ سے اپنی محبّت کا اظہار کرتا ہے حالانکہ تو اس کی نافرمانی بھی کرتا ہے... اگر تیری محبت صادق ہے پھر تو اپنے رب کی اطاعت کر کیونکہ محبّت کرنے والا جس سے محبت کرتا ہے اس کی اطاعت بھی ضرور کرتا ہے"

(رابعہ بصریؒ تصوّفِ اسلام، صفحہ 159)

(3) "جب سالک کو اللہ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ نفسِ امارہ کی غلامی سے کلیتاً آزاد ہو جاتا ہے اور یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے"

(امام قیشری رسالہ قیشریہ صفحہ 142)

(4) "فنا کا مطلب فنائے نفس نہیں ہے بلکہ تزکیۂ نفس ہے اور تزکیۂ نفس کا مطلب ہے اللہ کی صفات سے اپنے نفس کو منوّر کرنا اور جب نفس منوّر ہو جاتا ہے تو اسے اللہ کی صحیح معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ نیکی اور بدی میں تمیز کر سکتا ہے"

(ابو نصر سراجؒ کتاب اللمع باب 144)

(5) "بعض صوفیا اس بات کا غلط دعویٰ کر رہے ہیں کہ انہیں صفائے کامل و دائم نصیب ہو گئی ہے چنانچہ ان کا زعم ہے کہ ایک انسان اس دنیا میں تمام عیوب اور کدورات اور علتوں سے پاک ہو سکتا ہے حالانکہ یہ بات غلط ہے کہ کوئی شخص دائمی طور پر تمام عیوب و نقائص سے پاک ہو سکے اور اس میں کوئی بشری کمزوری باقی نہ رہے۔ انسان کو لازم ہے کہ ہر وقت درگاہِ الٰہی میں توبہ کرتا رہے اور استغفار کرتا رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے بڑھ کر کون پاک و صاف ہو سکتا ہے مگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) بھی روزانہ سو مرتبہ استغفار فرماتے تھے۔"

(ابو نصر سراجؒ کتاب اللمع باب 146)

(6) "اے میرے معبود! اگر میں تیری عبادت جہنّم کے ڈر سے کرتی ہوں پھر تُو مجھے نارِ جہنم کا لقمہ بنادے، اگر میں تیری عبادت جنّت کے لالچ میں کرتی ہوں پھر تُو مجھے اس سے ہمیشہ کیلئے محروم کر دے"

(رابعہ بصریؒ کی مناجات، تصوفِ اسلام صفحہ 161)

(7) "جس نے اپنے باطن کو مراقبہ اور اخلاص سے درست کیا تو اس کے ظاہر کو بھی اللہ تعالیٰ مجاہدہ اور اتباعِ سنت کے باعث صحیح اور درست بنا دیتا ہے"

(حارث محاسبیؒ ایضاً صفحہ 209)

(8) "جب بندہ طاعات، طہارات اور اذکار پر مداومت کرتا ہے تو نفسِ ناطقہ میں ایک صفت قائم ہو جاتی ہے اور اس توجہ کا ملکۂ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے"

(شاہ ولی اللہؒ القول الجمیل)

(9) "پس ہستیٔ مطلق کو ہر دم خیال میں پرورش کرنا اور حاضر و موجود جان کر شرم و حیا کے ساتھ بندہ کا مطیع رہنا اصلی مقصد ہے اور یہی احسان ہے باقی زوائد"

(رشید احمد گنگوہیؒ مکاتیبِ رشیدیہ صفحہ 20)

(10) "اگر تجھ میں غیر اللہ کیلئے کوئی دلکشی باقی ہے تو واقف نہ ہو سکے گا"

(ابن الحسنؒ کتاب المواقف (موقفِ ہشتم)

(11) "اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ اخلاص یہ ہے کہ عبادت اور اطاعت کیلئے صرف اللہ ہی کو منتخب کر لیا جائے اور اطاعت سے صرف اس کا قرب مراد ہو"

(ایضاً)

(12) "اُس الواحد سے محبت کرو جسے کبھی فنا نہیں ہے تاکہ اس کی محبت سے تم بھی غیر فانی ہو جاؤ"

(ابو سعید ابوالخیرؒ کا قول، تاریخ تصوف صفحہ 513)

(13) "تصوّف کا شمار در حقیقت علومِ شرعیہ ہی میں ہونا چاہئے..... ..... کیونکہ اس کی اصل وہی ہے جو اسلافِ صالحین کی تھی یعنی صحابہؓ اور تابعین کی۔ اس کا اصول بھی ہمیشہ ایک ہی رہا یعنی حق وہدایت کی پیروی، عبادت اور ریاضت، تمام رشتوں سے منہ موڑ کر صرف اللہ سے لو لگانا، دنیا کی زینت اور دلکشی سے بے نیازانہ گزر جانا"

(ابنِ خلدون مقدمہ ابنِ خلدون صفحہ 328)

(14) "تصوف.......... ایک جامع ومانع لفظ ہے جو فقر اور زُہد سب پر حاوی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ زُہد اور فقر کے علاوہ کچھ اور بھی اوصاف اور اضافات ہیں"

(شیخ شہاب الدین سہروردیؒ عُوارف المعارف)

(15) " "تصوف کے معنی یہ ہیں کہ جملہ اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ طیبہ کے ایوان میں داخل ہونا اور ہر قسم کے اخلاقِ رذیلہ اور عاداتِ ردیّہ سے پاک صاف ہو جانا" (ابو محمد جریریؒ تصوفِ اسلام صفحہ 189)

(16) " "تصوف کے معنی ہیں خُلقِ جمیل۔ یہ علم مبنی ہے ارادہ پر۔ وہی اس کی بنیاد ہے۔ اس علم کا قلب سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس کی تمام سرگرمیاں قلب ہی سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے اس کو علمِ باطن کہتے ہیں جس طرح علمِ فقہ، احکامِ اعضاء وجوارح کی تفاصیل پر مشتمل ہے اس لئے اسے علمِ ظاہر کہتے ہیں"

(علامہ ابنِ القیّم مدارج السالکین)

(17) "تصوّف کے معنی ہیں حقائق کا حاصل کر لینا اور بندوں کے قبضہ واختیار میں جو کچھ بھی ہے، اس سے یکسر مایوس ہو جانا"

(معروف کرخیؒ)

(18) "منازلِ سلوک طے کرنے اور مقاماتِ جذب قطع کرنے کے بعد ہی معلوم ہوا کہ اس سیر وسلوک کا مقصد مقامِ اخلاص کی تحصیل ہے"

(مجدد الف ثانیؒ چالیسواں مکتوب جلد اوّل)

(19) "طریقِ صوفیاءؒ کے سلوک کا مقصد صرف یہ ہے کہ معتقداتِ شرعیہ کا یقین بڑھے نیز احکامِ فقہی کے ادا میں آسانی ہو"

(مجدد الف ثانیؒ مکتوب دوصد وہفتم جلد اوّل)

(20) "اور متعدد صوفیاءؒ کے طریقۂ علیہ کا مشاہدہ حق کا حصول ہے، "گُلُ ننگ تراہ" اور اس حضور کا نام انہوں نے مشاہدہ بالقلب رکھا ہے"

(شاہ ولی اللہ، انتباہ فی سلاسلِ اولیاء اللہ صفحہ 39)

(21) "اعمالِ خیر مثلاً نماز، روزہ، ذکر، تلاوت وغیرہ کے ذریعہ سے یقین پیدا کرنا۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ سب مسلمان بہ قدرِ استعداد نیکی کرتے ہیں مگر ان کو مرتبۂ یقین حاصل نہیں ہوتا ہے۔ ان اعمال کے ساتھ تین باتیں اور ملائی جائیں تو یقین پیدا ہوتا ہے۔ ایک تو اعمال میں اخلاص، دوسرے اعمالِ خیر کی زیادتی، تیسرے ان اعمال کی کیفیتِ خاصہ یعنی خشوع وغیرہ"

(شاہ ولی اللہؒ ازالۃ الخفاء)

(22) "جن لوگوں نے ایمان کا دعویٰ کیا لیکن وہ صاحبانِ ذوق نہ تھے۔ حق تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ اپنے آپ کو مومن نہ کہو مسلم کہو "قَالَتِ الْأَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ" پس یہ لوگ مسلمان ہیں مومن نہیں اس لئے کہ ایمان ان کے دل کے اندر رچا نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ صاحبِ ذوق نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ دائرہ اسلام سے خارج ہیں یا ان کے اعمال کے اجر میں کمی ہو گئی (البتہ صاحبِ ذوق کا معاملہ ہی دوسرا ہے) ذوق ایک باطنی امر ہے اور عمل اس کا نشان ہے۔ پس اعمال علوم و عقائد کے ثمرات ہیں اور یقین سے جہاد اور احسان کے مقامات پیدا ہوتے ہیں"

(حافظ ابنِ قیمؒ 'مدارج السالکین' (جلد سوم صفحہ 58)

(23) "یہ تمام شریعت کا علم اور طریقت کا طریقہ نورِ یقین کی تحصیل کے واسطے ہے اور انجام و منتہی سب کا یہی تو ہے کہ جس کا مسلمان سرسری طور پر علم رکھتے ہیں وہ یقین، حق الیقین، مثل مشاہدہ کے ہو جائے۔ یہ انتہا سب طریقوں کی ہے"

(مولانا رشید احمد گنگوہیؒ 'مکاتیب رشیدیہ صفحہ 80)

(24) "صوفیاؒ کے نفع بخش اشغال کی حیثیت دوا و معالجہ کی ہے کہ بوقت ضرورت ان سے کام لے اور بعد کو پھر اپنے کام میں مشغول ہو"

(مولانا اسماعیل شہیدؒ 'ایضاح الحق الصریح' صفحہ 78)

(25) "ہر وقت اور ہر قرن کے اشغال جُدا ہوتے ہیں اس لئے ہر طریق کے محققین تجدیدِ اشغال کی کوشش کرتے رہتے ہیں"

(شاہ اسماعیل شہیدؒ 'صراطِ مستقیم' صفحہ 7)

(26) "اس بات پر اجماع ہے کہ صحابہؓ غیر صحابہ سے افضل ہیں حالانکہ علم و عمل میں صحابہؓ اور غیر صحابہ مشارکت رکھتے ہیں اس کے باوجود حضرت نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صحابہؓ نے راہِ خدا میں جو نصف صاعَ جَو خرچ فرمایا ہے اگر دوسرا اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو دونوں برابر نہیں۔ یہ فرق ان باطنی کمالات کی بناء پر ہے جو ان کو حضرت رسولِ کریمؐ کے فیضِ صحبت سے حاصل ہوئے تھے"

(قاضی ثناءاللہؒ ارشاد الطالبین صفحہ 4)

(27) "میرا گمانِ غالب ہے کہ صحابۂ کرامؓ نسبت کو اور طریقوں سے بھی حاصل فرماتے تھے. ...... یہ حضرات قرآن کی تلاوت اس میں تدبّر' وعظ اور زُہد ورقاق کی احادیث کے سننے پر مواظبت فرماتے تھے اور اس سے ان کو ایک ملکۂ راسخہ اور ہیئت نفسانیہ حاصل ہوتی تھی"

(شاہ ولی اللہ' القول الجمیل)

(28) "وہ قربِ خداوندی جس کا تعلق فنا و بقا اور سلوک و جذب سے ہے۔ قربِ ولایت ہے' اولیائے امّت اس سے مشرف ہوئے اور جو قرب کہ صحابہ کرامؓ کو حضورؐ کی صحبت میں حاصل ہوا وہ قُربِ نبوّت ہے. ...... یہ قرب' قربِ ولایت سے بدرجہا بہتر ہے اس لئے کہ یہ قربِ حقیقی ہے اور قربِ ظلّی ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے.......... صحابہ کرامؓ نے قربِ نبوّت کے راستے سے منزل طے کی ہے۔ جذب و سلوک اور فنا و بقا سے ان کو کام نہ تھا"

(مجدّد الف ثانیؒ مکتوبات جلد اوّل 'مکتوب سہ صد و سیزدہم)

(29) "بعض صوفیاء یہ کہتے ہیں کہ ولایت نبوت سے افضل ہے۔ اس غلط فہمی کا مبنیٰ قصّہ موسیٰؑ و خضرؑ میں عدم تدبّر ہے

(1) کوئی ولی کوئی کرامت نہیں دکھا سکتا جب تک وہ اپنے زمانے کے نبی یا رسول کا متبع نہ ہو۔

(2) تابع اپنے متبوع سے اور مطیع اپنے مطاع سے افضل نہیں ہو سکتا۔

(3) انبیاءؑ ہر وقت مہبطِ وحی و الہام ہوتے ہیں لیکن اولیاء کو یہ نعمت ہر وقت نصیب نہیں ہوتی"

(ابو نصر سراجؒ کتاب اللمع' باب 141)

(30) "میرا تصوّف مقید بالکتاب. السُنّۃ ہے۔ جو بات قرآن و حدیث سے ثابت نہ ہو وہ مردُود ہے"

(جنید بغدادیؒ کا قول تاریخِ تصوّف صفحہ 219)

(31) "تصوّف یہ ہے کہ صوفی اس طرح خدا کی معیت میں زندگی بسر کرے کہ غیر اللہ سے اسے کوئی وابستگی باقی نہ رہے"

(جنید بغدادیؒ رسالہ قیشریہ صفحہ 127)

(32) "... خباثتِ نفس محض گرسنگی یا گوشہ نشینی سے زائل نہیں ہو سکتی ..... جو صوفی یہ سمجھتا ہے کہ محض صحرانوردی سے توکّل پیدا ہو جائے گا غلطی پر ہے۔ توکّل کیلئے سب سے پہلے تزکیۂ نفس لازمی ہے۔ اس طرح صوفیانہ لباس پہن لینے سے کوئی شخص صوفی نہیں بن سکتا۔ تصوّف تو اصلاحِ باطن کا نام ہے نہ کہ پیوند لگی ہوئی گدڑی کا"

(ابو نصر سراجؒ کتاب اللمع باب 138)

(33) صَحْوُ سُکر سے اعلیٰ مرتبت ہے۔ سُکر میں انسان ہر چیز سے حتیٰ کہ اپنے نفس اور عقل سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ کسی قسم کی تمیز نہیں رکھتا.......... وہ کچھ نہیں جانتا کیا کہہ رہا ہے؟...... اس کے بر عکس صَحْوُ میں انسان ہوش رکھتا ہے، تمیز رکھتا ہے۔ اس کا شعور اس کے قبضہ میں ہوتا ہے۔ اپنی حس پر اسے قدرت ہوتی ہے...... وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ غیر مسئول نہیں ہے۔ اسے اپنے اَعمال اور اَقوال کی کسی کے سامنے جواب دہی بھی کرنا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ محتاط ہو جاتا ہے اور ہوش کی منزل سے آگے نہیں بڑھتا"

(قول جنید بغدادیؒ تصوفِ اسلام صفحہ 220-219)

(34) "" اللہ اپنے بندے سے اس بات کا بھی طالب ہے کہ وہ جس سوسائٹی میں رہتا ہے اہل کے حقوق و فرائض پوری توجہ سے ادا کرے۔ جب بندہ فانی فی اللہ ہو کر باقی باللہ کے مقام کو حاصل کر لیتا ہے تو وہ حالتِ سُکر سے حالت صَحْوُ میں واپس آ جاتا ہے اور فنا کے بعد پھر انسانی یا انفرادی صفات اختیار کر لیتا ہے اور چونکہ اس کی شخصیت میں صفاتِ ایزدی کا رنگ جھلکنے لگتا ہے اس لئے وہ دوسرے ہم جنسوں کیلئے نمونہ بن جاتا ہے"

(جنید بغدادیؒ رسالہ صفحہ 8)

(35) جنیدؒ کا نظریۂ صَحْوُ بہت مشہور و معروف ہے اور تمام شیوخ نے اسے اختیار کیا ہے"

(سید علی ہجویریؒ کشف المحجوب صفحہ 184)

(36) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں نے اپنے زمانے کے اَفاضل اور اَکابر کیلئے کوئی الگ نام نہیں رکھا، صرف ایک ہی نام، صحابہ تھا جو سب کیلئے مشترک تھا کہ صحابی کی حیثیت سے تمام صحابہ یکساں تھے۔ ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہ تھی۔ پھر جب صحابہ کا دور ختم اور دوسرا دور شروع ہوا تو اس عہد میں ایک نیا نام تابعین کا ایجاد ہوا لیکن یہ لقب صرف انہی لوگوں کیلئے تھا جنہوں نے صحابہ کرام کا فیضِ صحبت حاصل کیا تھا۔ اس نام میں ایک قسم کی برتری کی جھلک موجود تھی۔ تابعین کے دور کے بعد جو نیا دور شروع ہوا اس زمانے کے لوگ تبع تابعین کہلائے۔ تبع تابعین ان لوگوں کو کہا جاتا تھا جو تابعین کے شرفِ صحبت سے فیض یاب ہوئے تھے...... ان اَدوارِ سہ گانہ کے بعد لوگ القاب و اسماء کے بارے میں مختلف الرائے ہو گئے اور فرقِ مراتب کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ چنانچہ جو لوگ دین اور مذہب کے اعتبار سے زیادہ متشدد تھے اور اس طرف زیادہ متوجہ رہتے تھے ان کیلئے دو نام عام طور سے چل پڑے (1) زہاد (2) عباد۔ اس دَور کے بعد بدعتوں کا یعنی نئی نئی باتوں کا دَور دورہ شروع ہوا اور مختلف فرقے پیدا ہو گئے.......... اہل سنت کے ہاں ایک نئی اصطلاح وضع ہوئی اور یہ تصوّف کہلائی۔ بعد میں صوفی کے نام سے بہت سے لوگ مشہور اور معروف ہوئے"

(امام قیشری الرسالۃ القیشریہ)

(37) "جب ہم صوفی کو لفظ صوف سے منسوب کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک مجمل نام ہے جو

تمام علوم ' اعمال ' اخلاق اور احوال شریفہ و محمودہ پر حاوی ہے . صوفیاء کو ان کے ظاہری لباس سے نسبت دی گئی ہے ...... اصحابِ عیسیٰ کو حواری سے تشبیہ دینے کی بھی یہی وجہ ہے اس لئے کہ وہ کپڑوں کو دھو دھو کر سفید اور صاف بنا دیتے تھے "

(ابو نصر سراج طوسی ' تصوّفِ اسلام ' صفحہ 183-182)

(38) " " لفظ صوفی کی اصل لفظ سوفیا سے ہے۔ سوفیا یونانی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں۔ حکمت و معرفت "

(البیرونی ایضاً صفحہ 184)

(39) " صوفی کی تعریف یہ ہے کہ جو شخص اللہ عزوجل کیلئے اپنے قلب کو تمام کثافتوں سے پاک کر لے۔ بس وہی اصلی اور کھرا صوفی ہے "

(بشیر بن حارث ایضاً صفحہ 187)

(40) " صوفی وہ شخص ہے جو " اپنے نفس کیلئے حق کو اختیار کرے اور اپنے نفس کو تمام آلائشوں اور ہر قسم کی کثافت سے پاک کرے "

(مندار بن حسنین ایضاً صفحہ 187)

(41) " صوفی وہ ہے جو گندگی سے پاک و صاف ہو۔ جس کا سینہ فکر و تامل کا گنجینہ ہو ' جو مخلوق سے رشتہ قطع کر کے خالق کا ہو رہے ' جس کے نزدیک سونا اور کنکر برابر ہوں "

(سہیل بن عبداللہ التعرف المذہب واہل التصوّف)

(42) " ہمارا یہ علم کتاب و سنت میں مقید ہے پس جو کتاب و سنت سے الگ ہو اس کی پیروی نہ کی جائے۔ یہی وہ علم صافی ہے جو مشکوٰۃِ نبوت سے ماخوذ ہے۔ یہ اس علم والے کو طریقِ عبودیت پر چلنے کیلئے سنوار دیتا ہے "

(جنید بغدادی مدارج السالکین جلد سوم صفحہ 89)

(43) " کتاب و سنّت کا ہر معاملہ میں لحاظ اولیاء اللہ کے نزدیک ایک متفق علیہ ہے اور مشائخ کے اقوال میں بکثرت اس کی ہدایات موجود ہیں "

(امام ابنِ تیمیہ الفرقان ' صفحہ 31)

(44) " اللہ عزّ و جل سے محبت اور عشق رکھنے والے کی علامات میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ وہ محبوبِ خدا احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و اعمال اور اوامر و سنن کی پوری پوری پیروی صدقِ دل اور سچے جذبہ سے کرے "

(ذوالنون مصری ' تصوّفِ اسلام ' صفحہ 211)

(45) " آپ غیب کے نور کی روشنی تھے ' ظاہر ہوئے اور واپس لوٹ گئے ..... حق آپ کا وجود ہے اور آپ کے وجود ہی سے حقیقت نمودار ہوئی ہے۔ آپ وصلت میں اول اور نبوت میں آخر تھے۔ آپ حقیقت کے باطن اور معرفت کے ظاہر تھے "

(منصور حلاج کتاب الطوٰاسین)

(46) "انوارِ نبوّت آپؐ کے نورِ ازلی سے چمکے اور فروغ گیر ہوئے۔ آپ کے نور سے بڑھ کر کوئی نور بھی انور اور اظہر نہیں نہ آپؐ کے قدم سے بڑھ کر کوئی اقدم ہے.......... تمام علوم آپؐ کے بحرِ بے پایاں کا ایک قطرۂ ناچیز تھے...... تمام زمانے آپؐ کے زمانے کے سامنے ایک ساعت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے"

(منصورحلاّج نفس المرجع)

(47) "وہ ریاضتیں اور مجاہدے جو تقلیدِ سنّت سے الگ ہو کر اختیار کئے جائیں معتبر نہیں ہیں اس لئے کہ جوگی، ہندوستان کے برہمن اور یونان کے فلاسفہ بھی ان کو اختیار کرتے ہیں اور یہ ریاضتیں ان کی گمراہی میں اضافہ کے سوا اور کچھ نہیں کرتی ہیں"

(مجدد الف ثانیؒ جلد اوّل مکتوب دو صد و بست و یکم)

(48) ""اور بعض جہلا جو کہہ دیتے ہیں کہ شریعت اور ہے اور طریقت اور ہے۔ محض ان کی کم فہمی ہے۔ طریقت بے شریعت خدا کے گھر مقبول نہیں۔ صفائی قلب کفّار کو بھی حاصل ہوتی ہے۔ قلب کا حال مثل آئینہ کے ہے۔ آئینہ زنگ آلودہ ہے تو پیشاب سے بھی صاف ہو جاتا ہے اور گلاب سے بھی صاف ہو جاتا ہے لیکن فرق نجاست اور طہارت ہے۔ ولی اللہ کو پہچاننے کیلئے اتباعِ سنّت کسوٹی ہے۔ جو متبعِ سنّت ہے وہ اللہ کا دوست ہے اور اگر مبتدع ہے تو محض بے ہودہ ہے۔ خرقِ عادات تو دجّال سے بھی ہوں گے"

(حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (رجوم المذنبین صفحہ 129)

(49) "شریعت کے تین حصے ہیں۔ علم، عمل اور اخلاص جب تک یہ تینوں اجزاء متحقق نہ ہوں شریعت متحقق نہیں ہوتی ہے جب شریعت متحقق ہو جاتی ہے تو حق تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جاتی ہے جو کہ تمام دنیاوی اور اُخروی سعادتوں سے بالاتر ہے طریقت و حقیقت جس سے صوفیاء ممتاز ہوئے ہیں دونوں شریعت کے تیسرے حصے یعنی اخلاص کی تکمیل میں شریعت کے خادم ہیں پس ان دونوں (یعنی طریقت و حقیقت) کی تحصیل صرف شریعت کی تکمیل کیلئے کی جاتی ہے........ اس لئے طریقت و حقیقت کی منزلوں کے طے کرنے کا مقصد تحصیلِ اخلاص کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اخلاص ہی سے مقامِ رضا حاصل ہوتا ہے۔ کوتاہ اندیش احوال و مواجید کو مقصود اور مشاہدات و تجلّیات کو مطلوب جانتے ہیں اور کمالاتِ شریعت سے محروم ہیں....... اس لئے ان کی حیثیت مقصودِ حقیقی کے معاون کی ہے"

(مجدد الف ثانیؒ جلد اوّل مکتوب سی و ششم)

(50) "طریق کے رہزن زنادقہ، صوفیہ اور ملاحدہ وہ ہیں جو پیغمبرؐ کی پیروی کو طریق میں ضروری نہیں جانتے ہیں....... حضرات صحابۂ کرام اور امّت کے دوسرے کاملین علم اور حال دونوں کے جامع تھے۔ جب اہلِ علم اور اہلِ حال میں تفریق ہو گئی اس وقت سے نقص اور خلل پیدا ہو گیا"

(حافظ ابن قیمؒ مدارج السالکین جلد سوم صفحہ 84)

(51) "بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ چونکہ انہیں خدا کا قرب نصیب ہو گیا ہے اس لئے اب ان پر قوانینِ شرعیہ کی پابندی لازم نہیں رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لوگ ان افعال کا

ارتکاب کرنے لگے جن سے وہ مجتنب رہا کرتے تھے۔ ان لوگوں کا یہ خیال سراسر باطل ہے۔ مقامِ قُرب تو اتباعِ شریعت سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اتباعِ شریعت ترک کر دے گا تو وہ معاً مقامِ قرب سے محروم ہو جائے گا۔ ایسا شخص اپنے آپ کو کتنا ہی مقبولِ بارگاہ سمجھے دراصل وہ مردُود ہو چکا ہے"

(ابو نصر سراج" طوسی کتاب اللمع باب 149)

(52) "معتزلہ نے عقل کو راہنما بنا کر گمراہی کا راستہ اختیار کیا لیکن صوفیاً دل کی ہدایت پر عمل کر کے منزلِ مقصود تک پہنچ گئے"

(ابن الکاتب" رسالہ قلیشریہ صفحہ 137)

(53) "لَا یَعْرِفُ الْحَقَ اِلَّا مِنْ یَعْرِفُہ' لَا یَعْرِفُ الْقَدِیْمُ الْمُحَدِثُ الْفَانِی"

(صرف وہ شخص خدا کو جان سکتا ہے جس پر خدا اپنے آپ کو ظاہر کر دے کوئی محدّث اور فانی ہستی قدیم کو نہیں جا سکتی ہے)

(منصور حلاج کا شعر تاریخِ تصوف صفحہ 395)

X 54) "واضح ہو کہ خدا ازلی ہے اور تم سب فانی اور عارضی مظاہر ہو۔ تمہاری ذات کو خدا کی ذات سے کوئی نسبت یا علاقہ نہیں ہے اور نہ تمہاری صفات اور اس کی صفات میں کوئی مشارکت یا مماثلت ہے اور نہ قدیم اور حادث (واجب اور ممکن) میں کوئی یگانگت یا علاقہ ہے"

(سید علی ہجویری" کشف المجحوب صفحہ 281)

(55) "اَلتَّوحِیدُ اَفرَادُ الْقِدَمِ مِنَ الْحَدَثِ" (جنید بغدادی")

(توحید یہ ہے کہ قدیم (خدا) کو حادث (مخلوق) سے اس طرح جدا کر دیا جائے کہ قدیم فرد یعنی لاشریک ہو جائے)

(56) "اس وحدۃ الوجود کی غایت یہ ہے کہ اس کے ماننے والے عبد اور معبود' خالق اور مخلوق' آمر اور مامور' طاعت اور معصیت میں فرق نہیں کرتے"

(حافظ ابن قیم طریق الھجرتین صفحہ 333)

(57) "ملاحدہٗ اہلِ وحدۃ الوجود کے نزدیک غیرِ حق' عینِ حق میں گم ہو جاتا ہے بلکہ غیرِ حق کا وجود' نفسِ حق کا وجود ہوتا ہے۔ حس دونوں وجودوں میں فرق کرتا ہے لیکن جب حس غائب ہوتا ہے تو کھل جاتا ہے کہ غیرِ حق کا وجود' عینِ حق ہے"

(مدارج السالکین جلد سوم صفحہ 87 حافظ ابنِ قیم)

(58) عینیت کے یہ معنی نہیں کہ دونوں ایک ہو گئے' یہ تو صریح کفر ہے"

(مولانا اشرف علی تھانوی" تعلیم الدین" صفحہ 95)

(59) "گو ممکنات موجود ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وجود دیا ہے' موجود کیوں نہ ہوتے۔ مگر وجودِ حق کے روبرو ان کا وجود نہایت ناقص و ضعیف و حقیر ہے اس لئے وجودِ ممکن کو وجودِ حق

کے روبرو گو عدم نہ کہیں گے مگر کالعدم ضرور کہیں گے۔ جب یہ کالعدم ہوا تو وجودِ معتد بہ ایک ہی رہ گیا۔ یہی معنی ہیں وحدۃ الوجود کے کیونکہ اس کا لفظی ترجمہ ہے ایک ہونا وجود کا۔ سو ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوسرا گو ہے سہی مگر ایسا ہی ہے جیسا نہیں مگر اس کو ادعاً وحدۃ الوجود کہا جاتا ہے..... .. وحدۃ الشہود کا ترجمہ ہے ایک ہونا شہود کا کہ واقع میں ہستی متعدد ہیں مگر سالک کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور سب کالعدم معلوم ہوتے ہیں. ...... .پس وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں اختلافِ لفظی ہے "

(مولانا اشرف علی تھانویؒ "کلیدِ مثنوی")

(60) "جس طرح انوارِ مخلوقہ 'نورِ حق کے سامنے اور علمِ خلق، علمِ حق کے سامنے اور مخلوق کی قدرت' خدا کی قدرت کے سامنے مضمحل ہے اسی طرح زمان' دہر اور وقت دوامِ الٰہی کے سامنے مضمحل ہے...... بے شبہ وجودِ حق اور اس کا دوام جب ماسوئی پر غالب آتا ہے تو ہر چیز ایسی ہوتی ہے جیسے کہ وہ نہیں ہے اور یہیں سے وحدۃ الوجود کے قائلوں کو غلط فہمی ہوگئی کہ واقعی کوئی دوسرا وجود نہیں ہے"

(حافظ ابن قیمؒ مدارج السالکین، جلد سوم صفحہ 86)

(61) " "بعض حلولی کہتے ہیں کہ خدا بعض منتخب اجسام میں صفاتِ الوہیت داخل کر دیتا ہے.......... یہ عقیدہ سراسر گمراہی ہے۔ اس سے توحیدِ الٰہی کا اثبات نہیں ہوتا بلکہ گمراہی کا اثبات ہوتا ہے. . .خدا اور بندے میں تباین کی نسبت ہے نہ کہ تساوی کی پس خدا کسی انسان میں کیسے حلول کر سکتا ہے۔ خدا اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے ہر شے سے مختلف ہے اور ہر شے اس سے مختلف ہے لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ خدا مظاہرِ کائنات میں صرف اپنی صفت اور قدرت کے آثار ظاہر کرتا ہے اور یہ آثار اس کی ربوبیت کی دلالت بن جاتے ہیں.........."

(ابو نصر سراجؒ طوسی کتاب اللمع، باب 143)

(62) "بغداد کے بعض صوفیا اس غلطی کا شکار ہوگئے کہ چونکہ ہم اوصافِ بشریہ سے خالی ہو چکے ہیں اس لئے ہمارے اندر اوصافِ الٰہیہ پیدا ہوگئے ہیں۔ دراصل یہ عقیدہ نصاریٰ کے عقیدۂ حلول سے مشابہ ہے. ... . فنا کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ اپنے نفس کی خواہشات کو فنا کر دیتا ہے تو وہ اللہ کا کامل مطیع بندہ بن جاتا ہے. .... اللہ تعالیٰ کسی بندے کے قلب میں حلول نہیں کرتا بلکہ اس پر ایمان' اس کی توحید اور تعظیمِ ذکرِ الٰہی بے شک یہ صفات قلب میں جاگزیں ہو جاتی ہیں اور یہ بات عوام اور خواص دونوں کو نصیب ہو سکتی ہے"

(ابو نصر سراجؒ طوسی' کتاب اللمع' باب 150)

(63) بشری حجابات اٹھ جانے کے بعد دل میں جو نورِ حقیقت ظاہر ہوتا ہے اس کا نام یقین ہے جس سے ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے۔ اس سے وہ یقین مراد نہیں ہے، جو محض دلائل سے حاصل ہو"

(شیخ شہاب الدین سہروردیؒ 'عوارف المعارف')

(64) "یہاں یقین سے مراد وہ یقینِ خاص ہے جو بطریقِ موہبت صالحینِ امت کو نصیب ہوتا ہے۔ اس کو صوفیا کی اصطلاح میں یادداشت کہتے ہیں نہ کہ وہ یقین جو استدلال یا تقلید سے پیدا ہو"

(شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ازالۃ الخفاء صفحہ 142)

(65) "علم محدود بالعقل اور منحصر علی الفہم نہیں ہے۔ حصولِ علم صرف عقل پر موقوف نہیں ہے۔ اس کے حصول کا ایک ذریعہ اور بھی ہے............ نیز اس حدیث کے مفہوم میں تدبّر کرو کہ حضورؐ نے فرمایا اگر تم (صحابہؓ) لوگ بھی وہ چیزیں دیکھ سکتے جو میں دیکھتا ہوں تو تم ہنستے کم اور روتے زیادہ۔ معلوم ہوا کہ اس علمِ ظاہری کے علاوہ اور اس سے بالاتر بھی ایک علم ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تین اقسام کے علوم حاصل تھے اس لئے عقل پر علم کا انحصار رکھنے والوں کو صوفیائے کے علوم و مکاشفات پر زبانِ طعن دراز کرنی روا نہیں ہے۔ علوم شرعیہ کی چار قسمیں ہیں (1) تفسیرِ قرآن (2) حدیثِ نبویؐ (3) فِقہ (4) تصوف یہ چوتھی قسم سب سے ارفع اعلیٰ اور اہم ہے"

(ابو نصر سراجؒ کتاب اللمع 'تاریخِ تصوف 349 - 348)

(66) "شام کے بعض صوفیا اس کے مدعی ہیں کہ انہیں اس دنیا میں خدا کا دیدار ہوا ہے جو اس دیدار سے مشابہ ہے جو آخرت میں ہو گا۔ یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ سچے صوفیوں کی روایت تو مشاہدہ ہے جو یقین کا ثمرہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت جس کا ذکر سورۂ والنجم میں ہے وہ حضورؐ سے مخصوص ہے۔ اس میں کوئی شخص حضورؐ کے ساتھ شریک نہیں ہے یعنی اس زندگی میں کسی کو رویتِ باری نصیب نہیں ہو سکتی"

(ابو نصر سراجؒ کتاب اللمع باب 145)

(67) "بعض لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ ان کے قلوب میں انوارِ الٰہی جلوہ گر ہیں اور وہ ان کو دیکھتے ہیں اور یہ اَنوار وہ ہیں کہ جن کو اللہ نے اپنی ذات سے متصف فرمایا ہے یعنی انوارِ ذاتیہ اور یہ انوار ان کے قلوب میں جلوہ گر ہیں اور یہ انوار غیر مخلوق ہیں اور یہ انوار 'انوارِ معرفت و توحید و عظمت ہیں اور ازلی ہیں۔ یہ سب دعوے غلط ہیں اس لئے کہ تمام انوار جو مشہود ہو سکتے ہیں 'مخلوق ہیں اور انوارِ الٰہی تو ناقابلِ مشاہدہ اور ناقابلِ ادراک ہیں۔ نورِ قلبی کا صحیح مفہوم نورِ الٰہی نہیں بلکہ وہ علم ہے جو اللہ بندوں کو عطا کرتا ہے جو ان کیلئے بمنزلہ فرقان بن جاتا ہے یعنی اس علم کی بدولت وہ حق و باطل میں تمیز کر سکتے ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (29:8)"

(ابو نصر سراجؒ کتاب اللمع 'باب 147)

(68) "بعض لوگ ترکِ اسباب کو مستحسن خیال کرتے ہیں حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی ہے"

(ابو نصر سراجؒ کتاب اللمع 'باب 136)

(69) "بعض صوفیوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ ہمیں اپنے اَفعال کی نسبت اپنی ذات سے نہیں کرنی چاہئے کیونکہ اس صورت میں ایک فعل کے دو فاعل (خدا اور بندہ) ہو جائیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ توحید باطل ہو جائے گی۔ یہ نظریہ غلط ہے۔ اللہ نے بندوں کے افعال کو بندوں سے منسوب کیا ہے۔ اس عقیدے نے انہیں دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا اور وہ لوگ قانونِ شرع سے غافل ہو گئے بایں طور کہ انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اس میں مجبورِ محض ہیں............ اگرچہ ہر شے خدا کی طرف سے ہے لیکن اللہ نے بندوں کو ان کے اَعمال کا ذمہ دار بھی بنایا ہے"

(ابو نصر سراجؒ کتاب اللمع 'باب 149)

(70) "بعض عراقی صوفیہ نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ جب ان پر وجد طاری ہوتا ہے توان کے ظاہری حواس زائل یا فنا ہو جاتے ہیں اور وہ کسی شے کو محسوس نہیں کرتے اور خود محسوسات سے ماورا ہو جاتے ہیں یعنی ان صفات سے بالاتر ہو جاتے ہیں جو اشیائے محسوس کا خاصہ ہیں ان کا یہ نظریہ باطل ہے کیونکہ فقدانِ حواس کا علم بھی تو حواس ہی کے ذریعے سے ممکن ہے اور حواس کا فقدان ہو چکا ہے توان صوفیوں کو یہ کیسے محسوس ہوا کہ ان کے حواس گم ہو چکے ہیں۔ یہ احساس کہ حواس گم ہو چکے' خود حواس کے موجود ہونے پر دال ہے۔ علاوہ بریں انسان جب تک جامۂ بشریت میں ہے حواس سے بیگانہ یا عاری نہیں ہو سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر صاحبِ وجد کون ہو سکتا ہے مگر آپؐ کبھی حواسِ خمسہ سے بیگانہ یا بالاتر یا بے نیاز یا محروم نہیں ہوئے۔ دوسرے یہ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں؟ سچی بات وہ ہے جو سری سقطیؒ نے کہی کہ حالتِ وجد میں حواس عارضی طور پر محو ہو جاتے ہیں جس طرح نورِ آفتاب کے سامنے ستارے مگر اسی طرح وہ اپنی جگہ موجود رہتے ہیں۔ اسی طرح وجد میں انسان کو اپنے حواس کا عارضی طور پر شعور باقی نہیں رہتا مگر حواس اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں"

(ابو نصر سراجؒ کتاب اللمع' باب 151)